جمیل جالبی کی ادبی خدمات

تلخیص

مقالہ

برائے

پی ایچ۔ڈی (اردو)

نگراں

پروفیسر اصغر عباس

پیش کش

سعدیہ سلیمان

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۰۰۸ء

تلخیص

ڈاکٹر جمیل جالبی ادبی قبیلے کے ایک ایسے چشم و چراغ ہیں۔ جو ۱۹۲۹ء کو ادبی گہوارے علی گڑھ میں پیدا ہوئے والدین نے ان کا نام جمیل خان رکھا۔ مگر انھوں نے اپنے نام کے آگے جالبی خود لگایا تھا کیونکہ یہ سید جالب دہلوی سے بے حد متاثر تھے۔ جالب صاحب بڑے صحافی تھے انکے دو اخبار ''ہمت'' ''ہمدم'' نکلتے تھے۔ جمیل جالبی کے والد کے ماموں جالب صاحب کے دوست بھی تھے اور رشتے میں جالب صاحب ماموں کے بہنوئی بھی ہوتے تھے۔

ابتدائی تعلیم علی گڑھ میں حاصل کرنے کے بعد سہارن پور سے میٹرک، میرٹھ سے بی۔اے کیا۔ ۱۹۴۷ء میں جمیل جالبی ترکِ وطن کر کے کراچی پاکستان پہونچ گئے وہاں کراچی سے ایم۔اے اردو اور انگریزی سے کیا۔ پی۔ایچ۔ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگری بھی حاصل کی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کو اعزازی ڈگری ڈی ایس سی سے بھی نوازا گیا۔ تعلیمی سلسلہ تھا تو وہ انکم ٹیکس کمشنر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی غیر معمولی تعلیمی، عملی، ادبی اور انتظامی کارگزاریوں کے پیش نظر کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اس عہدے پر ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۷ء تک فائز رہے۔

اسی سال وہ مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین کے منصب پر فائز ہوئے۔ انکی تصانیف پر داؤد ادبی انعام سے چار بار نوازا گیا۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی گولڈ میڈل، محمد طفیل ادبی ایوارڈ اور ستارہ امتیاز ایوارڈ بھی حاصل کیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ادب کی دنیا میں کئی حیثیتوں سے جانے جاتے ہیں۔ ادب کے سارے تقاضوں کو انھوں نے بخوبی نبھایا ہے اسی لئے ہر ادیب اور ہر ادارہ ان سے تعلق رکھنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کو تاریخ ادب اردو لکھنے کا خیال ۱۹۶۵ء کے آس پاس آیا تھا۔ اسکی پہلی جلد ۱۹۷۵ء میں شائع ہو کر سامنے آئی۔ اس میں قدیم دور آغاز سے ۱۷۵۰ء تک کی داستان قلم بند ہے۔ یہ چھ فصلوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ ہر فصل میں کئی ابواب ہیں ہر فصل کی یہ خاصیت ہے کہ اس کے پہلے باب میں اس زمانے کی

تہذیبی ، معاشرتی ، ادبی اور لسانی خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے اس کے بعد اس کے شعراء اور ادیبوں کی تخلیقات پر بحث کی گئی ہے۔

پہلی فصل میں تین ابواب ہیں مسعود سعد سلمان سے گرونانک تک کی تاریخ بیان کی گئی ہے آگے بابر سے شاہجہاں تک کا زمانہ دیا گیا ہے۔اس زمانے میں افضل پانی پتی کی مشہور تصنیف ''بکٹ کہانی'' کا تفصیلی ذکر ہے۔

فصل دوم میں گجری ادب اور اس کی روایت ہے۔اس میں چار ابواب دیئے گئے ہیں۔فصل سوم میں اردو بہمنی دور ہے اس میں دو باب پیش کئے ہیں فصل چہارم میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے عادل شاہی دور پر تبصرہ پیش کیا ہے اس میں آٹھ ابواب دیئے گئے ہیں۔

فصل پنجم قطب شاہی دور ہے۔یہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔فصل ششم فارسی روایت کا نیا عروج ریختہ ہے۔اس میں دو باب ہیں اس کے بعد کتاب کے آخر میں ایک اختتامیہ ہے۔جس میں اردو زبان کی اہمیت اور تاریخ بتائی گئی ہے۔

تاریخ ادب اردو اٹھارویں صدی جلد دوم حصّہ اوّل ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی۔اس میں دو حصے ہیں پہلے حصہ میں پیش لفظ کے بعد تمہید ہے۔اس میں دو باب اور پانچ فصل ہیں۔پہلے باب کا عنوان ''اٹھارویں صدی: سیاسی پس منظر، طرز فکر، تہذیبی و معاشرتی رویے ہے۔

دوسرا باب ''اردو شاعری رواج، کشمکش، اثرات محرکات و میلانات'' ہے۔اس کے بعد فصل اوّل شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدائی روایت۔اس میں تین باب ہیں۔فصل دوم میں فارسی ریختہ گوئی بیان کی گئی ہے۔اس میں دو باب ہیں فصل سوم میں ایہام گوئی پر لکھا گیا ہے اس میں چار ابواب ہیں فصل چہارم ''ردعمل کی تحریک'' ہے۔اس میں تین باب ہیں۔فصل پنجم ''ردعمل کی تحریک کی توسیع'' اس میں بھی تین ہی باب ہیں۔

تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ دوم میں فصل پنجم کے چوتھے باب سے شروع ہے اور نویں باب تک ہے چوتھے باب کا آغاز محمد رفیع سوؔدا سے ہوتا ہے۔انکی شاعری اور قصیدہ نگاری کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ سوؔدا کے بعد میر محمدی بیدؔار کے بارے میں تفصیل سے دیا گیا ہے۔

پانچویں باب میں دردؔ کی شاعری بیان کی گئی ہے۔چھٹے باب میں قائمؔ، میرؔ سوزؔ اور آثرؔ کو شامل کیا گیا ہے۔ساتویں باب میں ڈاکٹر جالبی نے میر حسنؔ کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔آٹھویں باب میں

جعفر علی حسرؔت کا ذکر ہے ان کا شمار ایسے شاعروں میں کیا گیا ہے جنھوں نے دہلوی روایت کے مقابلے میں لکھنوی روایت کو اہمیت دی ہے۔

نویں باب میں شیر محمد خاں ایماؔن کا ذکر ہے۔ تاریخ ادب اردو جلد دوم حصّہ دوم میں ایک حصّہ شاعری کا ہے اور دوسرے حصّے میں اردو نثر کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ جس میں پانچ باب ہیں۔

پہلا باب ''اردو نثر کے رجحانات اسالیب وادبی خصوصیات'' دوسرا باب ''تنقیدی نثر اور اسالیب'' ،تیسرا باب ''مذہبی تصانیف اور اسالیب'' چوتھے باب کا موضوع ''تاریخی نثر اس کا اسلوب'' اور پانچویں باب میں ''افسانوی تصانیف اور اسالیب'' ہے۔

''تاریخ ادب اردو'' میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو شاعری کے ساتھ ساتھ اردو نثر کا بھی جائزہ لیا ہے وہ اردو نثر کو فورٹ ولیم کالج کا مرہون منت نہیں مانتے۔ ان کا خیال ہے

> ''اردو نثر فورٹ ولیم کالج سے بہت پہلے اپنا راستہ تلاش کر چکی تھی اور اس میں اتنی تصانیف وجود میں آ چکی تھیں کہ ان کو نظر انداز کر کے اردو نثر کا پہلا مرکز فورٹ ولیم کالج کو کہنا کسی طرح درست نہیں ہے۔''
>
> (تاریخ ادب اردو جلد دوم حصّہ دوم، ڈاکٹر جمیل جالبی ص ۹۸۵)

تاریخ پر لکھنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ وہ بحیثیت لغت نویس ہمارے سامنے آئے۔ اردو ادب ''قدیم اردو کی لغت'' کی صورت میں مستفید ہوا۔ اس کے علاوہ ''قومی انگریزی اردو کی لغت'' اور ''فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ'' بھی مرتب کیں ہیں۔ بحیثیت محقق ڈاکٹر جالبی نے جب کام شروع کیا تو انکے سامنے کئی اعلیٰ پایہ کے محققین تھے۔ جن میں مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی ، ڈاکٹر سید عبداللہ اور قاضی عبدالودود وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر جالبی نے ان تحقیق نگاروں کے اصولوں کو نظر میں رکھتے ہوئے اپنا ایک منفرد راستہ اختیار کیا۔ انھوں نے دکن سے دور رہ کر ''دیوان حسن شوؔقی''، ''دیوان نصرؔتی'' اور ''مثنوی کدم راؤ پدم راؤ'' جیسے قدیم متن کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔

دیوان حسن شوؔقی، ڈاکٹر جمیل جالبی کی پہلی تحقیق ہے یہ ۱۹۷۱ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کی جانب سے شائع ہوئی۔ یہ ۱۹۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

شوؔقی کے بعد ''دیوان نصرؔتی'' کے بارے میں لکھا ہے۔ یہ ۱۹۷۲ء مطبع: قوسین لاہور سے شائع

ہوئی۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے نصرتی کے اصل نام اور سال وفات پر کافی بحث کی ہے اور اپنی دلیلوں سے بات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر جالبی کی قدیم اردو ادب سے دلچسپی اور علمیت نے یہ رنگ دیکھایا کہ مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' جس سے کوئی واقف نہیں تھا آج ادب کی دنیا میں اپنا ایک مقام حاصل کر چکی ہے۔اس مثنوی کی یہ خاصیت ہے کہ اس کے ذریعہ اس وقت کی اردو زبان کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اگر ایک طرف دکن کے شعراء پر لکھ رہے ہیں۔تو دوسری طرف ترقی پسند تحریک کے زمانے کے شاعر میراجی کو بھی متعارف کراتے ہیں ۔ ان پر دو کتابیں ترتیب دی ہیں ۔ ایک ''کلیاتِ میراجی'' اور دوسری ''میراجی ایک مطالعہ''۔تقسیم ہند سے پہلے کے شاعر ن۔م۔راشد پر بھی ایک کتاب ترتیب دی ہے۔ جس کا عنوان ''ن۔م۔راشد ایک مطالعہ'' ہے ان کا نام جدید شاعری کے بانیوں میں آتا ہے۔

شاعروں کے ساتھ ایک ایسے ادیب پر بھی خاکہ کھینچا ہے۔جس کا نام شاہد احمد دہلوی ہے اور جو تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں مقیم ہو جاتا ہے مگر دہلی کی پرانی حسین یادیں اسکا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔ان یادوں کے موتی شاہد احمد دہلوی نے ڈاکٹر جمیل جالبی کی فرمائش پر مضامین کے روپ میں پروئے ہیں۔جن کو ڈاکٹر جالبی نے ترتیب دے کر ''بزم خوش نفساں'' کا نام دیا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی بحثیت نقاد ایک ایسی سوچ لے کر ابھرتے ہیں جو تنقید کے ذریعہ ادب کے معیار کو اونچا اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

تنقید پر انھوں نے کئی کتابیں لکھیں ہیں ''نئی تنقید'' کے مضامین مشرق ومغرب کا سنگم لگتے ہیں ان مضامین میں مشرقی حصّے میں نئی تنقید،نئی تنقید کا منصب،تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر لکھنے کے اصول،طرز غالب،مطالعہ اقبال کے نئے گوشے مغربی حصّے میں برٹرینڈرسل: سائنس کا پیامبر اور سنجیدہ فنکار:ایزراپاؤنڈ جیسے اور کئی مختلف مضامین شامل کئے گئے ہیں۔دوسری کتاب ''تنقید اور تجربہ'' کے پہلے حصّے میں ادبی بحث کی گئی ہے۔دوسرے حصّے میں عملی تنقید کا نمونے پیش کئے گئے ہیں اور تیسرے حصّے میں ایسے مضامین ہین جن میں مغربی ادیبوں کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔

''معاصر ادب'' ننانوے مضامین پر مشتمل ہے ڈاکٹر جالبی نے اس میں ادبی تنقیدی وفکری مضامین کو موضوع بنایا ہے ۔صحافت ، افسانہ نگاری ، شاعری،ناول نگاری ، بچوں کا ادب ،نعت گوئی ،لطیفہ بازی

مشاعرہ، سوانح نگاری، طنز و مزاح اور فارسی شعراء پر بھی مضامین لکھے گئے ہیں۔

''محمد تقی میرؔ'' بھی اس حصّے میں آتی ہے ویسے تو یہ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خطبہ ہے جو بابائے اردو یادگار لیکچرز کے سلسلے میں پیش کیا گیا ہے۔ مگر اب یہ کتاب کی شکل میں ہے۔ اس میں دو لیکچر ہیں پہلا محمد تقی میرؔ کی حیات، سیرت اور تصانیف پر ہے۔ دوسرا لیکچر محمد تقی میرؔ کی شاعری پر مبنی ہے۔ اس میں اشعار کی مثال دے کر انکی شاعری بیان کی گئی ہے۔

''ادب کلچر اور مسائل'' ایسی کتاب ہے جس میں ۵۶ مضامین ہیں جن میں ادب، فکر، تہذیبی سائنس، ٹکنولوجی، اسلام، موسیقی، قومی یک جہتی اور سیاسی مختلف موضوعات پر وضاحت کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ان موضوعات سے متعلق جو مسئلے ہیں ان کے حل نکالنے کی بھی کوشش کی ہے۔

پاکستان کے کلچر کے سلسلے میں کسی نے بھی سنجیدگی سے قلم نہیں اٹھایا اس معاملے میں ڈاکٹر جالبی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے باقاعدہ ''پاکستانی کلچر'' پر کتاب لکھی اور جامع بحث کر کے پاکستانی کلچر کی اہمیت بتائی ہے۔ انھوں نے اس کتاب کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے۔ ملک کے اندر غریب طبقہ آج بھی اسی حالت میں ہے۔ جیسا کہ ملک آزاد ہونے سے پہلے تھا۔ آج بھی پاکستان میں جاگیردار غریبوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کرر ہے ہیں۔ ڈاکٹر جالبی ان حالات سے بے حد پریشان ہیں۔ اپنے اندر ایک کرب محسوس کرتے ہیں۔ کلچر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''کلچر اس کل کا نام ہے جس میں مذہب و عقائد علوم اور اخلاقیات اور معاشرت، فنون و ہنر، رسم و رواج افعال ارادی اور قانون، صرف اوقات اور وہ ساری عادتیں شامل ہیں۔ جن کا انسان معاشرے کے ایک رکن کی حیثیت سے اکتساب کرتا ہے۔ جن کے برتنے سے معاشرے کے متضاد و مختلف افراد طبقوں میں اشتراک و مماثلث وحدت اور یک جہتی پیدا ہو جاتی ہے۔''
>
> (پاکستانی کلچر، ڈاکٹر جمیل جالبی ص ۴۹)

کلچر کی اس تعریف پر شان الحق حقی کا خیال کچھ اس طرح ہے۔

''جالبی صاحب نے کلچر کا لفظ بڑے مخلوط معنی میں استعمال کیا ہے۔ اور یہ خلط مبحث کسی حد تک اس تبصرے میں بھی در آیا ہے۔ لیکن کلچر کا اصل تعلق ان اعلیٰ ترین

تخلیقات سے ہے۔ جو کوئی معاشرہ دنیا کو دے سکے اور جنھیں دنیا اپنا سکے۔ معاشرے کی روایت جنھیں جالبی صاحب نے تہذیب کا جغرافیہ کہا ہے، تہذیب کی زیریں سطح سے تعلق رکھتی ہیں انھیں کلچر کہیں یا تمدن یا تہذیب یا معاشرت۔ یہ اپنی حفاظت خود کر سکتی ہے۔''

(ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ موئف گوہر نا شاہی ص ۳۸۶)

''پاکستانی کلچر'' کا ترجمہ ۱۹۸۴ء میں انگریزی میں بھی شائع کیا گیا ہے تاکہ جو لوگ اردو زبان سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں وہ بھی کلچر کے مسئلہ کو سمجھیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے کلچر کے ساتھ ساتھ قومی زبان اور یک جہتی پر بھی قلم اٹھایا ہے اس مسئلہ پر بھی ایک کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ''قومی زبان: یک جہتی، نفاذ اور مسائل'' ہے۔ اس میں کئی خطبے پیش کئے گئے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہو جائے۔ انکا خیال ہے مفاد پرست سیاست داں نے اردو زبان کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ مغربیت کا رنگ ہم پر ایسا چڑھا ہے کہ اترنا مشکل ہے۔ کیونکہ ان کا ذہن آج تک انگریزوں کی غلامی کے اثر میں ہے۔ ہمیں اسکے خلاف جدوجہد کرنی ہوگی۔ اردو ذریعہ تعلیم اسکولوں میں بڑھانا ہوگا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی مورخ، محقق، اور نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مترجم بھی ہیں۔ ترجمہ کرتے وقت مترجم اس بات سے پوری طرح آزاد ہوتا ہے وہ جس تصنیف کو چاہے اسکا ترجمہ کرے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے سب سے پہلے جارج آردل کا شہرہ آفاق ناول اینیمل فارم ہے اس کا ''جانورستان'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ جانورستان کی خاصیت ہے کہ یہ ڈاکٹر جالبی کی پہلی کتاب ہے۔ اس میں روس میں جو مزدوروں پر ظلم ہو رہے تھے۔ اسکی تصویر بہت اچھے پیرائے میں پیش کی گئی۔ جاگیردار طبقہ مزدوروں کے ساتھ جانوروں کی طرح سلوک کرتا تھا۔ جانور بھی ایک حد تک ظلم برداشت کرتے ہیں۔ تنگ آکر بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ''جانورستان'' میں ہر جانور نے اپنا اپنا کردار بڑی اچھی طرح نبھایا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی مغربی نقاد ٹی۔ ایس، ایلیٹ سے بہت متاثر تھے انکی پسند نے یہ رنگ دیکھایا کہ انھوں نے ایلیٹ کے مضامین کا اردو میں ترجمہ کر دیا۔ ہماری تنقید نگاری کو ایک نئی فکر سے روشناس کرایا۔

اس کتاب میں دو حصّے ہیں پہلے حصّے میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ایک مطالعہ میں ڈاکٹر جالبی نے ایلیٹ کو

بحثیت نقاد، بحثیت شاعر، بحثیت ڈرامہ نگار اور ایلیٹ کے ادبی مقام کو بیان کیا ہے۔ دوسرے حصے میں ایلیٹ کے ۱۴ مضامین شامل ہیں یہ مضامین مشرقی تنقید کے لئے سودمند ثابت ہوسکتے ہیں۔ اگر ان کا اچھی طرح جائزہ لیا جائے۔

دوسرا ترجمہ ''ارسطو سے ایلیٹ'' تک ہے۔ یہ کتاب مشرقی نقاد اور طالب علموں کو اردو ادب میں ایک نئی راہ دکھاتی ہے۔ اس میں ۱۸ مصنفوں کے مضامین شامل ہیں اس کے علاوہ مغربی تنقید کو کئی ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ قدما کا دور ۲۔ نشاۃ الثانیہ ۳۔ کلاسیکیت ۴۔ رومانیت ۵۔ سائنس کا دور ۶۔ بیسویں صدی

''ارسطو سے ایلیٹ تک'' کا مقدمہ اپنے آپ میں کافی جامع ہے۔ بقول ڈاکٹر احسن فاروقی

> ''اس کتاب کے مقدمہ کا ذکر کردونگا یہ یورپ میں تنقید کے ارتقا کا منظر دکھاتا ہے۔ مجھے جو چالیس برس سے انگریزی تنقید کا درس دے رہا ہوں چونکا دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مقدمہ اور نوٹوں کو ملا کر یورپ کی تنقید کے بابت ایک مکمل تنقید کی کتاب بنائی جاسکتی ہے۔''
>
> (ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نوشاہی ص ۴۱۷)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ترجمہ کرتے وقت ادب کے ساتھ ساتھ غیر ادب کا بھی خیال رکھا ہے۔ پروفیسر عزیز احمد کی انگریزی کتاب ''برصغیر میں اسلامی جدیدیت'' اور ''برصغیر میں اسلامی کلچر'' کا ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو زبان میں کیا ہے تاکہ مشرقی قارئین بھی ان کتابوں سے مستفیض ہوسکیں۔ یہ کتابیں انگریزی میں ہونے کی وجہ سے مغربی قارئین تک ہی پہونچ سکیں تھیں۔ بقول جمیل جالبی میں نے یہ ترجمہ صرف ترجمہ کے لئے نہیں کیا بلکہ اپنے معاشرے میں فکر نو کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لیے کیا ہے اس کا ترجمہ کتنا مشکل کام تھا میں نے ترجمہ متن کے عین مطابق کیا ہے اور انگریزی کے پیچیدہ جملوں اور عزیز احمد کے تہ دار اسلوب کو بھی اردو زبان کے مزاج کے قریب رکھنے کی کوشش کی ہے۔

''برصغیر میں اسلامی جدیدیت'' ۱۶ باب پر مشتمل ہے ہر باب میں جید عالموں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سرسید احمد خاں، علامہ اقبال، شبلی نعمانی، محمد علی جناح، ابوالکلام آزاد اور ابوالاعلی مودودی شامل ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''برصغیر میں اسلامی کلچر'' ترجمہ کر کے ہند و پاک میں اسلام کے حالات پر روشنی

ڈالنے کی کوشش کی ہے اگر یہ کتاب اردو میں نہ سامنے آتی تو خود مسلمان اپنے حالات سے واقف نہ ہو پاتے۔اس کتاب کے دو حصّے ہیں حصہ اوّل کا موضوع ''مسلم ہندوستان کا اسلامی دنیا سے تعلق''اس میں چار باب ہیں دوسرے حصّے کا موضوع ''مسلم ہندوستان اور ہندوستان کا باہمی تعلق'' ہے۔اس میں بارہ ابواب ہیں۔اسلامی کلچر مسلمانوں کی تاریخ معلوم ہوتی ہے۔

بچوں کا ادب میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''حیرت ناک کہانیاں''، ''نہ ہوئی قرولی'' اور ''بارہ کہانیاں'' لکھی ہیں۔ان میں ''حیرت ناک کہانیاں'' ایسی کتاب ہے جس میں خوف کے ساتھ ایک دلچسپی عنصر بھی شامل ہے اس میں ایک بید کا قصہ اور دوسری چھن چھن چھن چھن کی کہانی ہے۔جو پڑھنے والے کو حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔دوسری ''نہ ہوئی قرولی'' ہے۔یہ خوجی کی سرگزشت ہے خوجی پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناول ''فسانہ آزاد'' کا کردار ہے۔جس کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے اتنے رنگوں میں پیش کیا ہے کہ ٦٦ کہانیاں بن گئیں ہیں۔ہر رنگ دلفریبی اور دلچسپی لئے ہوئے ہے۔

خوجی کا نام خواجہ بدیع الزماں ہے جن پر طاقت کا نشہ ہے جو غصے میں اپنی قرولی نکالنے کی دھمکی دیتا رہتا ہے مگر کبھی نکالتا نہیں ہے۔

تیسری کتاب ''بارہ کہانیاں'' ہے۔اس میں ۱۲ کہانیاں دی گئیں ہیں جو ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے بچپن میں سنی یا پڑھی تھیں۔یہ سبق آموز کہانیاں ہیں۔ان سے بچے اور بڑے زندگی میں صحیح راستہ اپنا سکتے ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی تبصرہ نگاری بھی اپنے آپ میں اہمیت کی حامل ہے۔ان کے تبصروں کی کل تعداد ۱۲۴ ہے جو رسالہ ''نیا دور'' کراچی سے شائع ہوئے۔ان میں زیادہ تبصرے ایک دو صفحات میں ہیں۔مگر کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی طوالت کی وجہ سے مضمون کی شکل اختیار کر گئے ہیں جنھیں انگریزی میں Reveiw Article یعنی مضمون نما تبصرہ کہا جاتا ہے۔ان میں بعض تبصرے چند سطروں پر مشتمل ہیں۔ ڈاکٹر جالبی کا سب سے طویل تبصرہ ذہین شاہ تاجی کے مجموعہ کلام ''آیات جمال'' پر ہے۔جو ۸ صفحات پر مشتمل ہے ایک تبصرہ جو سب سے مختصر ہے وہ مجلس یادگار غالب کے مطبوعات پر ہے۔جو قریب آٹھ دس سطروں پر مشتمل ہے۔جمیل جالبی کے تبصروں کو ہم تین حصّوں میں بانٹ سکتے ہیں۔جیسے پہلے حصّے میں کتاب کا نام مصنف، مرتبہ، مترجم کا نام، کتب صفحات کی تعداد کتاب کی قیمت پر، سن اشاعت اور ناشر کا نام شامل ہے۔یہ رسمی حصّہ ہوتا ہے۔دوسرا حصّہ جو زیادہ اہم ہے اس میں کتاب کی ضرورت اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی جاتی

ہے تیسرا حصّہ بھی رسمی ہوتا ہے اور اس میں کتابت، طباعت اور کاغذ کی نوعیت کا ذکر ہوتا ہے۔

ہم نے چند مندرجہ ذیل تبصروں کے بارے میں لکھا ہے پیت کی ریت بیوان ناطق، آیات جمال، بنگال کا پوتھی ادب، فرہنگ اصطلاحات فلسفہ، سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے، فکر وفن، تار پیراہن، جدید غزل، تذکرہ صوفیائے پنجاب، اردو ادب میں رومانوی تحریک، کاغذی پیرہن، صاحب، گلشن ہمیشہ بہار، پسِ پردہ تاریخ تازہ نوائے معارک، بیاض، معاہدہ عمرانی، باغ و بہار، سرسید احمد خاں، چشم نگراں، اکائی، پاکستان کی علاقائی زبانوں پر فارسی کا اثر، سلومی، جاڑے کی چاندنی، پنجابی لوک کہانیاں، صحرا نوارد کے خطوط، نوائے ظفر، چھ کتابیں ایک ادارہ، انیسویں صدی میں وسط ایشاء کی سیاحت، تذکرہ صوفیائے سرحد، سرود رفتہ، غالب شاعر امروز فردا، انتخاب ریاض خیر آبادی، تاریخ وتنقید ادبیات اردو، ہفت مقالہ، کلک موج، اسلام اور موسیقی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے ادبی کارناموں میں اداریہ نگاری کا مشکل فن بھی شامل ہے۔ انھوں نے جو اداریے لکھے ہیں وہ تاریخی اہمیت کے حامل ہیں شاہد احمد دہلوی کے ماہنامہ ''ساقی'' میں ان کا پہلا اداریہ ''باتیں'' کے عنوان سے لکھا گیا۔ جب ڈاکٹر جالبی نے خود رسالہ ''نیا دور'' جاری کیا تو اس کے اداریے لکھے تقریباً بائیس ۲۲ اداریے ''نیا دور'' کے لئے لکھے۔ کل ۴۷ اداریے لکھے ہیں۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے کئی کتابوں کے پیش لفظ بھی لکھے ہیں۔ جن میں سے چند اپنے آپ میں شہرت رکھتے ہیں۔ قراۃ العین حیدر نے ایک کتاب کا ترجمہ کیا تھا۔ جو ہنری جیمز کا ناول ''دی پورٹریٹ آف اے لیڈی'' ہے اس پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے پانچ صفحات کا پیش لفظ لکھا ہے۔

ان کا دوسرا پیش لفظ روسی پروفیسر ڈاکٹر لدمیلا کی تصنیف ''فیض احمد فیض : حیات اور تخلیقات'' پر ہے جس کو کافی شہرت ملی ہے۔

انھوں نے وصی احمد بلگرامی کی کتاب ''ماہ کنعان'' پر بھی پیش لفظ لکھا ہے اس کی ایک خاصیت ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی اس پیش لفظ کو ''تقریش'' کا نام دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے۔ ''تقریش کا لفظ میں نے وضع کیا ہے جس کے معنی ایسی تحریر یا پیش لفظ کے ہیں جس میں تقریظ کا پہلو نمایاں ہو۔'' یہ پیش لفظ فنی اعتبار سے کامیاب ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی شخصیت کی وجہ سے ادبی دنیا میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ

سیمینار، جلسے اور مختلف محفلوں میں موعو کئے جاتے ہیں۔ جن میں صدارت بھی کرتے ہیں اور خطبے بھی دیتے ہیں چند خطبات جو اہمیت کے حامل ہیں۔

''خطبۂ صدارت جس میں ڈاکٹر داؤ درہبر کے کام کا تعارف کرایا گیا'' ایک خطبہ صدارت جو حمیدہ اختر حسین رائے پوری کی تصنیف ''ہم سفر'' کے بارے میں ہے۔ علاّمہ اقبال یادگاری خطبہ میں ڈاکٹر جالبی نے جو خطبہ دیا اس کا موضوع ہے'' علامہ اقبال خطوط کے آئینے میں'' اس کے علاوہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی یادگاری خطبہ جس کا موضوع ''پاکستان میں ذریعہ تعلیم کا مسئلہ'' ہے ایک خطبہ ڈاکٹر سید عابد حسین میموریل لیکچر نئی دہلی اس کا موضوع ہے۔ ''لکھنوی تہذیب کا نمائندہ شاعر قلندر بخش جرات''۔ ایک اہم خطبہ بابائے اردو یادگار لیکچر جس کا موضوع ''محمد تقی میر'' ہے یہ کتاب کی شکل میں آچکا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی علمی وادبی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے بعد اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انکی اپنی شخصیت اور انکی تصانیف ادب کا گراں قدر سرمایہ ہے۔

☆☆☆☆☆

شعبۂ اردو

Department of Urd

Aligarh Muslim Universit

Aligarh-202 00

Tel.: 2700920, 921 Extn. 1631

D.No.:________/UR **Dated:................**

CERTIFICATE

This is to certify that the present thesis entitled **"Jamil Jalbi Ki Adabi Khidmat"** has been accomplished by Mrs. Sadia Suleman under my supervision and guidance and it is her original research work. This is further certified that this work has not been submitted to any other University for any other degree.

The thesis is being submitted for evaluation and the award of Doctoral Degree in Urdu.

17/9/2008

(Prof. Asghar Abbas)
Supervisor
SUPERVISOR

Counter Signature

(Prof. Khursheed Ahmad)
Chairman
Chairman,
Department of Urdu
A.M.U., Aligarh

ڈاکٹر جمیل جالبی کی ادبی خدمات

فہرست

باب سوم ۔ تنقیدی کارنامے

باب چہارم۔جمیل جالبی کے ترجمے

باب پنجم۔ متفرق ادبی تحریریں

باب اوّل

(ڈاکٹر جمیل جالبی: شخصیت اور سوانحی منظر نامہ)

ڈاکٹر جمیل جالبی: شخصیت اور سوانحی منظر نامہ

محمد جمیل خان نام اور ڈاکٹر جمیل جالبی قلمی نام ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں یوسف زئی پٹھانوں میں ایک بزرگ سوات سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور انہوں نے یہیں سکونت اختیار کر لی۔ ان ہی بزرگ کی آٹھویں پشت میں ڈاکٹر جمیل جالبی ہیں۔ ان کے دادا کا وطن میرٹھ تھا۔ زمینداری خاندانی پیشہ تھا۔ لیکن وہ خود مغربی تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ کے توال تھے۔ غالباً ۱۹۲۶ء میں علی گڑھ ہی میں ریٹائر ہو گئے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں کچھ اختلاف ہے۔ کہیں ۱۲ جون ۱۹۲۹ء ہے تو کہیں یکم جولائی ۱۹۲۹ء لکھا ہے۔ خلیق انجم اپنے مضمون ''کچھ جمیل جالبی کے بارے میں'' لکھتے ہیں۔

> ''اگر چہ سرکاری ریکارڈ میں جمیل جالبی صاحب کی تاریخ ولادت یکم جولائی ۱۹۲۹ء ہے۔ لیکن ان کی پیدائش کی اصل تاریخ ۱۲ جون ۱۹۲۹ء ہے۔ جالبی صاحب علی گڑھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی۔ ۱۹۴۳ء میں میٹرک کا امتحان سہارن پور کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے پاس کیا۔ میرٹھ کالج سے ۱۹۴۵ء میں ایف اے اور ۱۹۴۷ء میں بی اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے۔''[1]

پاکستان جا کر ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ اور اعزازی ڈگری ایس سی حاصل کی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی تعلیم کے زمانے میں جن استادوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ان میں پہلا نام مولوی فیض الحسن کا ہے جنھوں نے ان کے اندر ادبی ذوق پیدا کیا۔ ہائی اسکول میں ہی ان کے اندر تخلیقی صلاحیت پیدا ہوئی۔ سائنس سے انھیں کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ان کا رجحان شعر و شاعری کی طرف تھا۔ اسی سلسلے میں ایک واقعہ ہے۔ جب وہ نویں جماعت میں آئے تو ان کے والد نے سائنس دلوادی۔ جمیل نے خاموشی سے میٹرک سائنس سے پاس کر لیا۔ مگر جب وہ کالج میں پہونچے تو انکے والد نے پھر سائنس میں داخلہ دلوایا۔ جمیل جالبی نے داخلہ تو لیا مگر دو مہینے بعد والد کو بغیر اطلاع کئے آرٹس میں داخلہ لے لیا۔ جب رزلٹ آیا تو والد صاحب بہت ناراض ہوئے مگر اب کیا تھا۔ جمیل جالبی ادب کی دنیا کو اپنا چکے تھے۔ وہ دن رات انگریزی اردو کے

---

[1] خلیق انجم، مضمون ''کچھ جمیل جالبی کے بارے'' میں مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ، موئف گوہر نا شاہی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی۔ ۶ ۱۹۹۳ء ص ۱۸

رسالے اور کتابیں پڑھتے تھے۔ سماجی علوم کا مطالعہ بڑی گہرائی سے کرتے تھے۔

''خلیق انجم نے اپنے مضمون میں انکے کالج کے زمانے کا واقعہ لکھا ہے۔

''جب ذرا شعور کی آنکھیں کھلیں اور ادبی ذوق نکھرنا شروع ہوا تو جمیل جالبی نے ''ساقی''، ''نگار'' اور ''ادبی دنیا'' جیسے رسالے اپنے نام جاری کرالیئے۔ اب ان کی دلچسپی کے میدان کو وسعت مل گئی۔ کلاسیکی اور جدید ادب کا مطالعہ شروع ہوگیا۔ مطالعے نے جنون کی صورت اختیار کرلی۔ ہر وقت مطالعے میں مصروف رہتے اگر ایک ساتھ دو تین چھٹیاں ہو جاتیں تو کتابوں کے ساتھ کمرے میں بند ہو جاتے۔ کالج کے طالب علموں نے ان کا نام ''علاّمہ'' رکھ دیا تھا۔ وہ زمانہ ہے جب جالبی بی۔ اے کر رہے تھے انھوں نے ذاتی گفتگو میں مجھے بتایا کہ ابتدائی دور میں انہیں سب سے زیادہ محمد حسن عسکری نے متاثر کیا۔[۱]

یہ زمانہ ترقی پسند تحریک کا تھا۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، منٹو حیات اللہ انصاری، قرۃ العین حیدر، میراجی، ن۔ م راشدؔ فیض احمد فیض اور اختر الایمان بے حد پسند تھے۔ مطالعہ کی دیوانگی اسی قدر بڑھی ہوئی تھی کہ کتابوں کی تلاش میں دوسرے شہروں تک ہو آتے تھے۔ انور عالم صدیقی اپنے مضمون ''میرا اہم جماعت'' میں لکھتے ہیں۔

''ہمیں دو کتابوں کی تلاش تھی ایک ن۔ م راشد کا مجموعہ ''ماوراء'' اور دوسری کرشن چندر کا ناول ''شکست'' ہم نے بہت تلاش کی دوست احباب سے پوچھا مگر کوشش کے باوجود نہ مل سکیں۔ ایک دن جمیل کالج نہیں آئے میں انکے گھر گیا تو معلوم ہوا دلّی گئے ہیں۔ دوسرے دن اتوار تھا۔ پیر کو جب کالج آئے تو ''ماوراء'' اور ''شکست'' ان کے ہاتھ میں تھیں۔ انھوں نے دونوں کتابیں دور سے دیکھائیں۔ چہرہ روحانی مسرت سے معمور تھا۔ پوچھنے پر بتایا کہ وہ سائکل پر دلّی جا کر یہ کتابیں بیس فی صد کمیشن پر خرید کرلائے ہیں۔ جمیل نے بتایا کہ ماوراء کا دیباچہ کرشن چندر نے لکھا ہے۔ اور کرشن چندر کا یہ دیباچہ سی ڈے لیوس کی کتاب ''اے ہوپ فور پوئٹری'' سے ماخوذ ہے''[۲]

---

۱ خلیق انجم، مضمون ''کچھ جمیل جالبی کے بارے'' میں مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ، موئف گوہر نوشاہی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی۔ ۶ ۱۹۹۳ء ص ۲۳

۲ انور عالم صدیقی، مضمون ''میرا اہم جماعت'' مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ موئف گوہر نوشاہی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی۔ ۶ ۱۹۹۳ء ص ۳۳

یہ زمانہ کرشن چندر کا تھا۔ ہر طرف ان کا طوطی بول رہا تھا۔ میرا جی کی نظمیں اور حسن عسکری کے افسانے سب کو پسند آرہے تھے۔ طالب علموں پر ترقی پسند تحریک کا اثر تھا۔ آزاد نظم کا زبردست رواج تھا۔ اس وقت جمیل جالبی ان ادیبوں کو دن رات پڑھتے تھے۔

۱۹۴۷ء کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے بھائی عقیل کے ساتھ کراچی پہونچ گئے۔ یہاں آکر ایم اے ایل ایل بی میں داخلہ لیا۔ ۱۹۴۹ء میں کراچی سے اخبار ''امروز'' نکلا تو اس میں کام کرنے لگے۔ لیکن جلد ہی اس کو چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ یہ اسکول کراچی کے بہترین اسکولوں میں شمار ہونے لگا۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے دلّی کا یادگار مشاعرہ اسٹیج کیا۔ یکم نومبر ۱۹۵۳ء کو ڈاکٹر جمیل جالبی کی شادی نسیم شاہین صاحبہ سے ہوئی۔ جو انکے ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ انکے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہیں۔ سب نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ چاروں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ بڑے بیٹے خاور جمیل سندھ میں سرکاری اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ چھوٹے بیٹے محمد علی جمیل خان نے کیمیکل انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی۔ صاحبزادی سمیرا جمیل نے بی۔ اے کیا اور فرح جمیل نے انگریزی ادب سے ایم اے کیا ہے۔

> حسین بانو نے ڈاکٹر جمیل جالبی کی زوجہ نسیم شاہین کا انٹرویو لیا تو نسیم شاہین صاحبہ نے بتایا کہ ''بچوں کو اچھا بننے کا بہت احساس دلاتے ہیں۔ ان کی خواہش تھی ہمارے بچوں میں سے کوئی ڈاکٹر بنے۔ لیکن افسوس انکی یہ خواہش ابھی تک پوری نہیں ہوسکی۔ جالبی صاحب ادیب اور نقاد ہونے کے باوجود اپنے بچوں کو ادیب اور نقاد دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ لکھنے پڑھنے کا کام میں دکھ بہت اٹھانے پڑتے ہیں۔ اور ادب ہمارے معاشرے میں معاشی خوشحالی کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ ہر ادیب باپ یہ چاہتا ہے کہ اسکے بچے ایسا پیشہ نہ اختیار کریں جس میں دکھوں کے علاوہ کچھ نہ ہو۔[1]

اس انٹرویو میں نسیم شاہین صاحبہ نے انکی عادتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ جالبی صاحب رات کے وقت لکھنا پسند کرتے ہیں۔ لکھتے وقت قہوہ پینا پسند ہے اور پان بھی کھاتے ہیں۔ ان کو کرتا، شیروانی اور چپل پہننا پسند ہے۔ بیگم کو ساڑی میں دیکھنا پسند ہے۔ شاہین صاحبہ کو انکی جو عادت ناپسند ہے۔ وہ پان میں زیادہ تمبا کو کھانا۔ وہ کہتی ہیں کہ ''جالبی صاحب کی دو کمزوریاں ہیں۔ ایک پان اور دوسری بیوی۔ وہ پان اور بیوی کے

---

[1] حسین بانو، مضمون ''ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے گھر میں'' مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ء ص ۱۵۱

بغیر ایک لمحہ نہیں رہ سکتے۔ انکا رجحان مذہب کی جانب تو ہے لیکن اس پر باقاعدگی سے عمل نہیں کرتے۔ جب سے حج کر کے آئے ہیں صرف صبح کی نماز باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ بچوں کو نماز پڑھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ میرے پانچوں وقت کی نماز پڑھنے سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ جالبی صاحب کی کوئی بات مجھے ناپسند نہیں ہے۔ لیکن ایک بات جو مجھے سب سے زیادہ پسند ہے اور مجھے اس پر فخر بھی کہ میں ڈاکٹر جمیل صاحب کی بیوی ہوں اور یہی میرا سب سے بڑا اعزاز ہے۔

پان کے سلسلے میں انکی چھوٹی بیٹی فرح جمیل نے بتایا کہ" پاپا کو صرف ایک بات پر زیادہ غصہ آتا ہے جب انہیں پان نہ ملے"۔ جمیل صاحب کی چھوٹی بہن مہرافروز کہتی ہیں۔

"ان کو ہر ایک کے کام آنا بہت اچھا لگتا ہے ایک بزرگ کی طبیعت خراب تھی اور بھائی صاحب انکی بھی مدد کرتے رہتے تھے۔ ایک دن انکی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ موسلا دھار بارش میں گھٹنوں گھٹنوں پانی میں پائنچے چڑھا کر خود دوا دینے گئے حالانکہ گھر میں ملازم بھی موجود تھے۔ سب سے زیادہ انہیں غصہ نافرمانی پر آتا ہے۔ اور جب وہ گھر والوں اور بھائی بہنوں کے ساتھ ہوں تو بہت خوش نظر آتے ہیں۔ پان ان کی کمزوری ہے۔[1]

جمیل نام انکی خالہ نفیس بیگم نے رکھا تھا۔ جبکہ جمیل کے ساتھ جالبی انھوں نے خود لگایا تھا۔ انکے رشتے کے دادا جالب دہلوی کی ادب کی دنیا میں بڑی شہرت تھی۔ گھر میں کئی لوگ ان سے متاثر تھے۔ جالب دہلوی جمیل صاحب کے والد کے ماموں کے دوست اور بہنوئی تھے۔ جالب دہلوی کے اخبار "ہمدم" و "ہمت" لکھنو سے نکلتے تھے۔ ماموں ان اخبار میں کام بھی کرتے تھے۔ جالب صاحب کا ذکر گھر میں ہوتا رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جمیل صاحب بھی ان سے متاثر ہوگئے۔ پہلی بار جو مضمون لکھا وہ بھی جالب صاحب پر لکھا۔ جس کا نام "بابائے صحافت میر جالب دہلوی" ہے۔

اعجاز الحق قدوسی اپنے مضمون "پرخلوص دوست" میں لکھتے ہیں کہ "میں نے انکا تعارف جوش صاحب سے کرایا جوش صاحب ان سے مل کر بہت خوش ہوئے کہنے لگے ان کا نام کے ساتھ جالبی کی نسبت کیسی ہے، میں نے کہا کہ یہ سید جالب دہلوی کے نواسے ہیں اور اسی نسبت سے اپنے آپ کو جالبی کہتے ہیں۔ اور مشرقی پاکستان کے

---

[1] حسین بانو، مضمون "ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے گھر میں" مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ء ص ۱۵۴۔۱۵۷

سب ادیب ان کو جمیل ''جلیبی'' کہتے ہیں ۔ کہنے لگے کیا حرج ہے یہ خود بھی تو شریں

گفتار ہیں۔ اگر وہ ان کو ''جلیبی'' کہتے ہیں تو کچھ غلط تو نہیں کہتے ہیں ۔[1]

ڈاکٹر جمیل جالبی پان کھانے کے بے حد شوقین ہیں ۔ سڑکوں پر پیک نہیں پھینکتے بہت سلیقے سے کھاتے ہیں۔ مستقل رومال سے منہ صاف کرتے رہتے ہیں۔

صادق حسین لکھتے ہیں کہ'' پان کی گلوری منہ میں دبائے اس بے ساختگی سے

کلام کرتا ہے کہ سامع کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی''[2]

ڈاکٹر جمیل جالبی کا انداز بہت شرمیلا ہے۔ خاموش طبع ،خوش اخلاق اور نرم گفتار ہیں ۔ انکا چہرہ مسکراتا ہوا ہے۔ زیر لب تبسم مخاطب کو متوجہ کر لیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پیشے کا انسان کی شخصیت پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا جبکہ وہ تنقید اور تحقیق جیسا خشک کام کرتے ہیں پھر بھی انکے چہرے پر کوئی تناؤ نہیں کوئی سختی نہیں ہے۔

ان کو نہ تو بچپن کے لاڈ پیار نے بگاڑا نہ انکی خوبصورتی نے انہیں مغرور بنایا۔ انکا ناک نقشہ کچھ اس طرح کا ہے۔ گوری رنگت، بھولی صورت پتلے ہونٹ، ستواں ناک اور چھریرا بدن ہونٹوں پر ہر دم پان کی لالی گلاب کا پھول جمیل صاحب کی کمزوری ہے۔ جب بھی سوٹ پہنتے ہیں دل کے اوپر گلاب کا پھول لگا لیتے ہیں۔ اگر کوٹ نہ ہو تو اپنی کار کے اسٹیئرنگ میں لگا لیتے ہیں۔

جمیل جالبی کو پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ ادبی شوق انہیں والدہ سے ورثہ میں ملا ہے۔ بچپن میں وہ کاپی پھاڑ کر کتابیں بنا لیتے تھے۔ انہیں دوسری زبانوں کا اور امتحان پاس کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ تحمل اور برداشت انکی عادت کا خاصہ ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو اتنے علمی کارنامے سامنے نہ آتے ۔ انکے تحمل کی ایک مثال مرزا ادیب نے اپنے مضمون ''دیو قامت'' میں پیش کی ہے۔

''ہم ڈھاکہ سے گاڑیوں میں لد لدا کر ایک سیر گاہ کی طرف جارہے تھے ایسے

میں مقابلے کا احساس سواریوں کے دلوں میں جاگ اٹھا اس عالم میں خدا جانے آگے

کیا چیز آئی کہ ڈرائیور نے گاڑی کو بریک جو لگائے تو ساری سواریاں اپنا توازن برقرار

نہ رکھ سکیں۔ لیکن جمیل جالبی صاحب نیچے گر پڑے انہیں بڑی مشکل سے گاڑی کے

اندر لے گئے ۔نیم بے ہوش نظر آتے تھے۔ میں نے دیکھا انکے لبوں کو حرکت ہو رہی

---

[1] اعجاز الحق قدوسی، مضمون پر خلوص دوست، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ موئف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ء ص ۱۷۷

[2] صادق حسین، مضمون ڈاکٹر جمیل جالبی، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ موئف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۳ء ص ۱۰۱

تھی چہرے پر جھکا تو ایک لفظ میرے کانوں میں پڑا یہ لفظ تھا۔ شکریہ۔ سخت حیرت ہوئی کہ یہ شخص درد سے مرا جا رہا ہے۔ مگر ایسے میں بھی شکریہ کا لفظ نہیں بھولا۔ یہ وہ شائستگی ہے جو لال قلعے کے سائے میں پلی بڑھی تھی۔ یہ وہ وضع داری ہے۔ جو سرزمین میرؔ و غالبؔ سے پھوٹی تھی۔[1]

تنقیدی اور علمی مضامین کے ساتھ ساتھ مہینے رسالہ ''ساقی'' میں ''باتیں'' لکھتے تھے۔ لیکن جب انکم ٹیکس افسر بنا دیئے گئے تو ان کا نام ادارہ ''ساقی'' میں سے ہٹا دیا گیا۔ مگر نجی طور پر ''ساقی'' سے ان کا تعلق قائم رہا۔ ملازمت کے باوجود مضامین بھی لکھتے ہیں اور ترجمہ بھی کرتے ہیں۔ ایلیٹ کے مضامین کا ترجمہ کیا۔ سجاد حسین کی کتاب حاجی بغلول ایڈیٹ کر کے چھپوائی۔ جعفر زٹلی کے کلام کو جمع کیا۔ شاہد صاحب لکھتے ہیں۔

''جمیل صاحب کے ادبی کارناموں میں نیا دور کا اجراء بھی ہے جب نیا دور جاری ہوا تو جمیل صاحب نے مجھ سے لکھنے کی فرمائش کی۔ اس کے پیش رو میں بھی لکھا کرتا تھا۔ جمیل صاحب کی فرمائش تھی کہ یا تو رپورتاژ لکھوں یا خاکہ، یا کسی عالمی شاہکار کا ترجمہ دو۔ میں کئی دن تک سرگرداں رہا کہ اپنے پیارے دوست کے لیے کیا لکھوں۔ اور ایک دن میں نے خواجہ حسن نظامی کا خاکہ لکھا۔ جمیل جالبی اسے پڑھ کر پھڑک گئے۔''[2]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے قلم سے بچوں کو بھی خوش کیا ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے بید کی کہانی، بلیاںؔ، حضرت امیر خسرو، چھن چھن چھن چھن، عجیب واقعہ اور نئی گلستاں جیسی کہانیاں لکھی ہیں۔ یہ ''عصمت'' اور ''ہونہار'' میں شائع ہوئیں۔ ''فسانہ آزاد'' کے مزاحیہ کردار ''خوجی'' پر مبنی داستان ''ہونہار'' میں قسط وار شائع کرائی۔ بچوں کی تربیت پر چند ایسے مضامین بھی لکھے ہیں جس سے علمی شوق پیدا ہوا اور ان میں آگے بڑھنے کی ترقی کرنے کی لگن جاگے۔

انور عالم صدیقی لکھتے ہیں کہ ''جمیل عسکری کے اثر سے آزاد ہو گئے۔ اس اثر سے نکل کر وہ ٹی ایس ایلیٹ کے اثر میں آ گئے۔ لندن گئے تو اس سے مل کر آئے۔ یہ کہتے ہیں کہ میں بھی اسی انداز سے اردو میں لکھنا چاہتا ہوں۔ اس کا گر انھوں نے تلاش کیا کہ ایلیٹ کے منتخب مضامین کا اردو میں اس طور پر ترجمہ کیا کہ ایلیٹ کے جملے کی ساخت اردو کے سانچے میں ڈھل جائے۔ ان ترجموں سے جہاں اردو کے تنقیدی

---

[1] امرزا ادیب، مضمون ''دیو قامت''، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ء ص ۱۳۸

[2] شاہد احمد دہلوی، مضمون ''جمیل جالبی'' مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۳ء، ص ۸۵

سرمائے میں اضافہ ہوا وہاں ترجمے کے ذریعے نیا اسلوب اور طرز ادا کے مختلف طریقے اردو میں منتقل ہوئے[1]

ڈاکٹر جمیل جالبی کو لکھنے کا شوق کم عمری سے ہی تھا۔ انکی پہلی تخلیق ایک ڈرامہ ہے۔ جسکا نام سکندر اور ڈاکو ہے۔ یہ انھوں نے گیارہ بارہ سال کی عمر میں لکھا تھا۔ انکی کچھ تحریریں ماہنامہ ''عصمت'' میں چھپیں۔ بابائے صحافت میر جالب دہلوی، انکا پہلا مضمون تھا۔ جو ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ میں شائع ہوا۔ پہلی کتاب ''جانورستان'' ہے یہ جارج آرول کے ناول اینیمل فارم کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کے بعد تصانیف کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ اب تک جاری ہے۔ خدا کرے یہ علم کا دریا جاری رہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تصانیف و تالیفات درج ذیل ہیں۔

۱۔ ایلیٹ کے مضامین	۱۹۶۰ء
۲۔ حاجی بغلول: منشی سجاد حسین	۱۹۶۰ء
۳۔ پاکستانی کلچر: قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ	۱۹۶۴ء
۴۔ تنقید اور تجربہ (۲۴ تنقیدی مضامین کا مجموعہ)	۱۹۶۷ء
۵۔ دیوانِ حسن شوقی	۱۹۷۱ء
۶۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ	۱۹۷۲ء
۷۔ دیوانِ نصرتی	۱۹۷۲ء
۸۔ قدیم اردو کی لغت	۱۹۷۳ء
۹۔ تاریخ ادب اردو جلد اول	۱۹۷۵ء
۱۰۔ ارسطو سے ایلیٹ تک	۱۹۷۵ء
۱۱۔ محمد تقی میر: ایک مطالعہ	۱۹۸۱ء
۱۲۔ تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول	۱۹۸۲ء
۱۳۔ تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ دوم	۱۹۸۲ء
۱۴۔ حیرت ناک کہانیاں	۱۹۸۳ء
۱۵۔ Pakistan : The Identify of Culture	۱۹۸۴ء

---

[1] انور عالم صدیقی، مضمون ''میر اہم جماعت'' مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ء ص ۳۲

۱۶۔ نئی تنقید (۳۲ تنقیدی مضامین کا مجموعہ) ۱۹۸۵ء

۱۷۔ جانورستان (جارج آرول کے ناول ''اینیمل فارم کا اردو ترجمہ'' ۱۹۸۵ء

۱۸۔ بزم خوش نفساں (شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کا مجموعہ) ۱۹۸۵ء

۱۹۔ حیرت ناک کہانیاں (سندھی) ۱۹۸۵ء

۲۰۔ ادب کلچر اور مسائل ۱۹۸۶ء

۲۱۔ Pakistan Culture ۱۹۸۶ء

۲۲۔ ن۔م۔راشد: ایک مطالعہ ۱۹۸۶ء

۲۳۔ The Changing world of Islam ۱۹۸۶ء

۲۴۔ پاکستانی کلچر (سندھی) ۱۹۸۷ء

۲۵۔ قومی زبان یک جہتی، نفاذ اور مسائل ۱۹۸۹ء

۲۶۔ برصغیر میں اسلامی جدیدیت ۱۹۸۹ء

۲۷۔ کلیات میراجی ۱۹۸۹ء

۲۸۔ قلندر بخش جرات: لکھنوی تہذیب کا نمائندہ شاعر ۱۹۹۰ء

۲۹۔ برصغیر میں اسلامی کلچر ۱۹۹۰ء

۳۰۔ میراجی ایک مطالعہ ۱۹۹۰ء

۳۱۔ معاصر ادب ۱۹۹۱ء

۳۲۔ فرہنگِ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ ۱۹۹۱ء

۳۳۔ قومی انگریزی اردو لغت ۱۹۹۲ء

۳۴۔ فرہنگِ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ جلد دوم ۱۹۹۳ء

۳۵۔ خوجی ۱۹۹۳ء

ڈاکٹر جمیل جالبی کو جن اعزازات سے نوازا گیا وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ داؤد ادبی انعام، ۱۹۶۴ء، ۱۹۷۳ء، ۱۹۷۴ء، ۱۹۷۵ء

۲۔ یونیورسٹی گولڈ میڈل ۱۹۸۷ء

۳۔ محمد طفیل ادبی ایوارڈ ۱۹۸۹ء

۴۔ ستارہ امتیاز حکومت پاکستان ۱۹۹۰ء

ڈاکٹر جمیل جالبی کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ستمبر ۱۹۸۳ء سے ستمبر ۱۹۸۷ء تک رہ چکے ہیں۔ اور مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے صدر نیشن بھی رہے۔ان کے چند اہم خطبات درج ذیل ہیں۔

۱۔ بابائے اردو یادگاری خطبہ، کراچی ۱۹۸۰ء

۲۔ روزنامہ سیاست توسیعی خطبہ حیدرآباد دکن بھارت ۱۹۸۳ء

۳۔ علامہ اقبال یادگاری خطبہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۸۵ء

۴۔ فیض میموریل لیکچر اردو مرکز لندن ۱۹۸۸ء

۵۔ ڈاکٹر عابد حسین میموریل لیکچر، نئی دہلی ۱۹۸۹ء

۶۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی یادگاری خطبہ، کراچی ۱۹۹۳ء

پیش لفظ

اردوزبان ہماری زندگی میں اس طرح شامل ہے جس طرح انسان کے جسم میں روح اور جس کے بغیر ہماری زندگی بے معنی ہے۔ روح نکل جائے تو انسان ختم ہو جاتا ہے۔ اس زمانے میں ہمارے پاس روح تو ہے مگر بے چین ہے۔ کیونکہ اردو کو ہم ضرورت اور خاص طور سے معاشی ضرورت کے تحت استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اردوزبان کی یہ خوش قسمتی کہیئے کہ آج بھی کچھ ایسے اشخاص موجود ہیں جو اردوزبان کو زندہ اور تابندہ رکھنا چاہتے ہیں اور اردوادب کے علمی سفر کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

ان شخصیات کی فہرست میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ جنھوں نے اردو زبان کے بیمار جسم میں دوبارہ جان ڈالنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ انکی کئی تصنیفات ہیں۔ جن کے ذریعے ہم اردوزبان کے کارواں کو صحیح سمت کی طرف لے جاسکتے ہیں۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم انکے مفید مشوروں پر عمل کریں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ کی سرزمین پر پیدا ہوئے ان کا نام محمد جمیل خان ہے۔ جو آگے چل کر ادب کی دنیا میں ڈاکٹر جمیل جالبی کہلائے۔ ابتدائی تعلیم علی گڑھ میں ہی ہوئی لیکن میٹرک سہارن پور سے کیا اور میرٹھ سے بی۔ اے پاس کیا۔ اسی سال ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی، پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۸۸ء میں انھیں ڈی ایس سی کی اعزازی ڈگری بھی دی گئی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی شخصیت کے کئی رنگ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ انکم ٹیکس کمشنر کے عہدے پر فائز ہیں اور دوسری طرف وہ ادب کی دنیا میں ادبی مورخ، نقاد، محقق، دانشور اور مترجم کی حیثیت سے اپنی منزل کی جانب گامزن ہیں۔

انکم ٹیکس کمشنر سے ریٹائر ہوئے تو انھوں نے کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالا لیکن اپنے علمی سفر کو بدستور جاری رکھا۔ اور قلمی کام کرتے رہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کو انکی علمی ادبی خدمات پر انعامات سے نوازا گیا ۱۹۷۷ء میں جب دہلی میں

جشنِ اقبال کے موقع پر سیمینار ہوا تو اس میں شامل ہوکر پاکستان کی نمائندگی کی۔اس کے بعد جب میرتقی میرؔ پر سیمینار منعقد ہوا تو ڈاکٹر جمیل جالبی کو خاص طور سے دہلی مدعو کیا گیا اس کے علاوہ علمی وادبی کام کے سلسلے میں انھوں نے دوسرے ملکوں کا بھی دورہ کیا۔

میرے مقالے کا عنوان ''جمیل جالبی کی ادبی خدمات'' ہے۔اس مقالے کا موضوع خاصہ مشکل ہے۔کیونکہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے ادبی کام کا دائرہ بہت وسیع ہے۔اس میں ہمیں ادب کے ہر پہلو کی طرف رجوع کرنا پڑا۔تاریخ،تنقید،تحقیق اور ترجمہ نگاری اس کے علاوہ شعراء ناول وافسانہ نگاری اور صحافیوں پر بھی مضامین شامل ہیں۔زیرنظر مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اوّل۔مختصر''سوانح حیات'' ہے اس میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی پوری زندگی پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے انکی پیدائش سے لے کر انکی تعلیم وتربیت کیسے ہوئی کس طرح وہ ہندوستان سے پاکستان پہونچے۔

باب دوم۔''تحقیقی کارنامے'' (تحقیق وتدوین) اس میں وہ کتابیں شامل ہیں جن کا تعلق تاریخ اور تحقیق وتدوین سے ہے۔تاریخ ادب اردو کی جلد اوّل،جلد دوم اور جلد دوم کا حصّہ دوم،قدیم اردو کی لغت،دیوان حسن شوقی،دیوانِ نصرتی اور مثنوی کدم راؤ پدم راؤ،کلیات میراجی،بزم خوش نفساں،ن۔م۔راشد:ایک مطالعہ اور میراجی ایک مطالعہ شامل ہیں۔

باب سوم:''تنقیدی کارنامے''اس میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے تنقیدی کارناموں کے بارے میں بیان گیا ہے۔معاصرادب،تنقید اور تجربہ،نئی تنقید،محمد تقی میر،ادب کلچر اور مسائل،پاکستانی کلچر اور قومی زبان: یک جہتی نفاذ اور مسائل۔ان سب کتابوں میں متفرق قسم کے موضوعات پر بے شمار مضامین لکھے گئے ہیں۔جن کو پڑھ کر ہم فیض یاب ہوسکتے ہیں۔اپنے کلچر اپنی قوم اور زبان کو نئی اور اچھی راہیں دکھا سکتے ہیں۔

باب چہارم: میں جمیل جالبی کے ترجمے ہیں۔یہ انگریزی کی ایسی قابلِ قدر کتابیں ہیں۔جن کے ذریعہ نہ صرف اردو ادب کے طلباء بلکہ عام انسان کو بھی ایسی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔جن سے وہ انجان تھے۔ان کتابوں کے نام اس طرح ہیں جانورستان،برصغیر میں اسلامی جدیدیت،برصغیر میں اسلامی کلچر،ایلیٹ کے مضامین اور ارسطو سے ایلیٹ تک۔ان ترجموں سے اس بات کا پتہ چلتا

ہے کہ مسلمان اور اسلام برصغیر میں کن حالات سے گذر رہا ہے۔ دوسرے مشرقی نقاد کو مغربی تنقید کے بارے میں جان کرنئی فکر اور نئی جہت فراہم ہوتی ہے۔

باب پنجم :'' متفرق ادبی تحریریں'' اس میں (الف) بچوں کا ادب ہے جس میں تین کتابیں شامل ہیں۔

(۱) حیرت ناک کہانیاں (۲) نہ ہوئی قرولی (۳) بارہ کہانیاں۔ ان قصوں سے نہ صرف بچے بلکہ بڑے بھی محظوظ ہو سکتے ہیں اور سبق بھی حاصل کر سکتے ہیں اس کے علاوہ (ب) تبصرے (ج) اداریئے (د) خطبات (ہ) پیش لفظ یا تقریظ جس کو جمیل جالبی نے تقریش کا نام دیا ہے۔

آخر میں'' خاتمہ'' ہے اس میں جمیل جالبی کے علمی و ادبی کارناموں پر محاکمہ ہے۔ اس کے بعد کتابیات کی فہرست پیش کی گئی ہے۔

اس مقالے کے موضوع کے سلسلے میں جو مواد ہمیں چاہیئے تھا۔ اس کا ایک بڑا حصہ پاکستان میں موجود تھا اور بظاہر کوئی ایسا سلسلہ نظر نہیں آرہا تھا کہ یہ مواد آسانی سے مہیا ہو جائے۔ Research کے اس سفر میں پریشانیاں تو بہت حائل ہوئیں لیکن میں سب سے پہلے اپنے خالق حقیقی کا شکر ادا کرتی ہوں جس کے کرم سے آج میں اپنی زندگی میں اس مقام تک پہونچی۔ زیر نظر مقالہ کا موضوع اپنے آپ میں بہت وسیع تھا۔ جس کا مواد جمع کرنا مشکل کام تھا۔ لیکن میں نے اس کو ایک چیلنج کی صورت میں قبول کیا۔ بڑی کوشش اور جدو جہد کے بعد مجھے پاکستان جانے کا موقع ملا۔ اور ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کے مکان ڈی ۲۶، بلاک، بی، نارتھ ناظم آباد کراچی پاکستان پر ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ جب میں ان کے گھر پہونچی تو معلوم ہوا کہ وہ چند روز بعد امریکہ کے سفر پر روانہ ہونے والے ہیں انکے جانے میں صرف ۱۰۔۱۲ دن بچے تھے۔ جس میں ہمیں ان کے ساتھ کئی نشستوں میں تبادلہ خیالات کا موقع ملا۔ ان کی ادبی خدمات پر باہمی طور پر ان سے کھل کر بات ہوئی۔ میں جمیل جالبی صاحب کی بے حد شکر گذار ہوں کہ انھوں نے اپنی تمام مصروفیت کے باوجود بہت وقت دے کر خاصا میٹیریل فراہم کرایا۔ وہ ایک سادہ مزاج اور کم سخن انسان ہیں ملنے کے بعد یہ قطعی احساس نہیں ہوتا کہ ہم ایک اعلیٰ پائے کے مورخ اور نقاد سے مخاطب ہیں۔ ہماری ہر ملاقات میں ان کی اہلیہ نسیم شاہین صاحبہ بھی موجود رہیں۔ انھوں نے ہماری بے حد تواضع کی جالبی

صاحب کے کشادہ گھر میں تین بڑی لائبریری موجود ہیں۔انھوں نے ہمیں اپنی تینوں لائبریری کا معائنہ کرایا۔

پاکستان کے اس سفر میں کراچی یونیورسٹی کی لائبریری میں مطالعہ کرنے اور سرسید یونیورسٹی کراچی جانے کا موقع ملا۔ میں ان لوگوں کی ممنون ہوں جن لوگوں نے میرے اس سفر کے دوران میری بھر پور مدد کی جن میں معین الدین صاحب، عظمٰی صاحبہ، نیاز احمد صاحب، فیصل صاحب، ابصار احمد صاحب، انصار احمد صاحب، نصرت صاحبہ اور مصباح الدین صاحب، محمد حسین رضوی صاحب اور انجمن ترقی اردو پاکستان کے معروف صاحب شامل ہیں۔ میں یہاں پر ایک ایسی قد آور اور علم دوست شخصیت کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتی ہوں جن کا نام سید مدثر علی شمسی ہے۔جنھوں نے میری کئی الجھنوں کو کمال شفقت سے دور کیا۔

پاکستان سے لوٹنے کے بعد مزید میٹرئل جمع کرنے کی جدوجہد جاری رہی۔ میں پروفیسر اصغر عباس صاحب کی شکر گذار ہوں جن کی وجہ سے مجھے ایک ایسی شخصیت پر کام کرنے کا موقع ملا جو کسی تعارف کی محتاج نہیں۔جن کو اردو ادب میں ایسا مقام حاصل ہے کہ آنے والی نسلیں کبھی بھلا نہیں پائینگی میں شعبہ اردو کے پروفیسر و چیئر مین جناب خورشید احمد صاحب کی بے حد ممنون ہوں جنھوں نے اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود میری مکمل رہنمائی کی اور اپنے مفید و علمی مشوروں سے اس طرح نوازا کہ مقالہ پائے تکمیل کو پہونچا میں بے حد مشکور ہوں شعبہ اردو کی ایک اور علمی شخصیت کی جو اپنے بلندی قد کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے اور جنکا نام پروفیسر ابوالکلام قاسمی ہے ان کے مفید مشورے اور حوصلہ افزائی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا میں اسی ڈپارٹمنٹ کی سابق لائبریرین رابعہ آپا، نسرین آپا اور سہیل احمد کے تعاون کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

مولانا آزاد لائبریری سے استفادہ کرنے میں جن لوگوں نے میری مدد کی ان میں خاص طور سے باقر صاحب اور محسن صاحب اور کمپیوٹر کمپوزر حسیب سبطین نقوی بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔

میں جناب سید فرخ علی جلالی صاحب کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتی ہوں۔جنھوں نے مقالے کے لیے میٹرئل مہیا کرانے میں میری مدد کی اور کچھ کتابیں اپنے پاس سے بھی فراہم کرائیں۔

میں اپنے والدین محمد سلیمان صدیقی اور خالدہ بانو کی خواہش اور دعاؤں کی وجہ سے اپنی ادھوری تعلیم کو مکمل کر رہی ہوں خدا کا شکر ہے کہ آج میں نے ان کا یہ خواب پورا کیا۔

مجھے ریسرچ کے دوران کئی بار دہلی جانا پڑا جس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی لائبریری اور انجمن ترقی اردو ہند دہلی میں مطالعہ کرنے کا موقع ملا اس دوران جن لوگوں نے میری مدد اور حوصلہ افزائی کی ان میں خاص طور سے پروفیسر بدرالدین الحافظ، راشدہ بانو، حنا، عمید، فوزیہ، سلیمان، صفیہ، الطاف، سعدیہ، سعید، شبینہ، کامران شامل ہیں۔

کوئی بھی خاتون شادی کے بعد بھی پڑھائی کو جاری رکھنے میں کن کن دقتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرتی ہے یہ احساس مجھے بخوبی ہے۔ لیکن میں وہ خوش نصیب ہوں جس کو سید انظار احمد صابری جیسا شریک سفر ملا۔ جنھوں نے میرا قدم قدم پر ساتھ دیا۔ میرے اندر خود اعتمادی پیدا کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کا میرا خواب شرمندہ تعبیر کیا میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن سے میں اپنے ہم سفر صابری صاحب کا شکریہ ادا کرسکوں میرے گھر میں میرا ساتھ گھر کے ہر فرد نے دیا یہاں تک کہ ملنے جلنے والوں نے بھی دیا۔

میں شکرگذار ہوں نوشابہ انوار صابری، محمد سلمان صاحب، ایس۔ایم۔ یامین صاحب، عاقل قریشی صاحب، خواجہ متین صاحب، ڈاکٹر بدرالحسن صاحب، محمد حضور صاحب، پروفیسر شباحت صاحب، ڈاکٹر عارف علی خاں، ثنا اللہ سالار صاحب، بی۔ایس کمتھانیہ صاحب، منصور حسین رضوی صاحب اور شکیل احمد خاں صاحب کی۔ میں شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں اپنے گھر کے بچوں کا جنھوں نے میرے پڑھنے کے اوقات میں سنجیدگی سے کام لیا۔ شرارتیں تو کیں مگر چپکے چپکے اور اس طرح میرے مطالعہ میں مخل نہ ہوئے اس معصوم سی فہرست میں ادعیہ، رقیہ، سمیرا، یوسف، عمران، کامران، فرقان، نبیل، علی احمد، عمر بشار، عکرمہ، حسن، خدیجہ، حفصہ، رابعہ اور مریم کے نام شامل ہیں۔

میں شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں ان ہستیوں کا جو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ میرے شوہر کے والدین مرحوم سید انوار احمد صابری، مرحومہ امینہ بیگم میری دادی مرحومہ سیدہ بیگم مولانا مظفر الدین اور میرے شوہر کے بڑے بھائی سید انتظار احمد صابری یہ لوگ دل میں حسرت لے کر چلے گئے۔

زمیں کھا گئی آسمان کیسے کیسے   خدا ان لوگوں کو جنت الفردوس میں جگہ دے ''آمین''

بعض اسباب اور مسائل کی وجہ سے مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے کام متعینہ وقت میں مکمل نہ کرسکی تھی۔ وہ تو خدا بھلا کرے موجودہ شیخ الجامعہ پروفیسر پی۔ کے۔ عبدلعزیز کا جنہوں نے اپنی مخصوص کرم فرمائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسے تمام ریسرچ اسکالرز کو اکیڈمک کونسل سے یہ اجازت دلوائی کہ ایک سال کی مدت میں ہم سب لوگ اپنے اپنے کام مکمل کر کے جمع کرادیں۔ میں اس عنایت کے لئے عالی جناب شیخ الجامعہ کی بہ قدر خاص ممنون ہوں۔

سعدیہ سلیمان

باب دوم

(تحقیق وتدوین)

تاریخ ادب اردو قدیم دور آغاز سے ۱۷۵۰ء تک

جلد اوّل

تاریخ نگاری ایک مشکل ترین فریضہ ہے۔ مؤرّخ کا مقصد ماضی کو تلاش کرنا، اور اس زمانے کی حالات کی سچی تصویر پیش کرنا ہوتا ہے۔ مؤرّخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس عہد کے بارے میں لکھ رہا ہے۔ اس کی سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور معاشی اقدار کو اپنے سامنے رکھے، اور ان قدروں کی روشنی میں حالات کی جانچ کرے، تا کہ متعلقہ عہد کی صحیح شکل پیش کی جاسکے۔ ادبی مؤرّخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ عام زندگی کو ادب سے الگ رکھ کر نہ دیکھے، بلکہ زندگی کے مسائل کو ادب کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرے تب ہی ایک اچھی ادبی تاریخ دنیا کے سامنے لا سکے گا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اسی معیار کو برتنے کی پوری کوشش کی ہے۔ حالانکہ تاریخ نگاری میں انکے سامنے بڑی مشکلیں آئیں سب سے بڑی مشکل تو یہ تھی کہ قدیم اردو ادب کا ایک بڑا حصہ کتب خانوں میں بند ہے۔ یہ قلمی نسخوں کی شکل میں محفوظ ہے جو شائع نہیں ہوا ہے۔ اور کسی ایک جگہ پر بھی نہیں ہے۔ مختلف شہروں اور ملکوں میں محفوظ ہے، جس کو حاصل کرنا آسان نہیں تھا۔ قدیم ادب کا جو حصہ شائع ہوا وہ بھی اعتماد کے قابل نہیں ہے۔ کیونکہ مرتبین نے کچھ بے احتیاطی سے متن تیار کیا ہے۔

ایسے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے یہ حل نکالا کہ مخطوطات کا براہِ راست مطالعہ کیا جائے۔ اس کے لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ مخطوطہ لکھنے والے بھی کبھی کبھی اس میں لفظی تبدیلیاں کر دیتے ہیں جو معنی بدل دیتی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کا بہت خیال رکھا ہے۔ جبکہ آج کے زمانے میں ایسا کرنا بڑا مشکل ہو گیا ہے۔

> بقول مشفق خواجہ کہ ''ہمارے ادبی مؤرّخوں نے کبھی ان مشکلات درخورِ اعتنا نہیں سمجھا کچھ تو اس وجہ سے کہ انھوں نے ادب کے براہِ راست مطالع کی زحمت ہی گوارا نہیں کی اور کچھ اس وجہ سے کہ ادبی ذخیرہ ان کی دسترس سے باہر

تھا اس بنا پر اردو ادب کی تاریخوں میں نقل در نقل کی روایت پا گئی۔''[1]

اردو زبان و ادب کی کئی تاریخیں لکھی گئیں، جن میں آزاد کی ''آب حیات'' اور رام بابو سکینہ کی ''تاریخ ادب اردو'' قابلِ ذکر ہیں۔ اسکے علاوہ ''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' کے نام سے ایک تاریخ سامنے آئی جو مجموعی طور پر لکھی گئی تھی۔ مگر اس کی پہلی جلد کے بازار میں آتے ہی اس کی اشاعت روک دی گئی۔ اور سارے نسخے بازار سے واپس منگوا لئے گئے۔

ان سب کے مقابلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخِ ادب اردو'' بہت معتبر ہے۔ اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ فردِ واحد کا کارنامہ ہے۔ جس کو بڑی محنت سے انجام دیا گیا ہے۔ اس کتاب کے سلسلے میں رشید صاحب کا قول کافی مناسب ہے۔

''جمیل جالبی صاحب کی یہ تاریخ فردِ واحد کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اور یہ بات کہی جا سکتی ہے۔ کہ یہ انفرادی کوشش اس پنچایتی پیوندکاری سے اس لحاظ سے بہتر ہے کہ یہ مختلف مضامین کا مجموعہ نہیں معلوم ہوتی۔''[2]

اس میں اگر ہمیں کچھ کمی محسوس بھی ہو تو اس کو نظر انداز کرنا بہتر ہوگا، کیونکہ ایک فرد اس سے زیادہ کیا محنت کرتا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کو ''تاریخ ادب اردو'' لکھنے کا خیال ۱۹۶۰ء کی دہائی کے ابتدائی زمانے میں آیا ان کا خیال ہے، کہ اردو ادب کی ایسی کوئی تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی۔ جس میں اسکی روح کی گہرائیوں تک پہونچا گیا ہو۔ اس لئے انھوں نے نئے سرے سے اردو زبان کے شعر و ادب کا مطالعہ کیا اور اس میں اتنے ڈوب گئے کہ ایک مستند تاریخ لے کر سامنے آئے۔ ایک انٹرویو میں انھوں نے بتایا۔

''میری خواہش تھی کہ اردو ادب کی ایک تاریخ لکھی جائے، جو پرانے سانچوں کو توڑ کر ادبی تاریخ نویسی کا ایک ڈھانچہ فراہم کرے۔ اس میں حالات و واقعات صحیح اور درست ہوں جو تحقیقی نقطۂ نظر سے سارے مواد کو کھنگال کر واقعات کے سروں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہو اور جس میں ادبی شخصیات کے

---

[1] مشفق خواجہ مضمون اردو ادب کی پہلی تاریخ مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ، موئف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۱۹۹۳ء ص ۲۹۵

[2] ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ مصنف رشید حسن ۱۹۷۸ء ص ۲۹۰

تخلیقی کاموں کو جدید انداز تنقید سے مطالعہ کیا گیا ہو۔''[۱]

انھوں نے اپنی خواہش کو پورا کرنے کی بھر پور کوشش کی ہے۔ تاریخ نگاری کے سلسلے میں پروفیسر سید وقار عظیم اپنے مضمون ''جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو'' میں لکھتے ہیں۔

> ''یہ 'تاریخ ادب اردو' جدید انداز کی مربوط تاریخ ہے۔ متفرق مقالات کا مجموعہ (جیسا کہ نمایاں طور پر پنجاب یونیورسٹی کی تاریخِ ادبیات) یا تذکرہ (جیسا کہ آبِ حیات) ہرگز نہیں یہ تاریخ ایک خاص منصوبے اور مخصوص مقصد اور جذبے کے تحت لکھی گئی ہے اور بہت سی ایسی خصوصیات کی حامل ہے۔ جنھیں صرف اسی کا منفرد امتیاز کہنا چاہئے۔''[۲]

مندرجہ بالا تحریر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے ارادوں کو تکمیل تک پہونچایا ہے۔ ''تاریخ ادب اردو'' صحیح معنوں میں تاریخ نگاری سے تعلق رکھتی ہے۔

''تاریخ ادب اردو'' لکھنے کی ابتدا ۶۵-۱۹۶۴ء میں ہوئی تھی اس کی دو جلدیں ہمارے سامنے آئیں ہیں پہلی جلد ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی اس میں ۷۱۲ صفحات پر اردو زبان و ادب کے آغاز سے لے کر ولی گجراتی اور ان کے معاصرین کے عہد تک کی داستان قلمبند کی گئی ہے۔

اس میں سب سے پہلے پیش لفظ ہے جس میں اس جلد کا خاکہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد تمہید اور اردو ادب کی تاریخ ہے بعد میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔ کتاب میں ہر زمانے کو ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کتاب چھ فصلوں میں منقسم ہے ہر فصل میں مختلف ابواب ہیں۔ سب ہی فصلوں کے پہلے باب میں اس زمانے کی تہذیبی، معاشرتی، ادبی اور لسانی خصوصیات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس دور کے شعراء اور ادیبوں کی تخلیقات پر تنقید کی گئی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے اردو زبان کی نشو و نما کے بارے میں یہ بیان کیا ہے۔ کہ وہ کس عہد میں اور کیسے اتار چڑھاؤ سے گزر کر اپنی منزل کے لئے گامزن رہی۔ اس میں انھوں نے ادبی روایت کی مختلف کڑیوں کو اس طرح آپس میں جوڑ دیا کہ وہ مختلف خطوں میں بٹی ہوئی نظر نہیں آتی۔ اردو ایک ایسی زبان ہے، جو ہندو پاک میں ہر جگہ بولی جاتی ہے۔ یہ ایک وقت میں کئی خطوں میں

---

[۱] ارمغان سہ ماہی کراچی جمیل جالبی نمبر شمارہ ۱۳ اپریل مئی جون ۱۹۹۶ء ص ۱۱۸

[۲] ارمغان سہ ماہی کراچی جمیل جالبی نمبر شمارہ ۱۳ اپریل مئی جون ۱۹۹۶ء ص ۷۷

پروان چڑھی ہے۔ضرورت کے پیشِ نظر لوگوں نے اس کو اپنایا اور اپنانے کے عمل نے اردو کو فائدہ پہونچایا اسکی نشو ونما میں بڑی ترقی ہوئی۔

''تاریخ ادب اردو'' کو جدید طریقے کی مربوط تاریخ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس میں اردو زبان وادب پر ترتیب زمانہ کے ساتھ بڑی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ جو بات سب سے زیادہ متوجہ کرتی ہے۔ وہ یہ کہ ہندوی روایت کیسے فارسی روایت میں سرایت کرگئی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بڑے دلچسپ انداز میں اس تبدیلیٔ روایت کو بیان کیا ہے۔ اردو زبان نے ان دونوں روایات کو اپنے اندر جذب کیا ہے۔شروع میں ہندوی روایت کا اثر نظر آتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ فارسی روایت کا اثر اردو زبان پر غالب آنے لگا۔ آخر میں ایک ایسی عبارت سامنے آئی جو فارسی اور ہندوی روایتوں سے مل کر بنی جسے ''ریختہ'' نام دیا گیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''تاریخ ادب اردو'' کی جلد اوّل کی تمہید میں اردو زبان کے پھیلنے کے اسباب بیان کئے ہیں۔کب اور کیسے یہ پورے برصغیر میں پھیلی اور کس طرح ہر قوم کے لوگوں نے اس کو اپنایا۔

فصل اوّل

پہلی فصل میں تین ابواب ہیں۔ پہلے باب میں مسعود سعد سلمان سے گرونانک تک کے تاریخی واقعات اور زبان سے متعلق حالات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ باب ۱۰۵۰ء سے ۱۵۲۵ء تک کا احاطہ کرتا ہے۔ اس زمانے میں صوفی سنتوں نے اردو زبان کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اس میں کبیر، گرونانک اور امیر خسرو شامل ہیں۔ اہل علم نے شروع میں اردو زبان پر توجہ نہیں دی تھی۔ صوفیوں میں امیر خسرو کا نام قابلِ ذکر ہے حالانکہ وہ بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے۔لیکن انھوں نے اردو زبان میں بھی شاعری کی۔ انکے کلام میں زمانے کے ساتھ ساتھ اتنی تبدیلیاں ہوئیں کہ کچھ محققوں نے انکی تصانیف ماننے سے انکار کردیا، مثلاً ''خالق باری'' کے سلسلے میں یہ شبہ ہے کہ وہ امیر خسرو کی تصنیف نہیں، جبکہ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں

> ''خالق باری'' بھی انہیں کی تصنیف ہے۔ جس میں صدیوں کی دھوپ چھاؤں نے اضافوں اور ملحقات سے اس کی شکل بدل کر رکھ دی اور آج محمود شیرانی جیسے فاضلِ اجل کو یہ شبہ ہوا کہ یہ امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے۔''[1]

---

[1] تاریخ ادب اردو جلد اول ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۷ء ص ۲۸

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس سلسلے میں ''سب رس'' تذکرہ نکات الشعراء'' اور آبِ حیات کا بھی حوالہ دیا ہے۔ مثال کے لیئے امیر خسرو کا ریختہ اور دوہا ''تاریخ ادب اردو'' میں تحریر کیا گیا ہے۔ جن سے ''خالق باری'' شک کے دائرے سے باہر نکل آتی ہے۔ لیکن دوسری طرف جب ہم حامد حسن قادری کی کتاب ''داستان تاریخ اردو'' میں انکو پڑھتے ہیں تو خود کو شک اور یقین کے درمیان میں کھڑا پاتے ہیں حامد حسن قادری صاحب لکھتے ہیں۔

''یہی حال امیر خسرو کی مشہور تصنیف ''خالق باری'' کا ہے کہ اس کے لئے بھی کوئی معتبر شہادت تاریخی نہیں ہے۔ لیکن اس کا ان کی تصنیف ہونا تعجب نہیں ہے۔''[۱]

دوسرا باب ۱۵۲۵ء سے ۱۶۵۷ء بابر سے شاہجہاں تک کا زمانہ ہے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اردو نے ادبی دنیا میں اپنے قدم جمانے شروع کر دیئے تھے۔ بذاتِ خود بابر اردو زبان سے واقفیت رکھتا تھا۔ اس باب میں کچھ تصانیف کا بھی ذکر آتا ہے، جن میں حکیم یوسفی کا ایک ''قصیدہ درلغاتِ ہندی'' اس میں مختلف اشیاء اور دواؤں کے فارسی ناموں کے اردو مترادفات قلم بند ہیں، اجے چند بھٹناگر پسر دنی چند نے ایک منظوم رسالہ ''خالق باری'' کے طرز پر تصنیف کیا اس میں فارسی الفاظ کے اردو مترادفات بیان کئے ہیں۔ اس کتاب کا نام معلوم نہ ہونے کی وجہ مولوی عبدالحق نے اس کا نام ''مثلِ خالق باری'' رکھا تھا۔

اکبر کے زمانے میں دفتر کی زبان تو فارسی ہی تھی لیکن دربار میں ہندی کے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا اسی زمانے میں بہرام سقہ بخاری جو تر کی فارسی کا صاحبِ دیوان شاعر ہے۔ انکی شاعری میں کہیں تو پورا مصرع اردو کا ہے۔ کہیں اردو کے الفاظ آ گئے ہیں۔

جہانگیر کے زمانے میں ایک بیاض ''مجمع المضامین'' کے نام سے کوکب ولد قمر خاں نے مرتب کی تھی۔ اس میں ہندی زبان میں کئی اشعار دیئے گئے ہیں۔ اس زمانے کی سب سے مشہور تصنیف افضل پانی پتی کی ''بکٹ کہانی'' ہے اس میں جو اردو زبان استعمال ہوئی ہے۔ وہ بہت صاف اور منجھی ہوئی ہے۔

افضل کی ''بکٹ کہانی'' کے سلسلے میں مسعود حسین صاحب لکھتے ہیں۔

''بکٹ کہانی کی زبان عہد اکبری کی کھڑی بولی کا وہ روپ ہے، جو دہلی

---

[۱] داستان تاریخ اردو حامد حسن قادری ص ۱۶

اور اس کے نواح سے نکل کر برج، اودھی اور ہریانوی کے علاقوں میں پھیل چکا تھا۔ مولف ''پنجاب میں اردو'' نے لکھا ہے ''اس کی زبان دکنی سے مختلف اور صاف ہے۔'' لسانی اعتبار سے افضل کی زبان کو جدید اردو سے قریب تر ہونا بھی چاہیئے۔ مسعود حسین صاحب ''بکٹ کہانی'' کی زبان کو جدید اردو سے قریب مانتے ہیں۔ مگر آگے لکھتے ہیں'' بکٹ کہانی کی زبان پر فارسی کے علاوہ برج بھاشا کے بھی اثرات واضح ہیں۔''[۱]

جہاں مسعود صاحب نے'' بکٹ کہانی'' کا لسانی تجزیہ بڑی وضاحت کے ساتھ کیا ہے، وہیں ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی اس کا لسانی مطالعہ کرنا ضروری سمجھا۔ جس کا یہ فائدہ ہوا کہ اس زمانہ کی زبان و بیان کی تصویر سامنے آئی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ'' بکٹ کہانی'' کے زبان و بیان میں قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہاں مختلف بولیوں کے اثرات نے مل جل کر اب اپنی شکل بنالی۔ یہ شکل دکنی اردو کے معیاری ادبی روپ سے زیادہ پرکشش اور خوبصورت ہے۔ فارسی، عربی، ترکی زبانوں کے اثرات بھی ایک جان ہوکر زبان کے مزاج کا حصّہ بن گئے ہیں۔''[۲]

''یادگارِ شعراء'' میں افضل کا تذکرہ اس طرح دیا ہوا ہے کہ'' افضل۔ محمد افضل ساکن جھنجھانہ، جو میرٹھ سے دور نہیں ہے یہ ایک غیر متصوّف شاعر نہیں تھے، اور زیادہ تعلیم یافتہ بھی نہیں تھے۔ قائم نے لکھا کہ یہ عبداللہ قطب شاہ سے پہلے گذرے ہیں، جو ۱۰۲۰ھ میں تخت نشین ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک نظم لکھی ہے جس کا نام ''بکٹ کہانی'' ہے۔ اس کا ایک نسخہ لندن کے انڈیا ہاؤس میں موجود ہے۔''[۳]

اسپرنگر کے تذکرے سے'' بکٹ کہانی'' کی زبان و بیان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوتا فقط اتنا ہی علم ہوتا ہے کہ افضل نامی شاعر نے'' بکٹ کہانی'' لکھی تھی۔

---

[۱] مقدمہ تاریخ زبان اردو، مسعود حسین خاں ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۰ء ص ۹۱-۹۲

[۲] تاریخ ادب اردو جلد اول ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۷ء ص ۶۹

[۳] یادگار شعراء، اسپرنگر مترجمہ طفیل احمد اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۵ء ص ۲۶-۲۷

فصل دوم

گجری ادب اور اس کی روایت

(۱۰۵۰ء -- ۱۷۰۷ء)

فصل دوم میں چار ابواب دیئے گئے ہیں۔ جن میں گجری ادب اور اس کی روایت پر بحث کی گئی ہے۔ روایت کی تاریخ اور نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ گجرات میں جو نمونے ملتے ہیں وہ صوفیائے کرام کے ملفوظات ہیں۔ اور کچھ شاعری کے نمونے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ سب سے پہلے گجرات میں اردو زبان نے ادبی سطح پر اپنی روایت بنالی تھی۔ نویں اور دسویں ہجری تک ہندوی روایت کا اثر کافی گہرا تھا۔ حالانکہ جب گجرات میں اردو روایت کی ابتداء ہوئی تو عربی فارسی اور سنسکرت کی روایت تھی۔ لیکن گجری اردو نے ان سب زبانوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اسی باب میں نورالدین محمد عرف ست گرو کے ''ست پنتھی'' رسائل کا بھی ذکر ہے۔ اسی میں ہندو ویدا اور یوگ کو اسلامی تصوّف کے رنگ میں بھجنوں اور گیان کے روپ میں مرتب کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں اولیائے کرام کے فقرے ملفوظات اور لغات کے حوالے دے کر اس زمانے کی ادبی روایت کا تعارف کرایا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان فقروں اور ملفوظات کو تذکروں اور تاریخ میں سے تلاش کیا ہے، ان سے ہندوی زبان کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔

یہاں جن صوفیائے کرام کے نام پیش کئے گئے ہیں وہ اس طرح ہیں۔ سید برہان الدین ابو محمد عبداللہ قطب عالم، شاہ عالم عرف شاہ منجھن ، سلطان محمد دبسگرہ۔

سلطان قطب الدین اور سلطان سکندر وغیرہ ہیں۔ ان کے فقرے اور ملفوظات نمونے کے طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ زبان میں علاقائی اثرات شامل ہورہے ہیں جس نے اس زبان کو استعمال کیا اپنے مادری رنگ کو اس میں شامل کرلیا اور جن فقروں میں دوسری زبانوں کے الفاظ ملا کر بولے جانے لگے ان کو ہندی زبان سمجھا گیا۔ نویں اور دسویں صدی ہجری میں اس زبان میں مسجدوں اور مزاروں پر کتبے لگائے جانے لگے۔ ان کے بعد شاہ وجیہالدین علوی کا نام سامنے آتا ہے انکے فقروں اور ملفوظات کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انکی زبان پہلے کے مقابلے میں زیادہ صاف ہے۔

گجرات میں شاہ وجیہ الدین کے کئی شاگرد و مرید تھے ''بحرالحقائق'' کے نام سے ایک مجموعہ ہے جو ان کے مریدوں نے مرتب کیا تھا۔ اس میں سوال ہیں جو فارسی میں ہیں اور جواب اردو میں ہیں، جو شاہ وجیہہ الدین نے دیئے ہیں شاہ صاحب کی زبان پر دکنی اردو کا بہت اثر تھا اسی لئے زبان صاف اور منجھی ہوئی ہے۔

دوسرے باب میں ''بحرالفضائل'' نام کی لغت کا ذکر ہے۔ جو تقریباً ۸۳۷ھ میں تصنیف ہوئی اسی لغت کے مصنف فضل الدین بلخی ہیں۔ یہ عربی فارسی کی لغت ہے۔ لیکن ''باب چہاردہم'' کی وجہ سے اسکی اہمیت ہے اس میں ہندی الفاظ کو جمع کیا گیا ہے جو فارسی شاعری میں استعمال میں لائے جاسکتے ہیں۔ مصنف نے لغت ترتیب دیتے وقت ہندوی علوم وفنون، اصلاحات اور کچھ چیزوں کے رائج کردہ ناموں کو اپنے ذہن میں رکھا ہے۔

تیسرے باب میں اس دور کے ممتاز شاعروں اور ادیبوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں شیخ بہاالدین باجن کا نام پہلا ہے۔ ''خزائنِ رحمت اللہ'' انکی مشہور کتاب ہے۔ اس کا ایک باب ''خزینہ ہفتم'' کے نام سے ہے۔ جس میں شیخ باجن نے صوفیائے سلف کے کلمات کے علاوہ اپنے پیرو مرشد کے اقوال و ملفوظات جمع کئے ہیں۔ اپنے اشعار، جکریاں اور دوہرے بھی شامل کئے ہیں۔ کتاب تو فارسی میں ہے۔ مگر جگہ جگہ اپنا اردو کا کلام بھی پیش کیا گیا ہے۔

شیخ باجن تصوّف اور اردو شاعری میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ انھوں نے فارسی اور ہندوی زبان میں شاعری کی ہے وہ شیخ رحمت اللہ کے مرید تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے شیخ علی المتقی اور شیخ عزیز اللہ متوکّل کا ذکر نہیں کیا ہے۔ جبکہ ''اردوئے قدیم'' میں شمس اللہ قادری شیخ بہاالدین باجن کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''مشاہیر اولیا سے ہیں ۷۹۰ھ میں پیدا ہوئے مشہور محدّث شیخ علی المتقی کے مرشد اور شیخ عزیز اللہ متوکل کے مرید تھے۔ عرب وایران کی سیاحت سے واپس آکر اپنے پیر کے فرزند شیخ رحمتہ اللہ متوکل کے ہاتھ پر بیعت کی۔''[1]

اس باب کے دوسرے شاعر قاضی محمود دریائی ہیں۔ یہ گجرات کے خواجہ خضر کہلائے ان سے بہت سی کرامات بھی منسوب کی جاتی ہیں قاضی صاحب نے ہندوی روایت کو قائم رکھا۔ انکے کلام میں

---

[1] اردوئے قدیم شمس اللہ قادری ص ۴۶

ہندوی اثر پوری طرح سمایا ہوا ہے۔ گجرات میں اردو شاعری کا رواج کس قدر عام ہو گیا تھا۔ اس کا اندازہ قاضی صاحب کے کلام سے با آسانی ہو جاتا ہے انکے کلام کے لہجے، اسلوب، ترنم، اوزان و بحور پر ہندوی روایت کا پورا اثر ہے۔

اس روایت کو آگے بڑھانے میں شاہ علی محمد جیو گام دھنی کا نام بھی سامنے آتا ہے۔ انھوں نے ہندوی روایت کو نقطۂ عروج تک پہونچایا۔ گام دھنی کے کلام کو ابوالحسن ابن عبدالرحمٰن قریشی الاحمدی نے ترتیب دیا اور اس کا نام ''جواہر اسرار اللہ'' رکھا اور دوبارہ انکے دیوان کو انکے پوتے سید ابراہیم ابن شاہ مصطفیٰ نے مرتب کیا جبکہ سید شمس اللہ قادری نے جیو گام دھنی کے بارے میں کچھ مختلف تحریر کیا ہے۔

بقول انکے'' آپ کے پوتے سید شاہ البراہیم بن سید شاہ مصطفیٰ بن سید شاہ علی حسینی نے اسے بصورت دیوان مرتب کیا اور اس کا نام ''جواہر اسرار آلہ'' رکھا۔[۱]

انکے کلام میں ہندوی روایت ایک نئے رنگ میں سامنے آتی ہے۔ ہندوی کے ساتھ فارسی روایت کا رنگ بھی شامل ہو گیا ہے۔ لیکن یہ فارسی رنگ کھل کر سامنے نہیں آیا ہے، بلکہ کہیں کہیں ہلکا سا محسوس ہوتا ہے۔ کچھ مصرعوں میں فارسی زبان استعمال کی ہے۔ فارسی بحر کا استعمال کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے ہندوی روایت کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔ اس نئے رنگ کو شیخ خوب محمد چشتی نے اس طرح اپنایا کہ وہ فارسی روایت کے علم بردار کہلائے۔ گجرات کے اکابر صوفیاء میں انکا شمار ہوتا ہے ''خوب ترنگ'' انکی مشہور اردو مثنوی ہے۔ اس میں بڑی باریکی کے ساتھ تصوّف اور اخلاق کے عالمانہ نکات پیش کئے گئے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ اسکا موضوع بہت مشکل ہے پھر بھی خوب محمد نے اس کو عام زبان یعنی گجراتی بولی میں تحریر کیا ہے۔

خوب محمد نے ''خوب ترنگ'' کی شرح فارسی میں ''امواجِ خوبی'' کے نام سے کی ہے اس میں زبان کے سلسلے میں ''عذر خواہی'' کے عنوان سے کچھ دلچسپ باتیں لکھی ہیں یہ باتیں فارسی زبان میں ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے اس کے معنی کچھ اس طرح لکھے ہیں۔

''اس بیان کے معنی یہ ہیں کہ شیخ خوب محمد چشتی نے گجراتی زبان استعمال کی ہے۔ اور صرف اظہارِ مدعا کے لئے عربی و فارسی الفاظ کا سہارا لیا ہے۔ اگر

---

[۱] اردوئے قدیم شمس اللہ قادری ص ۴۷

عربی و فارسی الفاظ کو چھوڑ کر زبان کا تجزیہ کیا جائے تو یہ وہی زبان ہے جسے آج
ہم اردو کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ جو اس وقت خصوصاً مسلمانانِ گجرات کی
عام ادبی اظہار کی واحد زبان تھی۔"[1]

خوب ترنگ جس وقت لکھی گئی گجرات کی تہذیب تبدیل ہوگئی تھی معاشرے میں اتنی برائی پیدا ہوگئی تھی کہ گجراتی قدریں مغلوب ہو کر رہ گئیں۔ جو عشق ولولہ، سوز و ساز وغیرہ جواہر اسرار اللہ اور خزائنِ رحمت میں نظر آتا ہے، وہ خوب ترنگ میں نظر نہیں آتا خوب محمد تصوّف اور علمی بحثیں زیادہ کرتے ہیں۔ اصطلاحات کی بھی کثرت نظر آتی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے پیر و مرشد شیخ کمال محمد سیتانی کے اقوال نظم کئے جو تصوّف میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اسکے علاوہ شیخ چلی کی حکایات بھی بیان کی گئی ہیں۔ اس میں تصوّف کی باریکیاں سمجھائی ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے چوتھے باب میں دسویں، گیاھویں اور بارھویں صدی کی گجری اردو روایت کے بارے میں لکھا ہے۔ اکبر کے گجرات فتح کرنے کے بعد یہاں کے تہذیبی اور سیاسی حالات بہت تبدیل ہو گئے تھے۔ اردو ادب سائبان سے محروم ہونے لگا۔ دوسری طرف دکن میں اردو ادب کی قدر و منزلت بڑھ گئی تھی۔ اس لئے گجرات کے اہلِ علم و ادب نے دکن کی طرف کوچ کرنے کا فیصلہ کیا، جن لوگوں نے ہجرت کی ان میں شیخ احمد گجراتی کا نام پہلا ہے، جن کی دو مثنویاں ''یوسف زلیخا''، لیلیٰ مجنوں بہت مشہور ہوئیں انکے علاوہ سید محمد مہدی اور میاں مصطفیٰ کا ذکر آتا ہے۔ دسویں صدی میں میاں مصطفیٰ کے پورے خاندان نے گجرات کو خیر باد کیا۔ انھوں نے فارسی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی ریختہ لکھا ہے۔

گیارہویں صدی میں اورنگ زیب کا زمانہ آتا ہے اس وقت اردو زبان بہت صاف ہوگئی تھی۔ اورنگ زیب کے دکن کے فتح کرنے کے بعد جنوب اور شمال کا ملاپ ہو جاتا ہے۔ اور اسکے ساتھ ''ریختہ'' کے نام سے اردو زبان کا نیا معیار سامنے آتا ہے۔ اس معیار کو سب نے ہی دل سے قبول کیا۔

اس نئے معیار کو اپنانے والوں میں امین گجراتی کا نام سامنے آتا ہے انکی شاعری ریختہ کے قریب نظر آتی ہے۔ امین اورنگ زیب کے آخری دور کے شاعر ہیں۔ انکی مثنوی ''یوسف زلیخا'' ہے

---

[1] تاریخ ادب اردو جلد اول ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۷ء ص ۱۲۰

جس میں ۴۳ عنوانات ۴۱۱۴ اشعار شامل ہیں۔ یہ مثنوی گوجری زبان میں لکھی گئی ہے۔ گوجری وَلی دکنی کی ریختہ سے بہت مشابہت رکھتی ہے امین نے مثنوی میں جو ہیئت استعمال کی ہے جو فارسی مثنویوں میں نظر آتی ہے، کیونکہ یہ وہ دور تھا جب اردو زبان اپنی اصنافِ سخن، اوزان و بحور، زبان و بیان کے اسالیب، ضمیات و رمزیات فارسی زبان کے ادب سے فراہم کر رہا تھا۔ اسی زمانے میں فارسی سے اردو میں ترجمے کئے جارہے تھے۔ امین گجراتی نے بھی اس رنگ کو اپنایا اور فارسی ''یوسف زلیخا'' کا گوجری زبان میں ترجمہ کیا۔

انکی دوسری مثنوی تولّد نامہ ہے یہ ڈھائی ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں آنحضرتؐ کی مکمل زندگی کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ گجری روایت موضوع کے اعتبار سے مذہبی ہے یہی رنگ ''یوسف زلیخا'' میں بھی پیش کیا ہے۔ اس زمانے میں اردو زبان کی بڑی ترقی ہوئی۔ گجرات، دکن اور شمال کی زبان و بیان اور اسالیب میں کوئی فرق نہیں تھا، بلکہ سب پر فارسی زبان کا اثر کافی گہرا تھا۔ علاقائی فرق مٹ رہا تھا۔

فصل سوم

اردو بہمنی دور میں

(۷۵۰ھ - ۹۳۲ھ/ ۱۳۵۰ء - ۱۵۲۵ء)

پہلا باب پسِ منظر، ماخذ اور خصوصیات

(۱۳۵۰ء - ۱۵۲۵ء)

فصل سوم میں دو باب پیش کئے گئے ہیں۔ پہلے باب میں جمیل جالبی نے یہ بتایا ہے، کہ دکن میں اردو کن اسباب کے تحت پروان چڑھی۔ اس کے تین سبب بتائے ہیں۔

پہلی وجہ تو یہ تھی کہ دکن میں کئی زبانیں بولی جاتی تھیں مثلاً تلنگی، کنڑی اور مرہٹی وغیرہ مگر مشترک زبان کوئی نہیں تھی۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ دکن میں سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی حالات بہت خراب تھے۔ اتحاد کی بڑی کمی تھی۔ جب مسلمان یہاں آئے تو انھوں نے دکن میں اتحاد قائم کیا اور اسی کے سہارے اردو زبان بھی پرورش پانے لگی۔

تیسری وجہ یہ رہی کہ جب مسلمانوں نے دکن فتح کیا تو یہاں تعصب اور نفرت ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے ایک نیا نظام قائم کیا اور آپس میں میل جول پیدا کیا اس کے لئے اردو زبان کی ضرورت پیش آئی اتحاد قائم کرنے میں اردو زبان نے بہت بڑا رول ادا کیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے دکن کے ان بزرگانِ دین کا ذکر کیا ہے۔ جو علاء الدین خلجی کے دکن فتح کرنے سے پہلے وہاں اپنے دینی کام میں مشغول تھے۔ فتح کے بعد بھی اس سلسلے کو آگے بڑھاتے رہے۔ ان صوفیائے کرام کے اقوال سے ہم دکنی اردو کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔

دوسرا باب

ادب کی روایت نویں اور دسویں صدی ہجری کے اوائل میں

(نظامی سے اشرف تک)

(۱۴۳۰ء - ۱۵۲۵ء)

بہمنی دور میں جن موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ وہ منظوم قصوں پر مشتمل ہیں۔ انکا مطالعہ کرنے سے نصیحت، مذہبی جذبات کی قدر و قیمت اور اخلاق و تصوف سے دل و دماغ کو سکون میسر ہوتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس دور کی مختلف تصانیف پر بحث کی ہے۔ ابتداء میں خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی ''معراج العاشقین'' پر بحث کی ہے۔ ڈاکٹر جالبی اس تصنیف کا مصنف مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری کو مانتے ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر حفیظ قتیل کی کتاب ''معراج العاشقین کا مصنف'' کا حوالہ دیا ہے، مگر تفصیل سے کچھ نہیں لکھا ہے۔ جبکہ شمس اللہ قادری کی کتاب ''اردوئے قدیم'' میں خواجہ بندہ نوازؒ کی جن تصنیفات کا ذکر ہے۔ ان میں معراج العاشقین بھی شامل ہے۔

> قادری صاحب لکھتے ہیں کہ ''خواجہ صاحب نمازِ ظہر کے بعد طلبہ اور مریدوں کو علم تصوّف اور حدیث و سلوک کا درس دیا کرتے تھے۔ گاہے گاہے درس میں کلام اور فقہہ کی کتابیں بھی پڑھائی جاتی تھیں جو لوگ عربی اور فارسی سے ناواقف تھے۔ انکو سمجھانے کے لئے آپ دکنی میں تقریر فرماتے تھے۔ مریدوں کی فرمائش پر آپ چھوٹے چھوٹے متعدد رسالے دکنی میں تصنیف فرماتے تھے۔ منجملہ ان کے معراج العاشقین اور ہدایت نامہ زیادہ مشہور ہیں اور عشق نامہ میں انکا کئی جگہ تذکرہ آیا ہے۔''[1]

اس کے علاوہ پروفیسر سید اعجاز حسین صاحب ''مختصر تاریخ ادب اردو'' میں حوالہ دیتے ہیں۔

> ''بندہ نواز خواجہ گیسودراز جو فیروز شاہ بہمنی کے دور میں گلبرگہ آئے ان کے تین رسالے تصوّف کے متعلق اب تک موجود ہیں۔ (۱) معراج العاشقین

---

[1] اردوئے قدیم مرتبہ حکیم سید شمس اللہ قادری مطبع منشی نول کشور واقع لکھنؤ ۱۹۲۵ء ص ۳۱

(۲) ہدایت نامہ''(۳) رسالہ بارہ زبان [1]

ان حوالوں کے باوجود ڈاکٹر جمیل جالبی نے سید شمس اللہ قادری اور سید اعجاز حسین جیسے محققوں کے مقابلے میں ڈاکٹر حفیظ قتیل کی رائے کو معتبر سمجھا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے فخر دین نظامی کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' پر تفصیلی بحث کی ہے۔ یہ اس دور کی پہلی تصنیف ہے۔ اصل نام معلوم نہ ہونے کی وجہ سے مثنوی کے مرکزی کرداروں پر نام رکھا گیا ہے۔ آخر کے کئی صفحات بھی غائب ہیں۔

اس مثنوی کی زبان کے سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ سنسکرت، پراکرت اور علاقائی زبانوں کا اس پر کافی گہرا اثر ہے۔ لسانی خصوصیات کے اعتبار سے یہ بولی گجرات سے مشابہت رکھتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''کدم راؤ پدم راؤ'' میں دو اسلوب ملتے ہیں۔ ایک وہ ہے، جس پر ''ہندوی روایت'' کا گہرا اثر ہے اور جو مزاج کے اعتبار سے گجرات کے شاہ باجن جو اسی دور میں دادِ سخن دے رہے ہیں۔ اور قاضی محمود دریائی جیو گام دھنی سے قریب ہے۔ اور جس اسلوب میں آنے والے دور میں ابراہیم عادل شاہ ثانی اپنی ''کتاب نورس'' لکھتا ہے۔ دوسرا اسلوب وہ ہے۔ جس پر وہ اثر جاری وساری ہے جو بعد کے دور میں عبدل کے ''ابراہیم نامہ'' یا صنعتی کے ''قصہ بے نظیر'' میں نظر آتا ہے۔'' [2]

ڈاکٹر جمیل جالبی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کو ساڑھے پانچ سو سال سے زیادہ پرانی تصنیف مانتے ہیں۔ اور انھوں نے اس مثنوی کے کافی اشعار اور مختلف الفاظ پیش کئے ہیں۔

---

[1] مختصر تاریخ ادب اردو، سید اعجاز حسین اردو کتاب گھر دہلی ۶ ص ۲۰

[2] تاریخ ادب اردو جلد اول ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۷ء ص ۱۶۲۔۱۶۳

(م - ۹۰۲ھ / ۱۴۹۶ء)

اس دور کے دوسرے شاعر میرانجی شمس العشاق ہیں۔ انکی شاعری میں تصوف کا دخل ہے، کیونکہ میرانجی شاہ کمال الدین بیابانی کے خلیفہ تھے۔ جو جمال الدین مغربی کے واسطے سے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے سلسلے میں آتے تھے۔ انکی چار نظمیں سامنے آئی ہیں۔ خوش نامہ، خوش نغز، شہادت التحقیق اور مغز مرغوب ہیں ''خوش نامہ'' میں وزن ہندوی ہے۔ یہ ایک سوستر اشعار پر مشتمل ہے۔ ''خوش نغز'' میں بہتر اشعار اور نو ابواب ہیں۔ ''شہادت التحقیق'' میں ۵۶۳ اشعار شامل ہیں یہ کافی طویل نظم ہے۔ اس کا وزن بھی ہندوی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے میرانجی کی ایک نظم ''مغز مرغوب'' کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس نظم میں آٹھ ابواب ہیں۔ انکی نظموں کا تذکرہ کرتے ہوئے ساتھ ساتھ چند اشعار کا حوالہ بھی پیش کیا ہے۔ تا کہ شاعری کو سمجھنے میں کوئی مشکل نہ پیش آئے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے شمس العشاق شاہ میراں جی کی نظموں کا تو ذکر کیا ہے مگر تعجب ہے کہ ان کی نثری تصانیف کا ذکر نہیں کیا ہے۔ جبکہ حامد حسن قادری نے ''داستان تاریخ اردو'' میں میراں جی کے بارے میں لکھا ہے۔

> ''ان کی تمام تصانیف اردو نثر یا نظم میں ہیں۔ تصانیف نثر میں سے شرح مرغوب القلوب، جل ترنگ اور گل باس قلمی موجود ہیں۔ پہلے رسالہ کا نمونہ یہ ہے۔
>
> ''خدا کہیا، تحقیق مال اور پنگڑے تمہارے دشمن ہیں چھوڑ دیو دشمناں کوں۔ اے کیا غفلت ہے تجھے اندھلا کیا موت کی یاد تھے تجھے بسرا کر۔''
>
> سب رس نام کا ایک رسالہ شاہ میراں جی نے ملا وجہی کی سب رس سے پہلے لکھا ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے۔ ''اول تجھے جو کوئی سکھلاتا ہے اسے پوچھ، توں منجھیں سکلانا سوتجھ پر نکلا ہے اس کا کام اس پر نہیں کھلیا، سوتجھ پر کیا کھلے گا۔ توں کیا سمجھ کر بھولیا ہے۔ بھوسکیگا تو ادھر ادھر کیا چار حکاتیاں۔ اس حکاتیاں سو کیا حاصل''[1]

میرانجی کے بعد سید شاں اشرف بیابانی (۸۶۴ھ - ۹۳۵ھ / ۱۴۵۹ء - ۱۵۲۸ء) کا ذکر آتا ہے۔ انکی جن تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں ''لازم المبتدی''، ''واحد باری'' اور نوسرہار

---

[1] داستان تاریخ ادب اردو حامد حسن قادری ص ۳۴

شامل ہیں۔'' قصۂ آخرالزماں'' بھی انکی ہی تصنیف بتائی گئی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے سب سے پہلے ''لازم المبتدی'' پرلکھا ہے یہ ایک طویل نظم ہے۔اس میں وہ مذہبی فرائض بیان کئے گئے ہیں جن کو عام انسان آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور روزمرّہ کے مسئلوں کو باآسانی سلجھایا جا سکتا ہے۔اس میں ۱۹۸ اشعار ہیں۔جس میں ۳۶ عنوانات ہیں نظم کی بحر ہندوی ہے۔

''واحد باری'' امیر خسرو کی'' خالق باری'' کے طرز پر ہے۔ یہ ایک منظوم لغت ہے، جو عربی، فارسی اور اردو میں ہے۔ اس میں اردو الفاظ کے عربی و فارسی کے مترادف الفاظ بیان کئے گئے ہیں۔واحد باری میں مصنّف نے عام بول چال کی بامحاورہ زبان لکھنے کی کوشش کی ہے۔اشرف بیابانی نے ''نوسرہار'' میں واقعۂ کربلا اور شہادت امام حسین کو موضوع بنایا اس میں زبان عام بول چال کی استعمال کی گئی ہے، کیونکہ مصنّف نے اس کو مجلسوں میں سنانے کے لئے لکھا تھا۔اس لئے اندازِ بیان سادہ اور پراثر ہے۔اس میں نو ابواب ہیں۔ ہر باب ایک انمول ہار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا نام نوسرہار رکھا گیا ہے۔نو باب بیس فصلوں میں منقسم ہیں ہر باب کا ایک عنوان فارسی میں ہے۔اس دور میں اردو زبان کو بہت اہمیت حاصل ہوئی یہ دکن کی ایک ایسی مشترک زبان ہے، جس کو سب نے اپنانا پسند کیا، اسی عمل سے اردو زبان کے پھیلنے میں بہت مدد ملی۔

فصل چہارم

فصل چہارم میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے عادل شاہی دور پر تبصرہ کیا ہے۔ پہلے باب کا عنوان ہے۔

''پسِ منظر، روایت اور ادبی ولسانی خصوصیات (۱۴۹۰ء - ۱۶۸۵ء)''

اس باب میں عادل شاہی زمانے کے ادب پر خاص تجزیہ کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے شروع میں عادل شاہ کی حکومت کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح وہ تخت نشین ہوا۔ وہ شعروشاعری کا بچپن سے شوق رکھتا تھا۔ علم وفضل اور اہلِ ہنر کا قدردان تھا۔ عادل شاہ خود بھی فارسی میں شعر کہتا تھا۔

اس کا بیٹا اسمٰعیل عادل شاہ بھی باذوق انسان تھا۔ اس کے علاوہ عادل شاہی دور کے تمام بادشاہ علم وادب سے بھرپور لگاؤ رکھتے تھے اس دور میں اردو زبان ارتقائی منزل کی طرف گامزن تھی۔ دفتر کے کاموں میں بھی اس زبان کا استعمال کیا جانے لگا۔

عادل شاہ کی حکومت کے وقت بیجاپور میں گجری روایت کا اثر کچھ زیادہ ہی تھا۔ بیجاپور پر گجری کا اثر اس لئے تھا، کہ گجرات بیجاپور سے بہت قریب تھا۔ دونوں جگہ کی تہذیب اور رسم ورواج آپس میں بہت ملتے تھا۔ بیجاپور کا بادشاہ بذاتِ خود تصوّف اور گجری روایت کو پسند کرتا تھا۔

گجری زبان پر سنسکرتی و ہندوی روایت کا بڑا گہرا اثر ہے۔ اس کے علاوہ فارسی اور عربی زبان کا اثر بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس بات پر کافی زور دیا ہے کہ'' گجری ادب اصل میں ہندوی روایت کی تجدید ہے۔ اور بہمنی دور کا ادب اسی روایت کی مزید تجدید وتوسیع ہے۔ لیکن آگے چل کر فارسی زبان بیجاپوری اسلوب پر حاوی ہوجاتی ہے۔ اس طرح گجری روایت دھندلی ہونے لگتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے یہ محسوس کیا ہے، کہ بیجاپوری اسلوب نے جوبھی زبان اپنائی اس کو اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی ہے تاکہ انکی اپنی تہذیب بھی قائم رہے۔ یہاں فارسی رنگ گہرا ہوتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن ہندوی رنگ بھی اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ اسی رنگ کے اثر سے بیجاپور میں فلسفۂ تصوّف پیدا ہوا۔ اس پر سب سے پہلے میرانجی نے عمل کیا وہ عرفانِ نفس کو مانتے تھے۔ لیکن شاہ جانم نے اس کو مکمل شکل دی ہے۔ اس رنگ کا اثر امین الدین اعلیٰ کی شاعری میں نظر آتا ہے۔

عادل شاہی دور میں شعر و ادب کی بڑی اہمیت تھی۔ شاعری کے خاص موضوع تصوّف و اخلاق تھے، لیکن آگے چل کر شاعری میں عشقیہ رنگ بھی نظر آنے لگا۔ اس کے علاوہ حیرت انگیز عناصر کا

استعمال زیادہ ہوگیا تھا۔اس کا اثر مقیمی کی عشقیہ مثنوی ''چندر بدن مہیار''، صنعتی کی مذہبی مثنوی ''قصہ بے نظیر'' وغیرہ میں نظر آتا ہے۔ نصرتی کی مثنوی ''گلشنِ عشق'' اور ہاشمی کی ''یوسف زلیخا'' میں عشقیہ موضوع ملتا ہے، اس کے علاوہ رزمیہ مثنوی بھی لکھی گئیں جیسے شوقی کی ''فتح نامہ نظام شاہ''، مرزا مقیم کی ''فتح نامہ بکھیری'' اور نصرتی کی ''علی نامہ'' وغیرہ عادل شاہی دور میں عبدل کے ابراہیم نامہ سے ہندوی اوزان کا استعمال کم ہونے لگا اور فارسی اوزان وبحور کا استعمال زیادہ ہوگیا۔ اس دور میں شاعری کی تقریباً سب اصناف مقبول وعام ہوئیں غزل، مثنوی، قصیدہ، ہجواور مرثیہ وغیرہ یہاں گیت اور دوہروں کا بھی رواج ہوا۔ اس دور میں نثر کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ نثر میں برہان الدین جانم کی ''کلمتہ الحقائق''، امین الدین اعلیٰ کے نثری ''رسائل گنج مخفی''، ''رسالہ وجودیہ'' اور ''کلمتہ الاسرار''۔ میراں جی خدانما کی شرح، ''شرح تمہیدات ہمدانی'' اور میراں یعقوب کی ''شمائل الاتقیا'' شامل ہیں۔

> ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ ''اس دور کی زبان میں ہمیں مختلف زبانوں کی ایک کھچڑی سی پکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جس میں مقامی زبانوں کے علاوہ کھڑی بولی، برج بھاشا، اودھی سرائیکی، پنجابی، راجھستانی، سنسکرت اور گجری وغیرہ'' کے اثرات ایک ساتھ پک رہے ہیں۔عربی، فارسی، ترکی الفاظ اس کھچڑی زبان میں ایک حلاوت پیدا کر کے اسے ایک نیا رنگ دے رہے ہیں۔''[1]

اسی لئے اردو زبان کو لشکری زبان بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں بھانت کی زبانیں شامل ہیں، طرح طرح کے الفاظ کا ہجوم ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے دوسرے باب میں گجری روایت کی توسیع اور ہندی روایت کے عروج پر بحث کی ہے۔ اس میں ان تصانیف کا ذکر ہے جن سے ہندی اور گجری روایت کا عروج ہوتا ہے۔ اس فہرست میں جگت گرو کی ''کتاب نورس''، عبدل کا ''ابراہیم نامہ''، برہان الدین جانم کی ''کلمہ الحقائق'' اور ''رسالہ وجودیہ'' کا نام ہے، اس کے علاوہ انکی نظموں کا ذکر ہے۔ جانم نے ہندوی زبان کا استعمال بہت فخریہ کیا ہے۔ انھوں نے میرانجی کی طرح ہندوی کو مجبوری میں نہیں اپنایا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے خیال میں میرانجی نے ہندی زبان میں اس لئے لکھا کیونکہ لوگ عربی اور فارسی آسانی سے سمجھ نہیں سکتے تھے۔ جانم کے زمانے میں اردو زبان نے ادب کی دنیا میں پختگی اختیار

---

[1] تاریخ ادب اردو جلد اول ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۶، ۱۹۷۷ء ص ۱۹۷

کرلی تھی، لیکن ان کے یہاں یکسانیت محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسے اسلوب و روایت کے نمائندہ ہیں۔ جو گجری کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔

جگت گرو نے ''کتابِ نورس'' میں مخصوص راگ راگنیوں کے مطابق گیت ترتیب دیئے ہیں۔ان گیتوں کی زبان کافی مشکل ہے چونکہ سنسکرتی تہذیب کا اثر بہت ہے۔ جگت گرو نے جانم کی روایت کو آگے بڑھایا لیکن ابراہیم عادل شاہ ثانی عرف جگت گرو کے زمانے میں فارسی اور دکنی زبان نے بھی عروج حاصل کیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے عبدل کی ''ابراہیم نامہ'' کے بارے میں بہت تفصیل سے لکھا ہے۔انھوں نے اس مثنوی کی ہیت، بحر اور اس کے عنوانات کو کافی اچھی طرح سے پیش کیا ہے۔''ابراہیم نامہ'' سے عبدل کے شاعرانہ مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔وہ تخیل سے ایوانِ شاعری سجانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ مثنوی میں عربی، ایرانی تلمیحات، ضمیات اور اشارات کا بڑی خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں۔

عبدل نے جو اندازِ بیان استعمال کیا ہے وہ بیجاپور کا خاص ادبی اسلوب ہے لیکن اس میں ایک منفرد بات یہ ہے کہ اس کا آہنگ اور لہجہ اب ہندوی نہیں رہا۔ اس کو فارسی اسلوب اور آہنگ نے متاثر کیا ہے اشعار میں اس رنگ سے نکھار پیدا ہو گیا ہے۔

اسی زمانے کے، ایک شاعر خواجہ محمد دہدار فانی بھی ہیں۔ یہ بنیادی طور پر فارسی کے شاعر ہیں۔مگر زمانے کی روایت کو قائم رکھنے کے لئے انھوں نے اردو زبان میں بھی شاعری کی ہے۔انکا اسلوب بیجاپوری اسلوب سے بالکل مختلف ہے انھوں نے اردو غزل کو فارسی روایت سے قریب کر دیا تھا۔اس زمانے میں جبکہ لوگ عبدل اور جگت گرو کو پسند کرتے تھے انکا رنگِ سخن بالکل اجنبی لگتا تھا۔

تیسرے باب میں ہندوی اور فارسی روایت کی کشمکش کا ذکر ہے۔ یہ عہد سلطان محمد عادل شاہ کا ہے۔ یہاں علم و ادب تیزی سے پروان چڑھتا ہے، کیونکہ گولکنڈا اور بیجاپور کی فضا اہل علم کے لئے سازگار تھی۔

اس زمانے کی مشہور شاعر مرزا مقیم، مقیمی، صنعتی، رستمی، حسن شوقی ملک خوشنود، شاہ داول، خوش دہاں اور امین الدین اعلی کا ذکر ہے۔ ساتھ ہی فارسی کے اہلِ علم اور انکی تصانیف ظہور ابن ظہوری کا ''محمد نامہ'' رفیع الدین شیرازی کی ''احوالِ سلاطینِ بیجاپور'' اور فزونی استر آبادی کی

''فتوحاتِ عادل شاہی'' کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

اس دور میں اہلِ علم فارسی اسلوب کو اپنا رہے تھے اور ہندوی اثر کم ہوتا نظر آرہا تھا۔ بیجاپور میں سب سے زیادہ جس صنفِ سخن کو اہمیت ملی وہ مثنوی ہے۔ غزل بھی دھیرے دھیرے اپنے قدم جمارہی تھی۔ یہاں تمام مثنویاں غواصی کی مثنوی ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' کے بعد ہی لکھی گئیں۔ خوش دہاں اور امین الدین اعلی نے نثر میں اپنا مقام بنایا۔ مذہبی خیالات کو پیش کرنے کے لئے نثر کو ذریعہ بنایا گیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے عادل شاہ کے دربار سے منسلک مشہور فارسی شاعر میرزا مقیم پر کافی بحث کی ہے۔ انھوں نے پروفیسر زور اور نصیر الدین ہاشمی کا خیال ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ مرزا مقیم وہی شخص ہے جس نے ''چندر بدن و مہیار'' مثنوی لکھی اور اس کا تخلّص مقیمی ہے۔ مرتّب ''چندر بدن و مہیار'' کا بھی یہی خیال ہے لیکن جالبی خود اس بات کو نہیں مانتے انکی نظر میں میرزا مقیم اور مقیمی الگ الگ شخص ہیں۔ مرتّبِ ''چندر بدن و مہیار'' نے جو حوالے دیئے ہیں۔ انکے بارے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

> ''دلچسپ بات یہ ہے کہ موصوف نے کتبِ تواریخ سے جتنے حوالے دیئے ہیں۔ ان میں سے کسی نے ایک جگہ بھی مرزا محمد مقیم کا تخلّص مقیمی ظاہر نہیں کیا ہے۔ ''برہان مآثر'' میں ''میرزا محمد مقیم ابن میر محمد رضا رضوی مشہدی'' لکھا ہے۔ ''بساتین السلاطین'' میں جہاں معنی طرازی و لفظ پردازی و خطّاطی'' کی تعریف کی ہے وہاں اس کا نام میرزا محمد مقیم لکھا ہے، ''کتب خانۂ آصفیہ'' کے دیوانِ خمسہ کے ترقیمہ میں یہ الفاظ ملتے ہیں۔ ''مصنّفہ و کاتبہٗ مرزا محمد مقیم سلمٰی''۔ ''گلدستۂ بیجاپور'' کے مصنّف نے بھی میرزا مقیم ہی لکھا ہے۔ ''حدیقۃ السلاطین'' کے مصنّف مرزا نظام الدین احمد نے بھی ملاّ محمد مقیم ہی لکھا ہے فزونی نے بھی فتوحاتِ عادل شاہی میں مرزا مقیم لکھا ہے۔ احوالِ سلاطین بیجاپور میں جہاں یہ لکھا ہے کہ وہ اردو میں شاعری کرتا تھا وہاں اسکا نام مرزا مقیم ہی ظاہر کیا ہے۔'' [۱]

دوسری طرف وہ لکھتے ہیں کہ ''امین جس نے ''چندر بدن و مہیار'' کی

---

[۱] تاریخ ادب اردو جلد اول ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۶، ۱۹۷۷، ص ۲۳۵

پیروی میں اپنی مثنوی ''بہرام وحسن بانو'' لکھی تو یوں اعتراف کیا کہ۔:

یکایک میرے دل پر آیا خیال ☆ قصہ یک لہوں میں مقیمی مثال۔'' [۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے جو مثالیں پیش کی ہیں ان سے تو یہ ہی لگتا ہے۔ کہ یہ دونوں الگ شخص تھے، مگر پروفیسر زور اور نصیر الدین ہاشمی کو بھی غلط نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اس باب میں بیجاپور میں لکھی جانے والی مثنویوں کو سامنے رکھ کر یہاں کے اسلوب پر بحث کی گئی ہے۔ سب سے پہلے مرزا مقیم کے بارے میں پیش کیا گیا ہے۔ میرزا مقیم دکن کے فارسی شاعر تھے۔ انکا دیوان جو کہ انھوں نے خود لکھا تھا، سرلار جنگ کے کتب خانے میں محفوظ ہے اس میں قصائد، غزلیات، ترجیع بند، رباعیات، قطعات، مثنوی اور ساقی نامہ شامل ہیں۔ یہ اردو میں بھی شاعری کرتے تھے انکی ایک اردو مثنوی کا پتہ چلتا ہے اس کا نام ''فتح نامہ بکھیری'' ہے۔ اس کا اسلوب فارسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ عربی اور فارسی الفاظ کی تعداد بہت ہے۔ بہت سے مصرعے اور اشعار خالصتاً فارسی میں لکھے گئے ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی صاحب میرزا مقیم اور مقیمی کو ایک ہی شخص مانتے ہیں۔ انھوں نے مقیمی کو ایرانی شخص بتایا ہے۔ اسکی زبان بھی فارسی تھی، مثنوی ''چندر بدن ومہیار'' کے علاوہ ایک اور مثنوی کا ذکر کیا ہے۔ ہاشمی صاحب لکھتے ہیں۔

''اسپر نگر نے جو صراحت کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کی ایک مثنوی اور بھی تھی جس کا نام ''سومہار'' تھا۔ اس کے دو سو پچاس شعر تھے۔'' [۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے ''سومہار'' کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ جبکہ نصیر الدین ہاشمی نے مرزا مقیم کی اردو مثنوی ''فتح نامہ بکھیری'' کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں الگ الگ شخص ہونگے کیونکہ مقیمی کے ساتھ ''سومہار'' کا ذکر ہے۔ اور مقیم کے ساتھ ''فتح نامہ بکھیری'' کا ذکر آیا ہے۔ اگر یہ ایک ہوتے تو دونوں مثنویوں کا ذکر کہیں تو ساتھ ساتھ آتا۔ پھر بھی کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا ہے۔

مرزا مقیم اور مقیمی کے اسلوب کو محمد بن احمد عاجز نے اپنایا انکی دو مثنویاں ''یوسف زلیخا'' اور ''لیلہ مجنوں'' ہیں انکی زبان و بیان میں فارسی اسلوب چھایا ہوا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے، کہ

---

[۱] تاریخ ادب اردو جلد اول ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۶، ۱۹۷۷ء ص ۲۳۶

[۲] دکن میں اردو نصیر الدین ہاشمی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی جولائی ۲۰۰۲ء ص ۱۸۹

اردو زبان فارسی کے زیرِ اثر صاف ہو کر ایک نئے معیار میں تبدیل ہو رہی تھی۔ ان دونوں مثنویوں میں فارسی الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس میں ایک نیا رنگ ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ جو رنگ و آہنگ عاجز کے کلام میں ملتا ہے وہ پچاس ساٹھ سال بعد ولی دکنی کے یہاں نکھرتا ہے۔

چوتھا باب ''فارسی روایت کا رواج'' ہے اس باب میں جن شاعروں کا ذکر ہے وہ ملک خوشنود، امین، رستمی اور صنعتی ہیں، ملک خوشنود سلطان محمد عادل شاہ کے دور کے ممتاز شاعر ہیں۔ انھوں نے عادل شاہ کی فرمائش پر امیر خسرو کی یوسف زلیخا اور ''ہشت بہشت'' کا دکنی اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ''ہشت بہشت'' کا نام ''جنت سنگار'' رکھا تھا۔ ملک خوشنود کا زیادہ تر کلام ناپید ہے۔ جس میں یوسف زلیخا بھی شامل ہے۔ ''جنت سنگار''، چند غزلیں، ایک ہجو اور ایک مرثیے کا پتہ چلتا ہے۔

انکی شاعری کا اندازہ ''جنت سنگار'' سے لگایا جاسکتا ہے۔ انکے کلام میں ایک گونج اور جھنکار کا احساس ہوتا ہے۔ لہجے میں بلند آہنگی ہے جو پڑھنے والے کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ زبان پر فارسی اسلوب کا اثر بہت ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ دکن میں ہندوی تہذیب پر فارسی تہذیب اثر انداز ہو رہی تھی۔

اس زمانے میں انکی مثنوی ''بہرام وحسن بانو'' کے نام سے ملتی ہے۔ اس کا مصنف امین نامی ایک شاعر ہے۔ لیکن امین کو موت نے اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ مثنوی مکمل کرتا اسکی تکمیل ایک صوفی شاعر دولت شاہ نے کی تھی۔ یہ مثنوی مقیمی کی ''چندر بدن ومہیار'' کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ امین نے پہلے اس کو فارسی میں لکھا تھا۔ لیکن جب مقیمی کی شہرت دیکھی تو انکے دل میں بھی اردو میں لکھنے کا خیال پیدا ہوا مگر افسوس وہ اس کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہونچا سکے۔

امین کے بارے میں سید شمس اللہ قادری صاحب نے جو لکھا ہے، وہ ڈاکٹر جمیل جالبی سے مختلف ہے۔ وہ ''اردوئے قدیم'' میں لکھتے ہیں۔

> ''گجرات کا درباری شاعر ہے۔ سکندر منجھو نے اسکا نام ملک امین کمال لکھا ہے۔ سلطان بہادر (۹۳۲ھ) اور محمود شاہ ثانی (۹۴۳ھ ۹۶۱ھ) کے ندیمانِ خاص سے تھا۔ لطائف اور بدیہ گوئی کے حکایات مراۃ سکندری میں مذکور

ہیں۔ گجرات کے مشہور بزرگ شاہ عالم سراج الدین سید محمد حسینی (۸۸۰ھ) سے
اسکو خاص ارادت تھی۔ اس نے بہرام گوراور حسن بانو کے حسن وعشق کا فسانہ نظم
کرنا شروع کیا تھا۔ جو نصف سے زیادہ انجام پا کر نا تمام رہ گیا تھا۔ لیکن بعد میں
ایک دوسرے شاعر نے جسکا تخلص دولت ہے اسے تمام کیا۔'' [۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی اور شمس اللہ قادری صاحب ایک بات پر تو متفق ہیں کہ امین کی ادھوری مثنوی ''بہرام وحسن بانو'' کو دولت نے مکمل کیا تھا۔ لیکن امین کو لے کر دونوں میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر جالبی امین کو بیجاپور کا شاعر مانتے ہیں، جبکہ قادری صاحب گجرات کا شاعر مانتے ہیں دونوں نے ہی اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مثنوی میں فارسی وعربی تلمیحات کا بہت استعمال ہوا ہے۔ لیکن ہندوی تلمیحات بالکل ہی نظر نہیں آتیں۔ اس مثنوی کی زبان اور انداز بیان جانم اور عبدل کی زبان سے مختلف ہے۔ اس دور کے شاعروں نے اپنے اظہارِ خیال کو وسعت دینے کے لئے فارسی روایت سے استفادہ کرنا بہتر سمجھا اسی اندازِ فکر سے اردو میں ترجموں کا رواج بڑھتا گیا۔ رستمی کا خاور نامہ بھی اسی روایت کا حامل ہے۔ عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطان کی فرمائش پر رستمی نے فارسی ''خاورنامہ'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ترجمہ بالکل اصلی مثنوی سے ملتا ہوا ہے۔ کہانی کا تسلسل اور بحر بھی وہی ہے۔ رستمی نے ''خاورنامہ'' میں جو زبان استعمال کی ہے۔ وہ فارسی کی سادہ اور روزمرہ کی زبان ہے۔

اس دور کے ایک اور شاعر صنعتی ہیں انھوں نے مثنوی ''قصہ بے نظیر'' لکھی اس مثنوی میں شاعر نے خود لکھا ہے کہ اس نے یہ مثنوی اپنے نام کو ہمیشہ قائم رکھنے کے لئے لکھی حالانکہ وہ ایک فارسی داں تھا۔ مگر اس نے مثنوی ''قصہ بے نظیر'' دکھنی زبان میں لکھی کیونکہ اس دور کا تقاضا یہی تھا۔ ہر شخص اس کو پڑھ کر لطف اندوز ہوسکتا تھا۔ اس میں سنسکرت کے الفاظ بہت کم استعمال کئے گئے ہیں۔ مثنوی کے اسلوب اور مزاج پر فارسی زبان کا زبردست اثر نظر آتا ہے۔ صنعتی کے شاعرانہ فن میں وہی معیار ہے جو فارسی مثنویوں کا معیار ہے یہ مثنوی بیجاپور کی ادبی روایت میں تبدیلی کا باعث ہے اس دور میں فارسی رنگ غالب آرہا تھا وہ صنعتی کے یہاں کھل کر سامنے آتا ہے۔

---

[۱] اردوئے قدیم اللہ شمس قادری مطبع منشی نول کشور واقع لکھنؤ ۱۹۲۵ ص ۴۸

پانچواں باب ''غزل کی روایت کا سراغ'' ہے یہ باب دکن کے ممتاز شاعر حسن شوقی کے اردگرد گھوم رہا ہے۔اس میں انکی حالاتِ زندگی اور شاعری کے بارے میں بیان ہے انکے زمانے میں فارسی اسلوب و آہنگ نے اردو زبان کو اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔یہی اسلوب پورے دکن میں پھیل گیا۔شوقی نے بھی اپنے کلام میں یہی رنگ اختیار کرلیا۔انکی دو مثنویاں اور ۳۱ غزلیں سامنے آئیں ہیں۔ایک مثنوی ''فتح نامہ نظام شاہ'' اور دوسری ''میزبانی نامہ'' ہے۔حسن شوقی کی غزلوں میں وہی روایت نظر آتی ہے۔جو روایت ولی دکنی نے اپنی غزلوں میں اپنائی تھی۔شوقی کی غزلیں فارسی غزل کی پیروی کرتی ہیں وہی زبان و بیان اور رنگ و آہنگ ہے جو فارسی غزل کی خاصیت ہے۔شوقی فارسی شاعر خسرو ہلالی، انوری اور عنصری سے مرغوب نظر آتے ہیں۔انھوں نے اپنے کلام میں خود اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے۔انکے زمانے میں غزل ابتدائی مرحلے سے گذر رہی تھی اس لئے زبان و بیان میں کچھ خامیاں ہیں۔مگر اس کے باوجود شوقی کی غزلوں میں لطافت کا احساس ہوتا ہے۔انکی غزل میں عشقِ مجازی کا اظہار ہے وہ محبوب کے حسن و جمال کی تعریف کرتے ہیں۔عشقیہ جذبات کے مختلف رنگ انکے کلام میں نظر آتے ہیں۔

حسن شوقی نے غزل کی روایت کو نئے رنگ کے ساتھ پھلنے پھولنے میں مدد دی ہے۔اپنی شاعری کو اتنا مؤثر اور منفرد بنایا کہ آگے آنے والے شعراء نے اس اندازِ سخن کو اپنا نا پسند کیا۔اس روایت کو آگے بڑھانے میں شوقیؔ کے ساتھ محمودؔ، فیروزؔ، خیالیؔ، محمد قلی قطب شاہ، نصرتیؔ اور ہاشمیؔ شامل ہیں۔

چھٹے باب کا موضوع ہے ''مذہبی تصانیف پر فارسی اثرات۔'' ڈاکٹر جا جمیل جالبی نے اس میں شیخ داول اور شیخ محمود خوش دہاں کے بارے میں بیان کیا ہے۔یہ دونوں برہان الدین جانم کے مرید تھے، اس کے علاوہ شاہ امین الدین اعلی کی تصانیف کے بارے میں بھی لکھا ہے۔مذہبی تصانیف پر فارسی اثر پڑھنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ مذہبی تصانیف اپنے اسلوب کی وجہ سے ادبی دائرے میں نہیں آتی تھیں۔ادبی روایت شروع ہونے کے بعد یہ تصانیف غیر اہم ہوگئیں۔ان کو اہم بنانے کے لئے اس اس دور کے فارسی اسلوب کو اپنانے کی ضرورت پیش آئی برہان الدین جانم نے فارسی اسلوب کو

اپنایا انکی پیروی انکے پوتے اور دونوں مریدوں نے بھی کی ہے۔

شیخ عالم محمد داول صوفی بھی تھے اور شاعری بھی کرتے تھے۔ شاہ جانم کے مرید تھے اس حد تک تھے کہ اپنی شاعری میں انکے خیالات، اوزان اور ہندوی اسلوب کو اپنایا لیکن انکے یہاں عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال زیادہ ہے۔ شاہ داول کی چار نظمیں ہیں۔ چہار داشت، کشف الانوار، کشف الوجود اور ناری نامہ۔ انکی شاعری جدید اسلوب سے کافی قریب تر ہے۔ انکے یہاں لوچ اور مٹھاس ہے جو حاتم کے یہاں نہیں ملتا ہے۔

جانم کے دوسر مرید شیخ محمود الحق خوش دہاں ہیں۔ انھوں نے جانم کی تعلیم کو پھیلایا اپنے مشہور رسالے ''معرفت السلوک'' میں اپنے پیر کے فلسفے کو وضاحت و دلائل کے ساتھ پیش کیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ موسیقیت بھی نظر آتی ہے۔ جو سننے میں بڑے دلنشیں لگتے ہیں۔ شاہی نے فارسی رنگ کو کافی حد تک اپنالیا تھا۔ لیکن ہندوی مزاج کو ترک نہیں کر سکے یہ اسلوب انکے قصائد، مراثی، غزل وغیرہ میں خوب نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ عبدل کے دور میں جو کشمکش فارسی اور ہندوی میں تھی وہ شاہی کے دور تک بالکل ختم ہوجاتی ہے اور فارسی اسلوب غالب آجاتا ہے۔ جس طرح سورج غروب ہوتے وقت اپنے شباب پر ہوتا ہے اسی طرح دکنی شاعری بھی نصرتی کے ساتھ اپنے شباب پر پہونچ جاتی ہے۔

محمد نصرت نصرتی کا شمار ان شاعروں میں ہوتا ہے۔ جو پیدائشی شاعر ہوتے ہیں۔ انکی تعلیم وتربیت بڑے اعلیٰ پیانے پر کی گئی۔ کتب بینی کا شوق رکھتے تھے۔ اسی لئے انکے پاس علم کا خزانہ تھا۔ لوگ انھیں ملا نصرتی کہتے تھے۔ ملک الشعراء کا خطاب بھی حاصل کیا۔ شاعری کی دنیا میں انھوں نے گلشنِ عشق، علی نامہ، تاریخ اسکندری اور دیوانِ نصرتی لکھے ہیں۔ دیوان میں غزلیات قصائد، مخمس، ہجو اور رباعیاں شامل ہیں۔

نصرتی نے گلشنِ عشق دکنی زبان میں لکھی ہے لیکن طرز فارسی کا اپنایا ہے کیونکہ اس وقت مثنویاں فارسی طرز کے معیار پر لکھی جارہی تھیں۔ نصرتی نے بھی وقت کا ساتھ دیا انھوں نے ایک خوبی یہ دیکھائی کہ دکنی زبان کی خصوصیات کو فارسی زبان کی خصوصیات سے اسی طرح ملا دیا کہ ایک نیا معیار قائم ہوگیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے "گلشنِ عشق" کے ساتھ "علی نامہ" اور "تاریخ اسکندری" کے بارے میں بھی بیان کیا ہے، "علی نامہ" ایک طویل رزمیہ مثنوی ہے اس میں بھی وہی ہیئت استعمال کی گئی ہے جو دکن کی مثنویوں کا خاصہ تھی۔ نصرتی نے "علی نامہ" لکھتے وقت فردوسی کے "شاہنامہ" کے معیار کو اپنے سامنے رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکی مثنوی بالکل منفرد اور بے مثال ہے نصرتی نے شاعرانہ حسنِ بیان سے کام لیا ہے جبکہ یہ ایک رزمیہ مثنوی ہے۔ میدانِ جنگ کا نقشہ بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی نظر میں "علی نامہ" ایک ایسی رزمیہ مثنوی ہے جس میں کوئی خامی یا کمی نظر نہیں آتی۔ انھوں نے عبدل کی ابراہیم نامۂ اور رستمی کی "خاور نامہ" کے مقابلے میں "علی نامہ" کو بہتر بتایا ہے۔ اس سلسلے میں نصیر الدین ہاشمی بھی اس رائے سے متفق ہیں وہ لکھتے ہیں۔

> "علی نامہ ایک رزمیہ مثنوی ہے۔ رزمیہ مثنویوں کا جو معیار مقرر ہے اس سے بلند مرتبہ رکھتی ہے اور پھر اچھی ہونے کے لحاظ سے اس کو 'خاور نامہ' پر فوقیت دینی ضروری ہے۔ تاریخی حالات کے اعتبار سے یہ نظم نہایت مستند ہے اور ادبی نقطۂ نظر سے بہت بلند پایہ ہے۔"[۱]

تاریخ اسکندری" میں نصرتی نے دوروزہ جنگ کو موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔ اس کا اصل نام "فتح نامۂ بہلول خاں" ہے اس میں علی عادل شاہ ثانی شاہی کی وفات کے بعد انکے پانچ سالہ بیٹے سکندر کے تخت پر بیٹھنے کے بعد کے حالات کا ذکر ہے۔ کہ کس طرح سلطنت میں سازش شروع ہوگئیں۔ شیواجی نے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ اور بہلول خاں نے دوروز میں ہی اسکا مقابلہ کر کے سیواجی کو شکست دینے میں کامیاب ہوگیا۔ اس قصّے کو مثنوی میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی ہیئت بھی پہلی دونوں مثنویوں کے طرز پر ہے۔ اس میں نصرتی کی شاعری کی تمام خوبیاں موجود ہیں مگر اس میں زبان کا فرق محسوس ہوتا ہے۔ "تاریخ اسکندری" میں اپنا انداز بہت بدل دیا ہے فارسی رنگ اس پر غالب آ گیا ہے۔

قصیدہ نگاری میں بھی نصرتی کی نمایاں حیثیت ہے اردو زبان میں وہ پہلے بڑے قصیدہ نگار ہیں۔ انھوں نے تیرہ قصیدہ لکھے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے نصرتی کے ایک قصیدہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> "نصرتی کا قصیدۂ چرخیہ اپنے جوشِ عقیدت، انداز بیان، تخّیل و معنی آفرینی،

---

[۱] دکن میں اردو نصیر الدین ہاشمی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی جولائی ۲۰۰۲ء ص ۲۱۴

موسیقانہ آہنگ اور خوبصورت بحر کی وجہ سے ایک اور شاہکار قصیدہ ہے۔''[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ قصیدہ کی دنیا میں سودؔا اور ذوقؔ سے پہلے نصرتؔی کا نام لینا چاہئے۔ نصرتؔی کی غزل بھی اسی روایت کا ایک حصہ ہے جس پر بیجاپوری اسلوب کا رنگ چڑھا ہوا ہے انکی غزلوں میں تخیل اور معنی آفرینی کی کمی پائی جاتی ہے بہر حال انکا شمار عظیم شاعروں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے اپنے مضمون ''تاریخ ادب اردو کا ایک جائزہ'' میں تاریخ ادب اردو کا احاطہ کیا ہے۔ اس کا حوالہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے تائید کی ہے انھوں نے لکھا ہے۔

> ''نصرتؔی نے اپنے دور کی شاعری پر دو گہرے اثرات چھوڑے پہلا اثر تو یہ تھا کہ اس نے زبان و بیان پر ایک ایسا معیار قائم کیا۔ جہاں تک دکنی شاعری اب تک نہیں پہونچی دوسرا اثر یہ تھا کہ اس نے ہیئت اور مواد کے گہرے رشتے کو واضح کیا اور اپنی شاعری میں ایک نئے فنی توازن کو قائم کیا۔''[۲]

اس پر تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ جو شاعر اس قدر اور اتنے عرصے تک ادب کی خدمت کرتا ہے۔ وہ ''عہدِ آفرین'' بن جاتا ہے آنے والی نسلوں کے لئے ایک ایسا اسالیب مہیا کر جاتا ہے۔ جن پر بہت سے ادبی پاروں کی اساس قائم ہو سکتی ہے۔ اس بات پر اتفاق کیا جا سکتا ہے نصرتؔی کے دونوں اثر آگے آنے والوں کے لئے اہم ہیں۔

آٹھواں باب ''نیا عبوری دور'' ہے۔ اس میں ہاشمؔی کی شاعری کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کے یہاں نصرتؔی کے اثرات پوری طرح سرایئت کر گئے ہیں، مگر ہاشمؔی کے زمانے میں دکن پر شمالی ہند کے سیاسی، تہذیبی اور لسانی اثرات چھانے لگتے ہیں۔ اور دکن کی اپنی روایت کمزور پڑنے لگتی ہے۔

علی عادل شاہ ثانی کے زمانے کے نامور شاعروں میں سید میراں میاں خاں ہاشمؔی شامل ہیں۔ انکے بارے میں مشہور ہے کہ یہ پیدائشی نابینا تھے۔ لیکن رنگیں شاعری کو دیکھ کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہاشمؔی پیدائشی نابینا نہیں رہے ہونگے۔ انھوں نے غزلیں، مثنویا اور قصیدے لکھے ہیں ڈاکٹر جمیل جالبی کی نظر سے جو کلام گذرا ہے وہ کچھ اس طرح ہے ''مخمس درنعت مدح مہدی جونپوری''، ''معراج نامہ''، ''مثنوی عشقیہ''، ''مثنوی یوسف زلیخا'' اور دیوانِ ہاشمؔی وغیرہ۔ ہاشمؔی کی مثنویوں

---

۱ تاریخ ادب اردو جلد اول ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۶، ۱۹۷۷ء ص ۳۴۷

۲ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ موئف گوہر نوشاہی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ء ص ۳۱۵

میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اس میں سلاست، روانی اور سادگی ہے۔ اس زمانے میں یہ زبان عام فہم تھی۔ مگر آج آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ ہاشمیؔ کے زمانے کے حساب سے زبان آسانی سے سمجھ آجاتی تھی۔

ہاشمی مہدوی عقیدے کی پیروی کرتے تھے۔ اس عقیدے کے ماننے والوں میں عبدالمومن مومنؔ کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو مہدوی تحریک کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا انکی مشہور مثنوی ''عشق نامہ'' (اسرارِ عشق) ہے اس کا موضوع سید محمد مہدی موعود کے حالاتِ زندگی اور انکا فلسفہ ہے۔ یہ مثنوی دکنی اردو میں لکھی گئی ہے۔ مہدوی عقیدت مندوں پر اردو زبان کا رنگ پوری طرح چھایا ہوا تھا۔ آگے چل کر زبان میں کچھ تبدیلی دیکھائی دیتی ہے۔ اسی زمانے کے شاعر محمد امین ایاغی کے کلام میں وہی رنگ نظر آتا ہے۔ جو ولیؔ کے یہاں ملتا ہے۔ انکی زبان اپنے ہم عصر شاعروں سے مختلف ہے۔ انھوں نے متعدد غزلیں لکھی ہیں۔ اور مثنوی ''نجات نامہ'' لکھی۔ اس میں بادشاہ کی اصلاح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسکے اندازِ بیان میں سادگی ہے کسی رنگینی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ لیکن سادگی کے باوجود کلام میں اثر آفرینی ہے۔

اس زمانے میں جہاں مثنوی اور غزل کی صنف مقبول و عام ہو رہی تھی۔ وہیں مرثیہ نگاری بھی عام ہو رہی تھی۔ اس صنف میں مرزاؔ بیجاپوری کافی مقبول ہوئے انکے مرثیے دکن میں پسند کئے جارہے تھے۔ انکی زبان پر فارسی اسلوب کا اثر دکھائی دیتا ہے۔

فصل پنجم قطب شاہی دور

(۱۵۱۸ء - ۱۶۸۶ء)

فصل پنجم میں پہلے باب میں پسِ منظر، روایت اور ادبی ولسانی خصوصیات ہیں۔ قطب شاہی دور میں اردو ادب کو کیا حیثیت حاصل تھی۔ اس دور کے زیادہ تر بادشاہوں نے علم و ادب کو بہت اہمیت دی کیونکہ یہ سب خود اعلیٰ تعلیم سے آراستہ تھے۔ ساتھ ساتھ انھوں نے اسلام کو بھی ترقی دی۔ ابراہیم قطب شاہ کے زمانے میں بڑے اچھے فارسی شاعر گذرے ہیں۔ قاسم طبی، حاجی ابرقوہی اور خود شاہ بن قیاد الحسینی۔ اردو زبان کے شاعروں میں فیروزؔ، ملاّ خیالیؔ اور محمود وغیرہ شامل ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں بھی ادبی سرگرمیوں میں بڑا جوش نظر آتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کا دور اس پوری سلطنت کا زرّیں دور کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں جہاں شاعری کو عروج حاصل تھا وہیں تعمیری کام بہت ہوا حیدر آباد شہر بسایا گیا۔ نہریں، فوآرے، سیر گاہیں، عبادت خانے اور کتب خانے بنائے گئے۔ اس دور کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ محمد قلی قطب شاہ پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہوئے انکے زمانے میں وجہی جیسا مشہور شاعر گذرا۔ انکے بعد کے شاعروں نے بھی انکی روایت کو قایم رکھا۔ عبداللہ کے دور میں کئی قابلِ قدر شاعر اور نثر نگار گذرے ہیں۔ جن میں غواصیؔ، ابن نشاطیؔ، جنیدیؔ، طبعی، میراں جیؔ حسن خدا نما، میراں یعقوب اور سید بلاقیؔ وغیرہ شامل ہیں۔

> ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں ''اس خاندان کے بادشاہوں نے ایرانی تہذیب زبان اور ادب کو اتنی اہمیت دی کہ خود فارسی اسالیب، آہنگ، لہجہ، اصناف اور مذاقِ سخن ابتدا ہی میں یہاں کی مشترک زبان (اردو) پر چھا گئے۔ جس طرح بیجاپوری اسلوب گجری کے زیرِ اثر پروان چڑھ کر ہندوی رنگ و آہنگ سے قریب ہوگیا۔ یہی ان دونوں علاقوں کے اسلوب کے مزاج کا بنیادی فرق ہے''۔[1]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے گولکنڈا اور بیجاپور کے اسلوب کے فرق کو سمجھانے کے لئے دونوں جگہ کی شاعری کو الگ الگ پیش کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ گولکنڈا میں فارسی اثرات چھائے ہوئے تھے۔ بیجاپور میں ہندوی اثر تھا۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ دونوں جگہوں کے شاعروں نے ایک دوسرے کے اثرات قبول کئے۔ یہاں سب سے زیادہ جس صنفِ سخن کا رواج ہوا وہ مثنوی ہے غزل کو بھی کچھ

---

[1] تاریخ ادب اردو جلد اول ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۶، ۱۹۷۷ء ص ۳۸۴ - ۳۸۵

شاعر اپنا رہے تھے گولکنڈا میں قصیدے بھی لکھے جا رہے تھے۔ مرثیے کا بھی رواج تھا۔ خود محمد قلی قطب شاہ نے بھی کئی مرثیے لکھے ہیں۔ بہر حال دونوں جگہ کا اسلوب کتنا ہی مختلف ہو لیکن لسانی خصوصیات ایک ہی تھیں۔ تذکیر و تانیث اور واحد جمع بنانے کا طریقہ ایک ہی تھا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے دوسرے باب میں ''فارسی روایت کا آغاز'' پیش کیا ہے۔ اس میں تین فارسی شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ فیروز، محمود اور خیالی انھوں نے فارسی اسلوب کو اردو زبان میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ اپنا رنگِ سخن ایسا پُر تاثیر بنایا کہ محمد قلی، وجہی، غواصی اور ابنِ نشاطی نے اپنی شاعری میں اسی اثر کو قبول کیا۔ ان شاعروں نے اپنے اشعار میں فیروز، محمود اور خیالی کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے۔ اس ذکر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ لوگ فارسی شاعروں کا اثر قبول کر رہے تھے۔

تیسرا باب ''فارسی روایت کا رواج'' ہے۔ اس میں سب سے پہلے محمد قلی قطب شاہ کی زندگی اور شاعری کا بیان کیا گیا ہے۔ انکی شاعری کی بنیاد پر فارسی روایت کے رواج کو بیان کیا ہے۔ یہ پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنا دیوان فارسی طریقے سے ترتیب دیا تھا۔ انگلستان اور ایران میں ادب بہت ترقی کر رہا تھا، ''نشاۃ الثانیہ'' یورپ سے ہوتا ہوا ایشیا تک آپہونچا تھا۔ ادب میں نئے نئے راستے کُھل رہے تھے۔ نیا کلچر ابھر کر سامنے آرہا تھا۔ اس نئے رنگ کو محمد قلی قطب شاہ نے بڑی خوشی سے اپنایا۔ انھوں نے عوام اور خواص میں تال میل پیدا کرنے کی کوشش کی کیونکہ سماج دو حصّوں میں بٹا ہوا تھا۔ اعلیٰ طبقے کے لوگ عوام سے دوری بنا کر رکھتے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ نے عوامی شاعری کے ساتھ ساتھ فارسی روایت کو بھی پوری طرح اپنایا۔ نصیر الدین ہاشمی نے محمد قلی قطب شاہ کے کلام کے بارے میں لکھا ہے۔

> ''کلامِ فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی کی آمیزش بھی کافی ہے۔ فارسی کے برخلاف اس نے ہندی کے اسلوب کو اختیار کیا ہے۔''[۱]

انھوں نے سب اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے ان میں جو بحر اور وزن استعمال کیا ہے وہ فارسی زبان کا استعمال کیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس سلسلے میں محمود شیرانی کی کتاب ''مقالاتِ حافظ'' کا حوالہ دیا ہے۔ محمود شیرانی نے اپنی کتاب میں یہ خیال ظاہر کیا ہے۔

---

[۱] دکن میں اردو نصیر الدین ہاشمی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی جولائی ۲۰۰۲ء ص ۹۲

''یہ فارسی عروض کی ہندی زبان میں اشاعت تھی۔ جس نے اردو زبان کے مستقبل میں ہمیشہ کے لئے ایک ہنگامہ خیز انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ انقلاب گیارہویں صدی ہجری کے آغاز میں شروع ہوتا ہے اور اس کا پہلا نتیجہ محمد قلی قطب شاہ کا کلیات ہے۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ اردو زبان، اوزان وبحور، جذبات وتخیل اور تشبیہ محاورے میں فارسی زبان کی تابع بنادی گئی ہے۔ ہندی جذبات وتخیلات و اوزان ترک کردیئے گئے ہیں۔ اس تبدیلی نے اردوزبان کے دائرے میں بے حد وسعت پیدا کردی اور اس میں ہر قسم کے مطالب و خیالات کی ادائیگی کے لئے استعداد آ گئی دوہروں اور مثنوی کے اوزان محدود ہیں اس پر طرہ ان زبانوں کی تہی مائیگی بہر حال فارسی کے پیوند نے اردوزبان کو ہر لحاظ سے مالا مال کردیا۔''[1]

ڈاکٹر جمیل جالبی اس خیالات سے متفق ہیں۔ لیکن ان کا خیال ہے کہ یہ انقلاب دسویں صدی ہجری میں شروع ہو گیا تھا۔

''تاریخ ادب اردو'' میں محمد قلی قطب شاہ کے دربار کے ایک شاعر شیخ احمد گجراتی کا ذکر ہے۔ انکی دو مثنویاں ''لیلیٰ مجنوں'' اور ''یوسف زلیخا'' سامنے آئی۔ اس شاعر کی یہ خاصیت لکھی گئی ہے کہ یہ عربی، فارسی، سنسکرت اور تلنگی جاننے کے باوجود شاعری اپنی زبان (ہندوی) میں کرتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مقبولِ عام نہ ہو سکا۔ کیونکہ اس وقت فارسی روایت کا زبردست اثر تھا۔ اس وقت ہندوی اسلوب کا زوال ہو رہا تھا اور فارسی اسلوب عروج پر تھا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی مثنوی ''یوسف زلیخا'' کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''شیخ احمد نے 'یوسف زلیخا' میں اپنی شعر گوئی کی استعداد اور صلاحیت کا بھر پور مظاہرہ کیا ہے۔ اور اس دور میں ہم اُسے وجہی، غواصی، مقیمی اور صنعتی کے ساتھ کھڑا کر سکتے ہیں۔''[2]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے جس مثنوی کی اس قدر تعریف کی ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے اس مثنوی کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا ہے انھوں نے لکھا ہے۔

---

[1] مقالات حافظ محمود شیرانی مجلس لاہور ۱۹۶۶ء ص ۲۰۰

[2] تاریخ ادب اردو جلد اول ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۶، ۱۹۷۷ء ص ۳۲۸

''احمد کی دو مثنویوں کا پتہ چلا ہے ایک تو ''لیلیٰ مجنوں'' اور دوسری ''مصیبت اہلِ بیت۔''[۱] سمجھ میں نہیں آتا ''یوسف زلیخا'' کو انھوں نے کیوں نظر انداز کیا۔

چوتھا باب ''فارسی روایت کا عروج نظم اور نثر میں'' کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں ملا وجہی کی نظم و نثر پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ وجہی نے آنکھ کھلتے ہی محمود، فیروز اور خیالی کی شاعری کے بارے میں سُنا۔ انکی شہرت کا چرچا پورے گولکنڈا میں تھا۔ یہاں کے شاعر فارسی شاعروں کی پیروی کر رہے تھے۔ فارسی بحور و اوزان اور اسالیب کو اپنا رہے تھے اشعار میں سلاست اور ربط کا بھی خیال رکھا جا رہا تھا۔

وجہی نے بھی اس روایت کی پیروی کر کے فارسی زبان کو دکن میں پروان چڑھایا۔ انکی تصانیف اس بات کی گواہی دیتی ہیں۔ ''دیوانِ وجہی''، ''قطب مشتری''، ''سب رس'' اور ''تاج الحقائق'' پر فارسی روایت کا بھرپور اثر ہے۔ ''تاج الحقائق'' کے بارے میں کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ کہ یہ وجہی کی تصنیف ہے کہ نہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس کا مصنف وجیہ الدین محمد کو مانتے ہیں، ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''قطب مشتری'' کو اس دور کی مقبول ترین تصانیف میں سب سے بہتر بتایا ہے، انھوں نے نظامی کی ''کدم راؤ پدم راؤ''، احمد گجراتی کی ''یوسف زلیخا'' اور عبدل کا ''ابراہیم نامہ'' کا مقابلہ وجہی کی ''قطب مشتری'' سے کیا ہے۔ اس کا اسلوب زبان و بیان کے اعتبار سے زیادہ نکھرا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس کا فارسی طرز اور سلاست بیانی اس بات کا ثبوت ہے کہ وجہی شاعری کے فنی شعور سے پوری طرح واقف تھے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''قطب مشتری'' کے ساتھ ساتھ وجہی کی نثری تصنیف ''سب رس'' پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ یہ بھی فارسی طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس میں فارسی روایت پہلے سے بہتر شکل میں نظر آتی ہے۔ ''سب رس'' سے پہلے مذہبی تصانیف زیادہ لکھی گئیں تھیں۔ لیکن وجہی نے ''سب رس'' لکھ کر ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی اس میں قصہ بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

> ''تاریخی اعتبار سے 'سب رس' کی اہمیت دوہری ہے۔ اولاً یہ کہ ''خالص اور بے میل''، تمثیل کے لحاظ سے ہمیشہ کی طرح آج منفرد ہے۔ ثانیاً یہ کہ ''سب رس'' اردو نثر کا پہلا ''ادبی'' کارنامہ ہے۔''[۲]

---

[۱] دکن میں اردو نصیر الدین ہاشمی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی جولائی ۲۰۰۲ء ص ۱۱۶

[۲] تاریخ ادب اردو جلد اول ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۷ء ص ۳۵۹

''مختصر تاریخ ادب اردو' میں اعجاز حسین نے وجہی کی کتاب ''سب رس''
کے بارے میں نصیر الدین ہاشمی کی رائے لکھی ہے، کہ ''یہ کتاب غالباً وجیہ الدین
گجرات کی تالیف کا ترجمہ ہے جس کو وجہی نے ۱۰۴۵ھ میں مرتبہ کیا۔''[1]

جبکہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے وجہی کے بارے میں کہیں ایسا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ انھوں نے یہ ضرور بتایا ہے۔ کہ وجہی کا نام کئی طریقے سے لکھا ہوا سامنے آیا ہے کہیں وجھی کسی جگہ وجیہ ہے اور کہیں وجہی ہے۔ شاید ہاشمی صاحب نے وجیہ کو وجیہ الدین گجراتی سمجھا ہو کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔

پانچواں باب ''فارسی روایت کی توسیع'' ہے۔ اس میں محمد قلی قطب شاہ کے نواسے عبداللہ قطب شاہ کے دور کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ انکی شاعری انکی زندگی سیدھی سادی ہے گہرائی بالکل بھی نہیں ہے انکی شاعری کے موضوعات شراب محبت اور عورت ہیں۔ انھوں نے شاعری میں محمد قلی قطب شاہ کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے لیکن انکی ایک الگ خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے صنعتِ ایہام کا بہت استعمال کیا ہے۔ انکی غزلوں میں موسیقی کا احساس ہوتا ہے انکی شاعری پر فارسی زبان کا اثر ہے انکے دور میں بڑے شاعر گذرے ہیں۔ ان میں علاّمہ ابن خاتون، ملاّ جمال الدین، ملاّ علی بن طیفور، مولانا حسین آملی اور ملا فتح اللہ سمسانی شامل ہیں۔ ابن نشاطی، جنیدی، شاہ راجو بھی انکے دور کے شاعر ہیں۔ ''سب رس''، ''برہانِ قاطع'' اور ''حدیقۃ السلاطین'' جیسی اہم تصانیف انھیں کے زمانے کی ہیں۔ اسی لئے عبداللہ قطب شاہ کی تاریخ میں اہمیت ہے۔ انکے زمانے میں بڑے اچھے شاعر گزرے ہیں۔ غواصی انکے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ اسکی تین مثنویاں مینا ستونتی، سیف الملک بدیع الجمال اور طوطی نامہ مشہور ہیں۔ ان مثنویوں سے اسکی شاعری کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ غواصی نے شاعری میں عام زبان استعمال کی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس باب میں غواصی کی شاعری کا مقابلہ وجہی کی شاعری سے کیا ہے دونوں کی خصوصیات کو اچھے انداز سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے غواصی کے مقابلے میں وجہی کی شاعری کو بہتر لکھا ہے۔ اسکی وجہ یہ رہی ہوگی کہ غواصی کی شاعری پر بیجاپوری اثر زیادہ تھا۔ انھوں نے پراکرتی الفاظ زیادہ استعمال کئے ہیں۔ حالانکہ غواصی کی شاعری نے بیجا بور کو ایک نیا انداز دیا یہاں کے شاعر بھی فارسی رنگ اپنانے لگے۔

---

[1] مختصر تاریخ ادب اردو اعجاز حسین ص ۳۸

ڈاکٹر جمیل جالبی نے عبداللہ کے دور کے کئی شاعروں کا ذکر کیا ہے۔قطب زادی جنھوں نے حضرت یوسف شاہ راجو قتال کی مشہور فارسی تصنیف ''تحفۃ النصائح'' کا دکھنی میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔

ابنِ نشاطی کی ''پھولبن'' یہ فارسی قصۂ ''بساتین الانس'' کا دکھنی میں ترجمہ ہے۔ابن نشاطی کی شاعری پر فارسی اثرات کافی گہرے ہیں۔انھوں نے کچھ اشعار میں فارسی شاعر فیروز، محمود، احمد اور حسن شوقی کا ذکر کیا ہے۔انکے ذکر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انھیں استاد مانتے تھے اور انکی شاعری سے متاثر تھے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان اشعار کا بھی ذکر کیا ہے۔یہ مثنوی ''پھولبن'' سے لئے گئے ہیں۔ابن نشاطی ایک انشاء پرداز تھا لیکن ''پھولبن'' لکھ کر اس نے ایک شاعر ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اس نے عربی فارسی الفاظ کا کافی استعمال کیا ہے۔صنائع بدائع اور قافیے کا خیال رکھا ہے۔شاعری میں حسن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔انکے زمانے میں غزل کا بھی بہت رواج ہوگیا تھا۔

اسی زمانے کے ایک شاعر سید بلاقی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔''معراج نامہ'' انکی مشہور نظم ہے اسکے نسخے پیرس، لندن، کراچی اور حیدرآباد کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب مولود نامے، معراج نامے اور وفات نامے لکھے جارہے تھے۔مولود نامے اور وفات نامے لکھنے کے سلسلے میں عبداللطیف کا نام آیا ہے۔انکے علاوہ معظم نام کے ایک شاعر نے ''معراج نامہ'' لکھا اور ایک نظم ''قلندر نامہ'' لکھی۔اس دور کے ایک شاعر مہدوی کا بھی ذکر ہے انھوں نے غواصی کی ''مینا ستونتی'' کے قصّے کو ''میناولورک'' کے نام سے منظوم کیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے عبداللہ کے دور کی اردو نثر پر بھی بحث کی ہے۔اس زمانے میں وجہی نے ایک الگ طرز کی نثر کی شروعات کی تھی۔انھوں نے اپنی تصنیف ''سب رس'' فارسی طرز پر لکھی اس سے پہلے مذہبی تصانیف زیادہ لکھی جاتی تھیں۔ادب پر فارسی رنگ غالب آرہا تھا۔فارسی تصانیف کے ترجمے اردو میں کئے جارہے تھے۔اس میں دو نام سامنے آئے ہیں۔جنھوں نے فارسی تصانیف کو اردو کا پیراہن عطا کیا۔ یہ قابلِ قدر ہستیاں میرانجی خدانما اور میراں یعقوب ہیں۔میرانجی خدانما مذہبی خیالات رکھتے تھے۔انھوں نے اپنے خیالات کی تبلیغ کے لئے کچھ رسالے تالیف کئے۔ان میں ''چہار وجود''، ''شرحِ تمہیدات ہمدانی'' اور ''رسالۂ قربیہ'' ہیں انکی اردو نثر میں بڑی اہمیت ہے۔میراں یعقوب نے ''شمائل الاتقیا'' لکھی ہے۔اس میں فارسی اشعار کا اردو میں ترجمہ کیا گیا

ہے۔ اس میں تصوّف اور شریعت کی اصطلات کا بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے اس کی نثر بہت سادہ ہے عام بول چال کی زبان استعمال کی گئی ہے اور شاعرانہ انداز سے دوری اختیار کی گئی ہے۔

چھٹا باب فارسی روایت کی تکرار ہے یہ زمانہ ابوالحسن تانا شاہ کا ہے۔ انکی حکومت میں ایسا لگتا ہے۔ جیسے شاعری چلتے چلتے تھم گئی ہے کوئی اچھا شاعر نظر نہیں آتا۔ کوئی اچھی مثنوی نہیں ملتی فقط صاف ستھری زبان کا استعمال ہے۔ یہ زبان ریختہ سے کافی قریب ہے۔

اس دور کا سب سے بہتر شاعر طبعؔی ہے اس نے ''بہرام وگل اندام'' نام کی مثنوی لکھی ہے اس پر شمال کی زبان کا کافی اثر تھا اسکی زبان آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس زمانے کی دوسری مثنویوں سے اس کا مقابلہ کیا جائے تو ''بہرام وگل اندام'' فن، زبان اور ترتیبِ قصہ کے اعتبار سے بہت بہتر ہے۔ اس زمانے میں محبؔ نام کے شاعر نے ''معجزۂ فاطمہ'' مثنوی لکھی اسکی زبان میں بھی صفائی اور سادگی نظر آتی ہے۔ اس وقت مُغل ہر طرف پھیل رہے تھے پورے معاشرہ میں بحران تھا۔ انکا خوف چھا رہا تھا لوگ مذہب سے زیادہ قریب ہو گئے تھے۔ مولود نامے، وفات نامے اور معراج نامے لکھے جارہے تھے، مختار نے ایک مولود نامہ لکھا یہ آنحضرت محمدؐ کی پیدائش پر تھا۔ اسکو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے معراج نامہ بھی لکھا ہے۔ اسکی زبان طبع کی مثنوی کی زبان سے زیادہ صاف اور نکھری ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

فتاحؔی نے بھی ''مولود نامہ'' لکھا اسکی زبان بھی روز مرّہ کی زبان ہے۔ اسی زمانے میں شغلؔی نے ''پند نامہ'' لکھا یہ فارسی کتاب کا ترجمہ ہے لیکن اسکی زبان ریختہ سے قریب نہ ہو کر دکھنی ہے۔

اس دور میں کئی شاعر گذرے ہیں۔ ضعیفؔی نے ''ہدایت الہند'' لکھی، خواصؔ کی مثنوی ''قصہ حسینؑ'' ہے، سیوتؔ نے مثنوی ''جنگ نامۂ محمد حنیف'' تحریر کی ہے۔ قدرتؔی نے ایک طویل مثنوی لکھی۔ جس کا نام ''قصص الانبیاؑ'' ہے اولیاؔء نے ''قصۂ ابوشحمہ'' لکھی۔ فائزؔ نے بھی ''رضوان شاہ و روح افزا'' تصنیف کی ہے۔ یہ دور ایسا تھا جس میں مذہبی تصانیف بہت لکھی گئیں۔ فائزؔ اور طبعی کے علاوہ سب نے ہی مذہبی قصے منظوم کئے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ساتویں باب میں ''دکنی روایت کا خاتمہ'' تحریر کیا ہے۔اس میں ریختہ کی ابتداء کس طرح ہوئی ہے اور دکن میں اس کا رواج کس طرح ہوا۔ یہاں ان شاعروں کا ذکر ہے۔ جنھوں نے دکنی کو ریختہ میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا۔ان میں ذوقؔی اور بحرؔی کا نام آتا ہے۔

حسین ذوقؔی کے والد حسن شوقؔی ہیں۔ذوقؔی خان محمد کے مرید تھے۔انکی دو مثنویاں سامنے آئی ہیں۔''وصال العاشقین'' اور ''نزھت العاشقین'' ان کو بحرالعرفان کا لقب ملا۔

قاضی محمد بحرؔی بھی اسی زمانے کے شاعر ہیں یہ ایک صوفی شاعر ہیں۔انھوں نے فارسی اور اردو میں تقریباً پچاس ہزار اشعار کہے ہیں اس کے علاوہ دو مثنویاں ''من لگن'' اور ''بنگاب نامہ'' بھی تحریر کیں ہیں۔بحرؔی کی زبان میں ریختہ کی جھلک نظر آتی ہے۔حالانکہ انکی زبان بنیادی طور پر دکنی ہے۔لیکن انھوں نے فارسی زبان کو بھی اپنانے کی کوشش کی ہے کئی فارسی اشعار کے ترجمے ان کے کلام میں شامل ہیں۔انھوں نے دکنی روایت کو نئی زندگی دینے کی کوشش کی ہے۔جبکہ وہ ختم ہوتی نظر آرہی ہے۔مولوی باقر آگاہ نے انکے راستے پر چلنے کی کوشش کی ہے۔یہ ولؔی دکنی کے بعد کے شاعر ہیں، ولؔی کی شاعری کا ستارہ چمکتے ہوئے دیکھ کر بھی انھوں نے اپنی راہ نہیں بدلی باقر دکنی زبان کو گلے سے لگائے رہے۔مولوی باقر ایسے تھے جو اپنا چراغ الگ جلائے بیٹھے تھے۔

فصل ششم

فارسی روایت کا نیا عروج، ریختہ

(۱۶۸۵ء - ۱۷۵۰ء)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے فصل ششم کا پہلا باب ولی دکنی کے بارے میں رقم کیا ہے۔ ولی اور ریختہ ایک دوسرے سے بالکل جڑے ہوئے ہیں۔ ریختہ کی شمع جلانے میں ولی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ وہ ریختہ کے استاد مانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ولی کے اصل نام کے سلسلے میں کئی تذکرہ نگاروں کا ذکر کیا ہے۔ کچھ نے ان کا نام ''ولی اللہ'' یا شاہ ولی اللہ'' لکھا ہے۔ کئی نے ''محمد ولی'' اور ''ولی محمد'' بتایا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب ولی محمد سے متفق ہیں۔ اسی طرح ولی کے وطن کے سلسلے میں بھی مختلف رائے ہیں۔ لیکن انھوں نے اس بات پر اتفاق کیا ہے۔ کہ ولی کے بزرگ گجرات سے ہوکر دکن آئے تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ولی کے سنہ وفات کے سلسلے میں ایک قطعۂ تاریخ وفات پیش کیا ہے۔ جس میں تاریخ وفات (۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء) نکلی ہے۔ لیکن یہ تاریخ ٹھیک نہیں ہے کیونکہ اس کے بعد ولی کے زندہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے ولی کے ہم عصر شاعر فراقی کا بھی ذکر کیا ہے۔ ولی نے فراقی کے ایک مصرعے کی تضمین بھی لکھی ہے۔ اگر ولی کا انتقال ۱۱۱۹ھ میں ہوا تو فراقی سے انکی شاعرانہ چھیڑ چھاڑ سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ ۱۱۱۹ھ میں فراقی کی عمر لگ بھگ ۲۲ سال تھی اور یہ ممکن نہیں کہ ولی اتنے کم عمر شاعر کے لئے ایسے شعر لکھیں گے۔

''تیرے اشعار ایسے نہیں فراقی
کہ جس پر رشک آوے گا ولی کوں'' [1]

اس شعر سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ولی کی یہ تاریخ وفات غلط ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ولی کی تاریخ وفات ۱۱۳۸ھ کو صحیح مانا ہے، کیونکہ وجدی نے اپنی مثنوی ''مخزن عشق'' میں ولی کو مرحوم لکھا ہے۔ یہ مثنوی ۱۱۴۴ھ میں لکھی گئی تھی ۱۱۳۲ھ میں ولی کا دیوان مرتب ہوا تھا۔ تب تک ولی زندہ تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی خود بھی کسی تاریخ سے پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں

---

[1] تاریخ ادب اردو جلد اول ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۶، ۱۹۷۷ء ص ۵۳۶

کہ ولؔی کا انتقال ۱۱۳۸ھ میں ہوا اور دوسری طرف لکھتے کہ ۱۱۳۳ھ سے ۱۱۳۸ھ کے درمیان میں ہوا بہر حال اگر فراقؔی ولؔی کے ہم عصر تھے تو پھر ۱۱۱۹ھ ولؔی کی تاریخ وفات نہیں مانی جاسکتی۔

''تاریخ ادب اردو جلد اوّل'' میں ولؔی کی شاعری پر بھی کافی بحث کی گئی ہے۔ ولؔی دکنی وہ پہلے شاعر ہیں۔ جنھوں نے دکنی ادب کو فارسی ادب میں اس طرح ڈھال دیا کہ ایک نئی روایت سامنے آئی اور ان شاعروں نے اس روایت کو خوشی خوشی اپنایا۔ جن کے لئے فارسی میں شعر کہنا مشکل تھا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ولی کو غزل میں دو طرح کا شاعر بتایا ہے۔

''۱۔ ولؔی نے شمال اور جنوب کی زبان کو ملا کر ایک ایسا ادبی روپ دیا جو بیک وقت دونوں کے لئے قابلِ قبول تھا۔ اظہار کے اس روپ نے اردو کو فارسی کی جگہ بٹھا دیا۔ اس وقت یہ سارے معاشرے کی شدید خواہش اور ضرورت تھی۔

۲۔ ولؔی نے غزل کو اس جدید زبان کے ساتھ، اپنے اظہار کا ذریعہ بنا کر، جب اس کے موضوعات میں مجازی و حقیقی دونوں پہلوؤں کو ملا کر ایک کیا۔ اور غزل کی خارجیت ''ونسوانیت'' کو دبا کر اسے داخلی جذبات و احساسات اور وارداتِ قلبیہ کے اظہار کا ذریعہ بنایا تو یہ ایک ایسی صنفِ ادب بن گئی جس میں زندگی کے ہر رنگ کے تجربات کو بیان کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی اس کے ساتھ حسن و عشق، غمِ جاناں و غمِ دوراں اردو غزل کی نئی علامتیں بن گئیں اور انسانی زندگی کے چھوٹے بڑے تجربات غزل کے دامن میں سمٹ آئے۔''[۱]

ولؔی کی غزل گوئی سے پہلے شاعری صرف عورتوں کے اطراف میں گھومتی تھی۔ ہر شاعر اپنی شاعری میں عورت کے تصوّر کا رنگ بھرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ زندگی کے کسی دوسرے رُخ کی طرف تو سوچتے بھی نہیں تھا۔ اسی لئے شاعری میں گہرائی کا احساس نہیں ہوتا۔ ولؔی نے اس کمی کو محسوس کیا۔ غزل میں گہرائی پیدا کرنے کے لئے زندگی کے مسائل اور تجربات کو اپنی شاعری میں اس طرح سمویا کہ غزل میں ایک نیا رنگ پیدا ہوگیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے قدیم روایت کی اچھائیوں کو بھی اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ بقول جمیل جالبی کے ولؔی دکنی کی شاعری میں قدیم دور کی روح بھی بول رہی ہے اور اس کے ساتھ آنے والی نسلوں کو نئے امکانات سے بھی متعارف کرا رہی ہے۔ وہ آگے لکھتے

۱۔ تاریخ ادب اردو جلد اول ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۶، ۱۹۷۷ء ص ۵۴۱

ہیں کہ ولی محبوب کا سراپا بیان کر رہا ہے تو اس میں خارجیت کے ساتھ ساتھ داخلیت بھی شامل ہوگئی ہے۔ غزل کی یہ روایت جو آئیندہ دور میں اپنے عروج کو پہونچی، اس کا سرچشمہ ولی کی غزل ہے۔ جتنے مضامین اردو غزل سے وابستہ ہیں۔ وہ سب ولی کے ہاں ملتے ہیں۔ اسی لئے ولی کا نام اپنی اولیت اور روایت کے بانی کی حیثیت سے ہمیشہ سرفہرست وزندہ رہے گا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ولی کی شاعری میں وفاداری کے پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ ولی کی غزل کا عاشق اپنے محبوب کے ساتھ پوری طرح وفادار ہے وہ اپنے محبوب کے ساتھ کھلواڑ نہیں کرتا۔ یہی وجہ کہ وہ اپنی ہی آگ میں جلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس تڑپ نے انکی شاعری میں شائستگی اور گہرائی پیدا کردی ہے۔ ولی کے یہاں فارسی و ہندوی روایت نے ایک تال میل بنالیا ہے۔ انھوں نے اپنے عشقِ مجازی کو ہندا یرانی روایت کے مطابق ڈھالا ہے۔ ولی نے عشقِ حقیقی پر بھی غزلیں لکھی ہیں۔ غزل جو عیش تک محدود تھی۔ اسکا دامن اتنا وسیع کردیا کہ اس میں ہر رنگ کے پھول کھل گئے اور ایک نیا انداز اردو غزل کو میسّر ہوگیا۔ ولی جن فارسی شاعروں سے متأثر تھے۔ ان میں انوریؔ، جامیؔ، جمالیؔ، عُرفیؔ، خاقانیؔ، فردوسیؔ، ہلالیؔ، فیضیؔ، قدسیؔ، طالبؔ، شیداؔ، خسروؔ، صائبؔ اور شوکت وغیرہ ہیں۔

ولی نے غزل کے علاوہ قصیدے، ترکیب بند اور ترجیع بند بھی لکھے ہیں اور قطعات بھی لکھے ہیں۔ انھوں نے فارسی محاوروں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ اس کا اثر میرؔ و سوداؔ، ناسخؔ و آتشؔ، میرحسنؔ وانیسؔ اور غالبؔ و اقبالؔ نے بھی قبول کیا۔

> ڈاکٹر جمیل جالبی نے ولی کے قصائد کے بارے میں لکھا ہے۔ ''ولی کے قصیدے طویل نہیں ہیں اور نہ ان میں مشکل بحروں میں طبع آزمائی کر کے قادرالکلامی دکھائی گئی ہے البتہ اچھوتے خیالات، شوکتِ الفاظ اور زورِ طبیعت کے اوصاف سے ان کے قصیدے ضرور معمور ہیں۔''[1]
>
> ولی کے قصائد کے سلسلے میں ڈاکٹر اعجاز حسین تھوڑی الگ رائے رکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔ ''ولی کے قصائد پر نظر کرنے سے حیرت ہوتی ہے۔ کہ اس عہد میں جب زبان ابتدائی حالت میں تھی۔ کیونکر انہوں نے اتنے زوردار قصیدے کہے ہوں گے۔ جتنی خوبیاں قصیدے میں ہونی چاہیئے۔ وہ سب موجود ہیں۔ شوکت

---

[1] تاریخ ادب اردو جلد اول ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۶، ۱۹۷۷ء ص ۵۵۶

الفاظ بھی ہے زور بھی ہے اور مشکل زمین کے ہوتے ہوئے روانی بھی بہت ہے۔
ان کے قصائد میں محاکاتی عنصر بھی خوبی کے ساتھ قلم بند ہوئے ہیں۔‘‘[1]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے چاسر سے ولیؔ کی مثال دی ہے جس طرح چاسر نے فرانسیسی زبان وادب سے انگریزی زبان وادب کو ایک نیا معیار دیا۔ اسی طرح ولیؔ نے بھی فارسی کی مدد سے اردو ادب کو ایک نیا رنگِ سخن عطا کیا۔ محمد حسین آزاد ’’آبِ حیات‘‘ میں ولیؔ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

’’انھیں ہندوستان کی نظم میں وہی رُتبہ ہے۔ جو انگریزی کی نظم میں چاسر شاعر کو۔ اور فارسی میں رودکی کو۔ اور عربی میں مہلہل کو۔ وہ کسی کے شاگرد نہ تھے۔ اور یہ ثبوت ہے فصیح عرب کے قول کا کہ الشعراءُ تلا میذ الرّحمٰنِ اسی کو دانائے فرنگ کہتا ہے کہ شاعر اپنی شاعری ساتھ لیکر پیدا ہوتا ہے۔‘‘ [2]

ولیؔ ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے زبان کا ارتقا دکھنی سے ریختہ کی طرف اور ریختہ سے اردوئے معلّٰی کی طرف کیا ہے۔

فصل ششم کا دوسرا باب ’’معاصرینِ ولیؔ اور بعد کی نسل‘‘ ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ولیؔ کے معاصر شعراء اور شاعری میں ولیؔ کے عطا کئے ہوئے نئے معیار کا ذکر کیا ہے۔ ولیؔ کی آواز پورے ہند میں پھیل گئی اور اسکی پیروی جن شاعروں نے کی ہے۔ ان میں سب سے پہلا نام سید محمد فراقی ہے۔ اس کا ذکر خود ولیؔ نے اپنے شعروں میں کیا ہے۔ فراقیؔ بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے لیکن انھوں نے دکنی زبان میں بھی شاعری کی ہے۔ انکی زبان کافی صاف ہے اور ریختہ کا گہرا اثر ہے۔ انھوں نے دو قسم کے موضوع کو اپنی غزل میں سمویا ہے ایک عشقیہ اور دوسری قسم ناصحانہ ہے انھوں نے ایک طویل مثنوی لکھی ہے۔ ’’مراۃ الحشر‘‘ یہ طویل مثنویوں میں شمار ہوتی ہے۔ فراقیؔ ایک ایسے شاعر ہیں۔ جنھوں نے شاعری کی روایت کو دہلی میں مقبول عام کیا۔

انکے بعد فقیر اللہ آزاد کا ذکر آتا ہے۔ انکے زمانے میں شاعر ریختہ میں شاعری کر رہے تھے لیکن ایہام کا شاعری میں گذر نہیں تھا۔ جبکہ ریختہ کے لئے ایہام اہم جزو ہے۔ اس زمانے کے زیادہ تر شاعر ولیؔ کی پیروی کر رہے تھے۔

ولیؔ کے بعد آنے والے شعراء میں مرزا داؤد بیگ کا نام اہم ہے۔ داؤد اورنگ آبادی

---

[1] مختصر تاریخ ادب اردو، اعجاز حسین اردو کتاب گھر دہلی ۶ ص ۳۴
[2] آبِ حیات، محمد حسین آزاد اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ ۱۹۹۸ء، ۸۳

صاحب دیوان شاعر ہے۔ انھوں نے خود کو ولی ثانی کہا ہے۔ کیونکہ انھوں نے شاعری میں ولی کی پوری طرح سے پیروی کی ہے۔ انکی زمین پر کئی غزلیں بھی تصنیف کی ہیں۔ ولی کو وہ اپنا استاد مانتے تھے لیکن انکے یہاں تنوع نہیں ہے۔ جو ولی کے کلام کا خاصہ ہے انکی شاعری میں صنعتِ ایہام کا بہت استعمال کیا گیا ہے۔ داؤد نے ریختۂ ولی کو مقبول کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

ولی کے بعد کے شعراء میں سید سراج الدین سراج اورنگ آبادی کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے انکی شاعری پر کافی تفصیلی بحث کی ہے سراج نے اردو شاعری میں اپنی ایک پہچان بنائی تھی۔ انکے عشق میں بے خودی اور سرشاری کا عالم ہے۔ فارسی زبان کے استعمال نے شاعری کو پر اثر بنا دیا۔ انھوں نے زیادہ تر عشق مجازی پر ہی شعر کہے ہیں۔ انکا محبوب ایک جیتا جاگتا انسان ہے۔ عشق نے انکی شاعری کو شگفتگی اور موسیقیت کا احساس بخشا اسی لئے وہ ولی سے بہتر شاعر مانے جاتے ہیں۔

> بقول جمیل جالبی کے ''پوری اردو شاعری کے پسِ منظر میں سراج کی شاعری کو رکھ کر دیکھا جائے تو وہ اردو شاعری کے راستے پر ایک ایسی مرکزی جگہ کھڑے ہیں۔ جہاں سے میر، درد، مصحفی، مومن، غالب اور اقبال کی روایت کے راستے صاف نظر آرہے ہیں۔'' آگے لکھتے ہیں ''سراج کے کلام میں ولی سے زیادہ اچھے عشقیہ اشعار کی تعداد ملے گی اور اگر اس تعداد کا مقابلہ دوسرے بڑے شاعروں کے اچھے اشعار کی تعداد سے کیا جائے تو سراج یہاں بھی ہمیں مایوس نہیں کرتے۔''[۱]

سراج نے عشق کے علاوہ صوفیانہ اخلاقی اور فلسفیانہ کلام بھی لکھا ہے۔ اپنے کلام کے ذریعے مذہب کو پھیلانے میں مدد کی ہے۔ سراج کی شاعری ہمیشہ زندہ رہے گی۔ انھوں نے اردو شاعری کو نیا معیار عطا کیا وہ عشقیہ روایت کے بانی ہیں۔

سراج کے معاصر شعراء میں شاہ قاسم علی قاسم کا نام آتا ہے۔ یہ ایک اچھے شاعر تھے انکے زمانے میں فارسی کا رواج کم ہونے لگا۔ اس زمانے کے شاعر ریختہ کو اپنا رہے تھے اور ایک زمین میں غزلیں لکھ رہے تھے۔ قاسم نے اپنے دور کے رنگِ سخن کو اپنایا۔ انھوں نے ولی کی روایت کو آگے بڑھایا۔ یہ غزل کے شاعر ہیں۔ مخمس اور ترجیع بند بھی لکھے ہیں۔ زبان میں صفائی اور شائستگی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ''تاریخ ادب اردو'' جلد اوّل میں چھ فصلوں کے بعد ایک اختتامیہ پیش

---

[۱] تاریخ ادب اردو جلد اول ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۷،۶ ۱۹۷ء ص ۵۷۳۔ ۵۷۴

کرتے ہیں۔ اس میں پوری کتاب کالبِّ لُباب ہے۔ خاص کر اردو زبان کو اہمیت دی ہے۔ انھوں نے اردو کی تاریخ بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ اس زبان کی ابتداء مسلمانوں سے ہوئی ہے۔ جب مسلمان ہندوستان آئے تو انھوں نے اپنے مقصد کے لئے اس کو اپنایا اور اس میں اپنی زبان کے الفاظ بھی شامل کردیئے۔ صوفیاء کرام نے اپنی بات کو عوام تک پہونچانے کے لئے اس کو اپنایا۔ یہ زبان ایسی جگہ زیادہ پھلتی پھولتی نظر آتی ہے۔ جہاں مختلف بولیاں بولنے والے آپس میں میل جول بڑھا رہے تھے۔ یہ عمل ہندوستان کے ہر صوبہ میں ہورہا تھا۔ اسی لئے اردو زبان ہر علاقہ کی زبان سے مشابہت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمود شیرانی نے اس کو پنجاب کی زبان کہا ہے اور محمد حسین آزاد نے اس کا رشتہ برج بھاشا سے جوڑ دیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اختتامیہ کے بعد ضمیمے بھی پیش کئے ہیں۔ اس میں پاکستان کے ان چند حصّوں کا ذکر ہے۔ جن میں اردو نے بھرپور پرورش حاصل کی ہے۔ سب سے پہلے پنجاب کا نام آتا ہے جس سے اردو کا گہرا رشتہ ہے۔ اردو زبان کی تاریخ جب جب لکھی جائے گی۔ پنجاب کا نام ضرور آئے گا۔ ڈاکٹر جالبی نے اس حصّے میں انکا جائزہ لیا ہے۔ جو لوگ پنجاب سے پورے برعظیم میں پھیل گئے اور وہ لوگ جو پوری زندگی پنجاب میں مقیم رہے۔ ان لوگوں نے اردو زبان کو کس طرح پھیلنے میں مدد کی کس طرح اس کو پروان چڑھایا۔ پنجاب اور سرحد کے علاقے ایسے تھے جہاں سے مسلمان گذرتے تھے اور انکا یہاں کے مقامی لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ باہر سے آنے والی قوموں کی تہذیب وتمدّن اور انکی زبان کا اثر یہاں کے لوگ قبول کرنے لگے۔ صرف مسلمانوں کی ہی روایت کو نہیں اپنایا بلکہ یہاں آنے والی ہر قوم کا اثر قبول کیا۔ چاہے وہ دراوڑ ہوں یا منڈا نامی قبائل ہو یا یونانی ہوں۔ آج بھی پنجاب میں ان قوموں کے الفاظ شامل ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو کا مولد پنجاب بتایا ہے انھوں نے قدیم اردو کے ان مخطوطات کا ذکر کیا ہے۔ جو ۱۹۲۰ء کے بعد شائع ہوئے ہیں۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پنجاب اور اردو میں ماں بیٹی کا رشتہ ہے۔ لیکن انھوں نے ان مخطوطات کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ انھوں نے ان ادیبوں شاعروں اور بزرگوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اس قدیم اردو کو اپنایا اور پروان چڑھایا جو پنجابی سے مشابہت رکھتی ہے۔ ان لوگوں میں قطب عالم، شاہ عالم عرف شاہ منجھون، شاہ باجن، قاضی محمود دریائی، شاہ علی محمد جیو گام دھنی، خوب چشتی، میرانجی شمسی العشاق اور سید شاہ اشرف بیابانی

وغیرہ شامل ہیں۔ دکن کے ان شاعروں کا بھی ذکر ہے۔ جنھوں نے پنجابی لب و لہجہ اختیار کیا۔ برہان الدین جانم، مرزا مقیم، مقیمی، ملک خشنود، دولت شاہ، رستمی، شاہ داول اور امین الدین اعلی وغیرہ محمد قلی قطب شاہ اور ملا وجہی اور ابن نشاطی کے یہاں بھی پنجابی رنگ محسوس ہوتا ہے۔ کلیاتِ ولی میں بھی یہ رنگ نظر آتا ہے۔انھوں نے خالص پنجابی شعراء کے کلام کی بھی مثالیں دی ہیں۔ان میں شاہ حسین، بابا فرید گنج شکر، عبداللہ عبدی، سلطان باہو، شاہ اشرف، صدیق لالی، سید بلھے شاہ اور وارث شاہ شامل ہیں۔

آگے ان لوگوں کا ذکر ہے جنھوں نے اردو کو پنجاب سے نکال کر ملک کے ہر گوشے تک پہونچا دیا اس زبان کے ارتقاء میں مدد کی ان میں مسعود سعد سلمان، بابا فرید گنج شکر، شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی، گرونانک، شاہ حسین شیخ بہاالدین برناوی، شیخ عثمان جالندھری، افضل پانی پتی، مولانا غنیمت کنجاہی، ناصر علی سرہندی، شاہ مراد، میر جعفر زٹلی، شیخ ابوالفرح محمد فاضل الدین بٹالوی، بلھے شاہ، مراد شاہ، عزیز الدین اشرف نوشاہی اور وارث شاہ بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے پنجاب کی طرح سندھ میں اردو کا بھی جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے کئی مورّخوں کا ذکر کیا ہے۔جن سے اس زمانے کی زبان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اصطخری نے سندھ میں بولی جانے والی ایک ایسی زبان کا ذکر کیا ہے۔ جو دو زبانوں سے مل کر وجود میں آرہی تھی۔سندھ کے ایک منصورہ کا بھی ذکر ہے۔ جہاں سندھی اور عربی بولی جارہی تھی۔

عرب سپہ سالار محمد بن قاسم نے سندھ پر فتح حاصل کرلی تھی۔اس لئے یہاں عربی اور فارسی زبان کا استعمال کثرت سے ہورہا تھا۔ان دونوں کے اشتراک سے ایک نئی زبان وجود میں آرہی تھی۔اس نئی زبان نے دوسو سال بعد اتنی ترقی کرلی کے اس میں شاعری بھی ہونے لگی۔

شیخ فرید بھکری کے کچھ جملے حوالے کے طور پر دیئے گئے ہیں۔جن میں سندھ میں بولی جانے والی قدیم اردو کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔بھکری نے ''ذخیرہ الخواتین'' کے نام سے مغلیہ دور کے مشہور لوگوں کے حالات مرتب کئے تھے یہ جملے اسی کتاب سے لئے گئے ہیں۔

سندھ میں شاعری سے زیادہ دوہوں کا رواج تھا۔سید ابوالقاسم اور سید ابوالمعالی نے دوہے لکھے۔جو سندھ، ملتان اور راجستھان میں مشہور ہوئے۔ مسیح الاولیاء نے دوہے لکھے۔سب سے پہلے

شاہ عبدالکریم بلڑئی والے نے کبیر کے دوہوں کی طرز پر دوہے لکھے۔ ان کے بعد شاعری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سید ثابت علی نے سندھی اور سرائیکی زبان میں شاعری کی ان کے خلیفہ گل محمد نے با قاعدہ سندھی زبان میں دیوان مرتب کیا اور انکی پیروی کرنے میں سچل سرمست اور عبدالحکیم ٹھٹھوی کا نام بھی آتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے سندھ کو علم وادب کا مرکز بتایا ہے۔ اور ان شعراء کا ذکر کیا ہے۔ جنھوں نے فارسی کے ساتھ اردو میں بھی شاعری کی ہے۔ ان میں ملاّ عبدالحکیم عطا، حفیظ الدین علی، جعفر علی بینوا، محمد سعید راہبر، عبدالجلیل بلگرامی، غلام علی آزاد بلگرامی، میر محمد صابر، معین الدین تسلیم و بیراگی، حیدرالدین کامل، خود صاحب مقالات الشعراء میر علی شیر قانع، پرسرام مشتری، آفتاب رائے رسوا، حسام الدین حسام لاہوری، میر سید محمد شاعر بلگرامی، حکیم میر اسداللہ خاں غالب اور عبدالسبحان فائز ہیں۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی ایسے شاعر ہیں۔ جنھوں نے پنچ میل زبان استعمال کی ہے۔ اس میں پنجابی، بلوچی، سرائیکی، کچھی، لاڑی، تھریلی، بروہی، راجستھانی اور اردو ہندی شامل ہیں۔ اسی لئے انکا کلام مشکل لگتا تھا۔ انھوں نے اپنے کلام کو سروں کے ساتھ مرتب کیا۔ نویں صدی ہجری کے اوائل میں کچھ ایسے شاعر سامنے آئے جنھوں نے درِ مقامِ رام کلی، در پردۂ بلاول، دردھنا سری، درمقام سیارنگ، درمقامِ توڑی، درمقام کدادہ وغیرہ لکھا۔ یہ کلام صوفیانہ ہوتا تھا۔ اور اس میں عشق کی گرمی پیش کی جاتی تھی۔ یہی روایت دکن کے شاعر میرانجی شمس العشاق کے کلام میں ملتی ہے اور جانم، شاہ داول، امین الدین اعلی اور گروہ گرنتھ صاحب کے یہاں بھی ملتی ہے۔ ان شاعروں کا بھی ذکر ہے۔ جنھوں نے اردو روایت کو آگے بڑھایا ان میں عبدالحکیم ٹھٹھوی، شیخ ورو، میر حیدرالدین کامل، میر حفیظِ الدین علی، میاں محمد سرفراز عباسی اور روحل خاں روحل یہ وہ شاعر ہیں جن کا نام تذکروں میں آیا ہے۔

اردو شاعری کی روایت ان تمام شاعروں کی بدولت ہر دور میں سندھ میں پروان چڑھی اور آج بھی اردو سندھ میں بولی اور لکھی جاتی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک عنوان لسانی اشتراک کے نام سے قائم کیا ہے۔ اس میں اردو کی قواعد بیان کی ہے جو تقریباً اردو، پنجابی، سرائیکی اور سندھی میں ایک ہی ہے۔ اردو کی خاصیت ہے کہ

اس نے اندرونی اور بیرونی زبانوں کو اپنے اندر ضم کر لیا اور حد تو یہ ہے کہ اردو گرامر اور دوسری زبانوں کی گرامر بھی کافی مشترک ہے۔ مثال کے طور پر جو گرامر پیش کی گئی ہے۔ وہ مصدر، تذکیروتانیث، اسمایا اسمائے صفات، اضافت، ماضی مطلق اور مضارع ہیں ان قواعد کو سامنے رکھ کر اردو، پنجابی، سرائیکی اور سندھی کی گرامر کو ملا کر دیکھا گیا ہے۔ اس میں کافی حد تک اشتراک ہے۔ گرامر کے مشترک ہونے کی وجہ زبانوں کا میل جول تھا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے سرحد میں اردو روایت کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ اردو زبان سرحد کے علاقے میں اس وقت سے سامنے آتی ہے۔ جب ایرانیوں نے ہندوستان پر حملے کرنے شروع کئے اس کی شروعات محمود غزنوی نے کی تھی۔ صوبۂ سرحد کے اہلِ علم اردو کی جنم بھومی سرحد کو مانتے ہیں۔

ہندوستان میں پٹھان قوم ہر طرف موجود ہے۔ اور انکی وہی نسلی خصوصیات ہیں، جو سرحد کے پٹھانوں میں پائی جاتی ہیں۔ سرحد سے صرف عام انسان ہی نہیں آئے بلکہ علاؤالدین خلجی کا خاندان، لودی خاندان، شیر شاہ سوری وغیرہ اسی علاقے سے آئے۔ اس کے علاوہ خواجہ معین الدین چشتی قطب الدین بختیار کا کی، مجدد الف ثانی یہاں سے ہر طرف گئے اور اپنے علم کی روشنی سے پورے ملک کو منور کیا۔ اسی لئے اردو زباں مین پشتوں کے الفاظ شامل ہیں، پٹھان ادباء، شعراء اور مصنفین نے اردو زبان کی بہت خدمت کی ہے۔ اسکی بہترین مثال بایزید انصاری کی ''خیر البیان'' ہے۔ پشتو کا پہلا شاعر خوشحال خاں خٹک ہے۔ اس نے پشتو کو رسم الخط بھی دیا ہے اسکا کلام پشتو میں ہونے کے باوجود اپنے اندر فارسی بحور و اوزان اور اردو زبان کی شیرینی رکھتا ہے۔

عبدالرحمٰن بابا بھی اسی زمانے کے شاعر ہیں۔ مگر انھوں نے پشتوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی شاعری کی انکے کلام میں فارسی کا اثر کافی گہرا ہے۔

قاسم علی خاں آفریدی بھی صوبۂ سرحد کا شاعر ہے۔ اس کے کلام میں سادگی اور شیریں بیانی ہے۔ انکا کلام کافی ضائع ہوگیا۔ انکے ہی زمانے کے شاعر مولوی محمد عثمان قیس بھی ہیں اور انکے علاوہ ایک اور شاعر کا ذکر ہے۔ حیدر پشاوری انھوں نے آٹھ دیوان مرتب کئے یہ بات انکے ایک شعر سے پتہ چلتی ہے کیونکہ انکے دیوان محفوظ نہیں رہ سکے۔ سوائے چند غزلوں کے جن سے انکی قادرالکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاعروں کا کلام محفوظ نہ ہونے کی اصل وجہ صوبۂ سرحد کی فضا تھی۔ جہاں ہر طرف

انتشار پھیلا ہوا تھا۔ کیونکہ زیادہ تر فاتحین یہاں سے گذر کر جاتے تھاے۔ جن کی وجہ سے یہاں انقلاب آتے رہتے تھے۔ جو پورے ماحول کو تباہ کر دیتے تھے۔ لیکن انیسویں صدی کے درمیان سے یہاں امن قائم ہوئی اور شعر و ادب کا دریا موج زن ہو گیا۔

آخر میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے بلوچستان کی اردو روایت بیان کی ہے۔ یہاں کی خاصیت ہے کہ یہ لوگ دوسروں کی زبان آسانی سے سیکھ لیتے ہیں۔ کیونکہ یہاں مختلف زبانیں بولنے والوں کا گذر رہا ہے۔ اور بلوچستان کے مقامی لوگ ہر طرح کے لوگوں سے واسطہ رکھتے تھے۔ اس لئے آسانی سے ان کی زبان کو اپنا لیا۔ لیکن یہاں کی ایک کمزوری ہے کہ ادبی روایت کو اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔ کیونکہ یہاں کے لوگ زیادہ تر خانہ بدوشی کی زندگی گذارتے تھے۔ انکی اپنی ایک الگ دنیا ہوتی تھی۔

بلوچستان میں ادب کی روایت کمزور ضرور ہے مگر ایسا نہیں ہے کہ بالکل نام ونشان نہ ہو قدیم بلوچی شاعری میں انسانی رشتوں کو سمجھنے کے خوبصورت نمونے پیش کئے گئے ہیں، جو دوسری جگہوں پر مشکل سے ملتے ہیں۔ پاکستان کی جتنی بھی زبانیں ہیں۔ سب میں کچھ باتوں میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ اسلامی عقائد کو بیان کرنے کے لئے جو الفاظ پیش کئے گئے ہیں۔ وہ مشترک ہیں۔ فارسی زبان کے الفاظ تلمیحات، رمزیات، بندش، اور تراکیب پاکستانی زبانوں میں مشترک ہے۔ اردو کے تقریباً پانچ سو الفاظ ایسے ہیں جو اظہار کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔ وہ بھی مشترک ہیں۔ اس سے سب زبانوں میں آپس میں گہرا رشتہ بن گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بلوچی زبان کو ایرانی زبان کی شاخ بتایا ہے۔ کیونکہ اس میں فارسی الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ ہمایوں بادشاہ نے شکست کھا کر ایران جاتے ہوئے بلوچستان میں پناہ لی تھی۔ اس لئے یہاں سے ایرانیوں کا ایک تعلق بن گیا تھا۔ بلوچستان میں اس دور میں جو رزمیہ نظمیں لکھی گئیں ان میں اردو زبان کا بہت گہرا اثر ہے۔

بلوچستان میں اردو روایت کا باقاعدہ آغاز اٹھارویں صدی عیسوی میں ہوا اس وقت عام بول چال کی زبان اردو تھی۔ انگریزوں کے زمانے میں دفتروں کی زبان اردو تھی۔ اخبارات اور خط و کتابت بھی اردو میں ہونے لگی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں اردو کا چرچا عام ہو گیا، اسکی مثال نائب محمد حسن براہوئی کا

اردو دیوان ہے۔ انکے کلام میں فارسی کا اثر ہے۔ زبان صاف اور سادہ ہے انکے کلام سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان سے پہلے بھی کچھ شاعر گذرے ہونگے کسی وجہ سے انکا کلام محفوظ نہ رہ سکا۔

انکے بعد جو شاعر گذرے ان میں انکے صاحبزادے میر مولا داد خاں، سردار خیر بخش مری، سید عابد شاہ عابد، سید غلام علی الماس، عبدالحق زبور، یوسف عزیز مگسی اور پیر بخش وغیرہ شامل ہیں۔ یہ انیسویں اور بیسویں صدی کے شاعر تھے، جو بلوچستان میں اردو زبان میں شاعری کر رہے تھے۔

تاریخ ادب اردو اٹھارویں صدی

جلد دوم حصّہ اوّل

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو جلد دوم حصّہ اول دو حصّوں پر مشتمل ہے پہلے حصّے میں پیش لفظ کے بعد تمہید ہے۔ جس میں دو باب ہیں اور پانچ فصل ہیں۔ دوسرے حصے میں فصل پنجم، چوتھے باب سے نویں باب تک ہے اور پھر فصل ششم ہے۔ اس کے بعد اشاریہ، اشخاص، مقامات اور متفرقات شامل ہیں۔

پہلے باب کا عنوان "اٹھارویں صدی: سیاسی منظر، طرزفکر، تہذیبی و معاشرتی رویے" ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس حصے میں مغلوں کی اٹھارویں صدی کے اس وقت کے حالات پیش کئے ہیں۔ جب اورنگ زیب عالم گیر کی بادشاہت تھی۔ برعظیم کی تاریخ میں ایسی عظیم سلطنت وجود میں نہیں آئی تھی۔ جس میں اتحاد اور ایک نیا قومی تصور دیا تھا۔ لیکن اورنگزیب کی وفات کے بعد کمزور اور نااہل جانشینوں نے سلطنت کو نقصان پہونچایا۔ قومی اتحاد ختم ہوگیا۔ اس کی جگہ خانہ جنگی اور عیش پرستی آگئی۔ اس سے بھی بڑا نقصان فرخ سیر کے دور حکومت میں پہونچا۔ بادشاہ نے خوش ہوکر ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارتی مراعات دے دیں۔ انھوں نے بنگال میں اپنی جڑیں جمانی شروع کردیں۔ جب محمد شاہ رنگیلا کا زمانہ آیا تو مغلیہ سلطنت بالکل بکھر گئی اسی زمانے میں احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ادھر بنگال میں انگریزوں نے پوری طرح سے قبضہ کرلیا۔ اٹھارویں صدی کے حالات سے معاشرے پر یہ اثر ہوا۔ فرد کے کردار میں بحران پیدا ہوگیا اچھائی برائی کی تمیز ختم ہوگئی۔ حکمران کے اندر قوت عمل تقریباً ختم ہوگیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے خیال میں

> "اٹھارویں صدی کی ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس نئی بنتی ہوئی تہذیب کا رخ عوام کی طرف ہے۔ علم و ادب، جواب تک فارسی زبان کے تعلق سے خواص کی جاگیر تھا۔ نئی زبان کے ابھرنے اور اہمیت اختیار کرنے کے ساتھ ہی عوام بھی اس میں شریک ہوجاتے ہیں۔ اور فارسی زبان اس کا ادب اور اس کے اسالیب و اصناف نئی زبان میں جذب ہونے لگتے ہیں۔ اس صدی کے ختم ہونے سے پہلے ہی اردو زبان نہ صرف فارسی کی جگہ لے لیتی ہے بلکہ ادبی زبان بن کر برعظیم سے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل جاتی ہے۔"[1]

---

[1] تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۱۳ - ۱۴

دوسراباب اردوشاعری: رواج، کشمکش، اثرات، محرکات ومیلانات کے نام سے ہے۔
ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

''اسی زمانے میں اردو سرکاری دربار کی غیر سرکاری زبان بن کر قلعہ معلیٰ میں باقاعدہ رائج ہوگئی۔ جلد ہی اس کا ٹکسالی روزمرہ محاورہ عوام خواص کے لئے مستند بن گیا اور قلعہ معلیٰ کی اردو اردوئے معلیٰ کہلانے لگی۔''[۱]

اس زمانے کے شاعروں میں آبرو، ناجی، یکرنگ وغیرہ شامل ہیں۔ عالم گیر ثانی خود اردو کا شاعر تھا۔ اس زمانے کے نوجوان شعراء نے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ چاہے جتنی بھی کوشش کرلیں مگر وہ ایرانی شعراء کی فارسی زبان کے معیار تک نہیں پہونچ سکتے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اردو زبان کو اپنانا شروع کیا۔ محمد شاہ کا جب دوسرا سال جلوس تھا تو دیوان وؔلی دلی پہونچا۔ یہ دیوان ریختہ میں تھا۔ اس کی زبان تو اردو میں تھی مگر بندش، تراکیب، استعارات فارسی سے اپنایا تھا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس باب میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ اردو زبان کو فارسی زبان وادب سے کافی فیض حاصل ہوا۔ کیونکہ اردو زبان نے فارسی کی ادبی روایت کو اپنے اندر جذب کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ قصیدہ، غزل، مثنوی، مرثیہ، اور رباعی قطعہ یہاں تک کہ صوفیانہ شاعری بھی فارسی ہی سے اردو میں آئی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے چند اشعار بھی اس باب میں پیش کئے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کس حد تک فارسی زبان نے اردو زبان پر اثر ڈالا۔ اور کس کس طرح سے اردو زبان پروان چڑھی۔

فصل اوّل

شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدائی روایت

پہلا باب: (الف) مذہبی شاعری

(ب) لسانی خصوصیات، شمال ودکن کی زبانوں کا فرق۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس حصّے میں شمال ودکن کی اردو شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ مغلوں نے جب دکن پر فتح حاصل کرلی تو دکن پر جو سیاسی، معاشرتی، تہذیبی ولسانی اثرات ہوئے اس نے اردو زبان کو پروان چڑھنے میں مدد کی اور شمال وجنوب کو بھی آپس میں جوڑ دیا۔ شمال کی زبان دکن میں اپنائی گئی۔ ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، امین گودھری اور آبرو ناجی، مضمون کی زبان میں دکنی اور شمالی کا زیادہ فرق نہیں رہا۔

---

[۱] تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۲۱

اٹھارویں صدی میں مذہب میں مجلسوں، نذر، نیاز اور میلاد کا چلن ہوگیا۔ شاعری میں بھی ایسی نظمیں ملتی ہیں۔ مثلاً میلاد نامے، معراج نامے پندنامے یا شہادت نامے، وفات نامے اور جنگ نامے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس دور کے جب شاعروں کا تذکرہ کیا ہے ان میں روشن علی روشن نے ''عاشور نامہ'' لکھا ہے۔ انھوں نے اپنی زبان کو ہندوی کہا ہے۔ جو آج اردو کے نام سے جانی جاتی ہے۔ عاشور نامہ کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں عوام کی زبان استعمال ہوئی ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس وقت ترکی عربی اور فارسی الفاظ کس طرح بولے جاتے تھے۔

الف کے بعد (ب) میں لسانی خصوصیات، شمال و دکن کی زبانوں کا فرق آتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے۔

> ''شاہ حاتم نے ۱۱۶۹ھ/۵۶-۱۷۵۵ء میں جب ''دیوان زادہ'' کا دیباچہ لکھا تو بتایا کہ اردو میں فارسی فعل وحرف کو استعمال کرنا صحیح نہیں ہے۔ لیکن یہ تقریباً نصف صدی بعد کی بات ہے۔ حاتم کے ''دیوان قدیم'' میں خود اس کی مثالیں مل جاتی ہیں۔''[۱]

سید اعجاز حسین نے بھی ''مختصر تاریخ ادب اردو'' میں حاتم کے ''دیوان زادہ'' کے بارے میں لکھا ہے۔

> ''اس دیوان زادہ میں حاتم نے چند الفاظ ترک کر دیئے ہیں۔ جو ان کے دیوان قدیم میں پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ الفاظ اردو میں غیر مانوس نظر آتے تھے۔ ان الفاظ سے بھی گریز کیا ہے۔ جو اصلاً عربی تھے۔ لیکن تلفظ اور لہجے کے لحاظ سے ہندی ہو گئے تھے۔ مثلاً تسبیح کو تسبی و صحیح کو صحی لکھنا حاتم نے صحیح نہیں سمجھا۔ عربی فارسی کے حروف جو اردو میں دیئے تھے، ان کو بھی مناسب سمجھ کر ترک کر دیا۔ حاتم نے ہندی کے بھی ثقیل الفاظ اردو میں استعمال کرنے سے گریز کیا۔''[۲]

اعجاز حسین کے حوالے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاتم نے عربی کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ کو بھی ترک کر دیا تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان الفاظ کو اشعار کی مثالیں دے کر سمجھایا ہے۔ دکن اور شمالی ہند کے مرثیہ گو کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہر مرثیہ گو کے نام کے سامنے انکے اشعار بھی لکھے گئے ہیں۔ شمال کے مرثیہ گو صلاح، قربان علی، صادق، ہدایت، غلام سرور اور لاعلم ہیں دکن کے مرثیہ گو احمد، اشرف، اکبر، روحی، مرزا، مریدی قادر شامل ہیں۔

اب دوسرا باب جس میں رزم نامے آتے ہیں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان شاعروں کا تذکرہ کیا جنھوں نے

---

۱ تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۵۳ - ۵۴

۲ مختصر تاریخ ادب اردو سید اعجاز حسن، اردو کتاب گھر دہلی ص ۵۹

رزم نامے لکھے ہیں۔ رزمیہ نظم کافی طویل ہوتی ہے اس میں شاعر ایسی جنگ کے حالات بیان کرتا ہے جس کا وہ خود شاہد ہوتا ہے یا پھر وہ جنگ کے حالات اس نے کسی معتبر راوی سے سنے ہوں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

''یونانی شاعر ہومر کی نظمیں ایلیڈ اور اوڈیسی یورپ کے ادب میں شاہکار رزمیہ نظمیں شمار ہوتی ہیں۔ مشرق کے ادب میں مہابھارت اور شاہنامہ فردوسی اس ذیل میں آتی ہیں۔ نصرتی نے ''علی نامہ'' میں علی عادل شاہ ثانی کی جنگوں اور دس سالہ دورِ حکومت کو موضوع سخن بنایا ہے۔ حسن شوقی نے ''فتح نامہ نظام شاہ'' میں جنگ تالیکوٹ (۹۷۲ھ/۱۵۶۵ء) کو موضوع سخن بنایا ہے۔''[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس باب میں نظموں کا تفصیلی ذکر کیا ہے وہ دو رزمیہ نظمیں ہیں جنگ نامہ عالم علی خاں اور وقائع ثنا۔ عالم علی خاں میں نواب آصف جاہ، نظام الملک اور عالم علی خاں کی ایک جنگ کو موضوع سخن بنایا ہے۔ یہ شاعر غضنفر حسین کی بیانیہ نظم ہے۔ اس کے کچھ اشعار بھی پیش کئے گئے ہیں۔ وقائع ثنا۔ سید زاہد ثنا کی نظم ہے اس میں پانی پت کی تیسری جنگ کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے۔

''وقائع ثنا شمالی ہند کا پہلا معلوم رزم نامہ ہے جس میں تفصیل سے تیسری جنگ پانی پت کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔''[۲]

تیسرا باب ''طنز و ہجو کی روایت: جعفر زٹلی'' کے عنوان سے ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے جعفر زٹلی کے نام، حالات زندگی اور شاعری پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اٹھارویں صدی کے شروع میں شمالی ہند کے شاعروں میں انکا شمار ہوتا ہے۔ جعفر زٹلی نے طنز و ہجو کی شاعری میں زیادہ شہرت حاصل کی۔ انکی کلیات میں ایک ہجو فرخ سیر کا سکہ'' کتخدائی میرزا جعفر'' اس میں اپنی بیوی کی ہجو ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے نام سے بھی قطعہ ہے۔ اور خان جہاں بہادر کوکلتاش کی ایک ہجو ہے۔ ''ہجو شاکر خاں فوج دار'' کے نام سے ایک نظم ہے ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے۔

''جعفر کی شاعری کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک حصہ میں بے ثباتی دہر، جوانی اور بڑھاپا، احساس فنا، عبرت اور اخلاقی اقدار کو موضوع سخن بنایا گیا ہے دوسرا حصہ وہ ہے جس سے اس دور کے حالات وواقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ تیسرا حصہ

۱، ۲ تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۷۶، ۸۳

ہجویات پر مشتمل ہے۔ چوتھا حصہ وہ ہے جس میں طنز، ظرافت میں چھپا ہوا ہے۔
یہاں وہ اپنی تکلیف پر خود بھی ہنستا ہے اور دوسروں کو بھی ہنساتا ہے۔"[1]

جعفر زٹلی نے اردو ادب میں طنزیہ اور ہجو یہ شاعری کی روایت کو قائم کیا ہے۔ اس کے علاوہ رباعیاں، دوہرے، قطعات بھی ہیں۔ مثنویاں، نظمیں، نصیحت نامے، فالنامے، ظفرنامے بھی لکھی ہیں۔
"یادگارِ شعراء" میں جعفر زٹلی کے بارے میں بہت ہی مختصر حوالہ دیا ہے۔

"میر جعفر زٹلی، ساکن نارنول، ہمعصر بے دل، ہندوستان کے سب سے زیادہ مشہور ہزل گو شاعر تھے۔ ان کے کلام میں فارسی اور اردو کی آمیزش ہے۔ ریختہ میں شاہنامہ لکھا ہے (تذکرہ جات قاسم وذکا)۔"[2]

اس سے زٹلی کو سمجھنا مشکل ہے۔

فصل دوم

فصل دوم پہلا باب "فارسی کی ریختہ گو: بیدل، شاہ گلشن وغیرہ" کے نام سے ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے فصل دوم میں ان شعراء کا ذکر کیا ہے۔ جو فارسی کے ریختہ گو کہلاتے ہیں۔ اس باب سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی کے شاعروں نے کس طرح فارسی کے ساتھ ساتھ ریختہ کو اپنایا۔ اہل علم بظاہر تو فارسی زبان میں ہی شاعری کر رہے تھے۔ مگر کبھی کبھی اردو زبان میں بھی کہہ لیتے تھے۔ کیونکہ اردو میں شاعری کا چلن ہو گیا تھا۔ فارسی گو کی تعداد کم سے کم تر ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے خیال میں

"فارسی گویوں نے محض تفنن طبع کے لئے ریختہ میں شاعری کی لیکن عبوری دور میں ان کی توجہ سے معاشرے میں اردو کا وقار مرتبہ بلند ہونے لگا۔ فارسی کے ریختہ گویوں کی اردو شاعری، ان کی فارسی شاعری کے مقابلے میں، کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن یہ لوگ اپنی ریختہ گوئی کی وجہ سے تاریخ کا اس لیے حصہ ہیں۔ کہ انھوں نے دانستہ یا نادانستہ اردو شاعری کی روایت کو آگے بڑھانے میں حصہ لیا ہے۔ ان میں مولوی عبدالغنی قبول، شاہ وحدت۔ شاہ گلشن، بیدل، امید، انجام، پیام، آرزو، مخلص،

---

[1] تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۱۰۱-۱۰۶

[2] یادگار شعراء اسپرنگر مترجمہ طفیل احمد، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۵ء ص ۵۲

بہار درگاہ اور آزاد بلگرامی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔''[۱]

ان میں چند شاعروں کے بارے میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ان شاعروں کی ایک خاص بات یہ تھی کہ انھوں نے دو تخلص رکھے فارسی کا الگ تھا اور اردو کا الگ تھا۔مثلاً میرزا معزالدین محمد موسوی انکا فارسی کا تخلص فطرت تھا اور اردو میں موسوی تھا۔خواجہ عبدالاحد تخلص فارسی میں وحدت اور ریختہ میں گل تھا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے میرزا القادر بیدل کے بارے میں لکھا ہے۔

''بیدلؔ اردو کے شاعر نہیں ہیں لیکن ان کا اثر اردو شاعری پر بہت گہرا پڑا ہے۔ بیدل کے اثر کی دو صورتیں ہیں۔''ایک طرز بیدل، جوئی تراکیب، خوبصورت بندشوں، لطیف استعاروں اور نادر تشبیہات کا مرکب ہے اور دوسرے'' فکر بیدلؔ''، جس میں خیالات کو تجربات باطنی اور واردات قلبی نے آئینہ دکھایا ہے۔ بیدلؔ کی شاعری کا اثر فغاں ،میرزا مظہر، میر درد اور شاہ قدرت کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔انیسویں صدی میں غالبؔ کے ابتدائی اردو فارسی کلام پر بھی بیدلؔ کے گہرے اثرات پڑے ہیں۔اقبال کی شاعری پر جو انھیں استاد کامل اور مفکر شاعر کہتے ہیں بیدل کے اثرات واضح ہیں۔''[۲]

بیدل کے بارے میں تذکرہ نکات الشعراء میں میر تقی میر نے لکھا ہے۔

''شاعر پر زور فارسی، صاحب دیوان پنجاہ ہزار بیت و مثنویات وغیرہ۔اوائل جوانی نوکر شاہزادہ محمد اعظیم بود۔''[۳]

اس کے علاوہ بیدلؔ کے بارے میں یادگار شعراء میں بھی تقریباً یہی حوالہ دیا ہے۔

''بیدل مرزا عبدالقادر۔انھوں نے ایک فارسی کا دیوان ۵۰۰۰ اشعار کا اور کچھ مثنویاں لکھی ہیں۔جوانی میں یہ شاہزادہ محمد اعظم کے یہاں تھے۔لیکن بعد میں گوشہ نشین ہوگئے تھے۔ریختہ میں انھوں نے بہت تھوڑے اشعار لکھے تھے (تذکرہ میرؔ)۔''[۴]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان تذکروں سے مختلف معلومات پیش کی ہیں۔انھوں نے پانچ ہزار اشعار اور شہزادہ محمد اعظم کا ذکر نہیں کیا ہے۔ڈاکٹر جالبی نے بیدلؔ کی ایک غزل کا حوالہ دیا ہے۔جس کے دو شعر ہمیں ''تذکرہ نکات الشعراء'' میں بھی ملتے ہیں۔

۱، ۲ تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۱۲۱-۱۲۲ / ۱۴۳

۳ تذکرہ نکات الشعراء، میر تقی میر، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۴ء ص ۴۴

۴ یادگار شعراء اسپرنگر، مترجمہ طفیل احمد، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۵ء ص ۳۹

''مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے،ہم ہیں   اس غم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے،ہم ہیں

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا   پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے،ہم ہیں ''۱

ڈاکٹر جمیل جالبی نے'' تاریخ ادب اردو'' جلد دوم حصہ اول میں صفحہ ۱۲۶ پر بیدل کی یہ پوری غزل لکھی ہے بیدل کے بعد میرزا عبدالغنی بیگ قبول کشمیری کے بارے میں آیا ہے۔ یہ بھی فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے انکی شاعری پر بھی اردو شاعری کا اثر پڑا۔ آگے شیخ سعداللہ گلشن کا ذکر ہے۔ یہ شاہ گل کے مرید اور بیدل کے شاگرد تھے۔ یہ فارسی کے پر گو شاعر تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے۔

''تاریخ ادب میں شاہ گلشن اردو شاعر کی حیثیت سے اہمیت نہیں رکھتے۔ ان کی اصل اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے ولی دکنی میں وہ شعور پیدا کیا جس نے ولی کی شاعری کا وہ رنگ، لہجہ اور طرز متعین کیا جس پر چل کر اردو غزل نے اپنی روایت قائم کی۔''۲

گلشن کے بعد جن کا ذکر تاریخ ادب اردو میں آیا ہے۔ ان میں شرف الدین علی خاں پیام اکبر آبادی، مرزا محمد قزلباش خاں امید ہمدانی اور نواب عمدۃ الملک امیر خاں انجام شامل ہیں۔

دوسرے باب کا عنوان'' فارسی کے ریختہ گو: آرزو، مخلص وغیرہ'' ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے سراج الدین علی خاں آرزو کے بارے میں کافی تفصیل سے لکھا ہے۔ خان آرزو نے جس دور میں شاعری کا آغاز کیا۔ وہ پرآشوب دور تھا۔ مغلیہ سلطنت کا زوال ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں انکی شہرت ہر طرف پھیل گئی تھی۔ آرزو ویسے تو فارسی کے عالم اور شاعر تھے۔ مگر اردو میں انھوں نے اشعار لکھے ہیں۔ اردو میں شاعری سے زیادہ انکا بڑا کام یہ ہے کہ اس زمانے کے نوجوانوں کو آرزو کے ریختہ گوئی کی طرف مائل کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے میر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے

''بقول میر اس فن بے اعتبار کو جسے ہم نے اختیار کر لیا ہے (آرزو) معتبر بنایا۔''۳

آگے لکھتے ہیں۔

''اس دور میں ان کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ'' فارسی شاعری کا رخ تمثیل گوئی سے موڑ کر تازہ گوئی کی طرف کر دیا۔''۴

خان آرزو شاعر بھی تھے اور عالم، نقاد، ماہر لسانیات، محقق اور لغت نویس بھی۔ وہ فارسی اردو اور سنسکرت کے علاوہ کئی علاقائی زبانوں مثلاً پنجابی، برج بھاشا، ہریانوی اور اودھی سے بھی واقف تھے۔

---

۱ تذکرہ نکات الشعراء، میر تقی میر، اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۴ء ص ۲۵

۲، ۳، ۴ تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۱۳۰ / ۱۴۸ / ۱۴۹

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک فہرست پیش کی ہے۔جس میں مثنویات ،لغات ،علم لغت ،فن بلاغت شرح ،نقد ونظر ،تذکرہ اور متفرقات وغیرہ شامل ہیں۔اس میں ہر ایک کے بارے میں مختصر سا لکھا ہے۔

اس دور کے شاعر انندرام مخلص کا ذکر ہے ۔ یہ بنیادی طور پر فارسی کے شاعر اور انشاء پرداز تھے ۔ انکی جن تصانیف کا ذکر ہے وہ یہ ہیں (۱) کارنامہ عشق (۲) رقعات (۳) گلدستہ اسرار (۴) ہنگامہ عشق (۵) معرآۃ الاصطلاح (۶) چمنستان (۷) وقائع بدائع (۸) دیوان فارسی مع رباعایا (۹) سفرنامہ (۱۰) پری خانہ وغیرہ ۔اس کے علاوہ دو اور شاعروں کا ذکر ہے ۔لالہ ٹیک چند بہادر دہلوی اور خان دوراں ،نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں درگاہ یہ فارسی کے شاعر تھے مگر اردو زبان میں بھی شاعری کی ہے ۔میر غلام علی آزاد بلگرامی کا بھی اس باب میں ذکر ہے انکے شاگرد سارے برعظیم میں پھیلے ہوئے تھے ۔

فصل سوم

پہلا باب ولی دکنی کے اثرات تخلیقی رویئے شاعری کی پہلی تحریک: ایہام گوئی

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس حصے میں ولؔی دکنی کی شاعری اور انکی شاعری کے اثرات کو موضوع بنایا ہے۔ دیوان ولؔی جب دہلی پہونچا تو اس کے اشعار ہر خاص وعام کی زبان پر تھے۔ان کا اثر برعظیم کے شعراء پر پڑا۔ دکن میں سراج اورنگ آبادی داؤ اورنگ آبادی فقیر اللہ آزاد شاہ قاسم علی قاسم اور شاہ تراب وغیرہ ہیں۔ گجرات میں اشرف ثناء اللہ ثنا رضی ،عبدالولی عزلت ،پنجاب میں شاہ مراد ،سندھ میں میر محمود صابر ،دہلی میں آبرو ،ناجی مضمون ،حاتم یک رنگ اور فائز نے دیوان ولؔی کو اپنی شاعری کا نمونہ بنایا۔ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

”ہر بڑے شاعر نے اپنے پسند کے مطابق ولؔی کی شاعری سے اپنا محبوب رنگ چن لیا۔آبرو ،مضمون ،ناجی اور حاتم نے فارسی شعراء متاخرین کی مروجہ روایت کے زیر اثر جس میں ایہام گوئی نمایاں میلان کا درجہ رکھتی تھی ،دیوان ولی سے متاثر ہو کر اپنی شاعری کی بنیاد ایہام گوئی پر رکھی ۔“[1]

پروفیسر سید اعجاز حسین نے ولی کے بارے میں لکھا ہے۔

”ولؔی نے دلؔی میں آ کر یہاں کی زبان کا اتنا اثر لیا کہ دکنی زبان اور محاورات کو کم کر کے دہلی کی زبان اور محاوروں کو اپنے کلام میں جگہ دینا شروع کیا نتیجہ یہ ہوا کہ

---

[1] تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول ،ڈاکٹر جمیل جالبی ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۱۸۹

> ہندوستانی الفاظ اور مقامی اثرات جو اردو زبان میں آ رہے تھے۔ وہ کم ہونے لگے اور فارسی الفاظ و تخیل زیادہ زور کے ساتھ اردو میں داخل ہونے لگے چونکی دہلی کے اس وقت کے شعراء ولی کے کلام سے متاثر تھے۔''[۱]

دونوں مورخوں کو اس بات سے اتفاق ہے کہ اسی زمانے کے شاعر ولی سے متاثر تھے مگر ڈاکٹر جمیل جالبی نے جس ایہام گوئی کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے اس کے بارے میں پروفیسر اعجاز حسین نے بالکل ذکر نہیں کیا ہے جبکہ مشفق خواجہ لکھتے ہیں۔

> ''تاریخ ادب کے قاری کو صرف اس قدر بتا دیا جاتا ہے کہ ایہام گوئی کا رجحان ولی گجراتی کے زیر اثر عام ہوا لیکن جمیل جالبی نے اس کا جو سبب بتایا ہے اس سے ایک نئی صورتحال سامنے آتی ہے۔''[۲]

مشفق خواجہ نے اپنے مضمون میں تاریخ ادب اردو کا حوالہ بھی دیا ہے ۔ اس حوالہ میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایہام گوئی کو پہلی ادبی تحریک بتایا ہے۔

فصل سوم کا دوسرا باب ''ایہام گو شعراء: آبرو'' کے عنوان سے ہے آبرو کا نام نجم الدین اور عرفیت شاہ مبارک تھی۔ محمد غوث گوالیاری شطاری کی اولاد میں سے تھے۔ آبرو کے استاد سراج الدین علی خاں آرزو تھے۔ دونوں میں کچھ رشتہ داری بھی تھی۔ یہ گوالیار میں پیدا ہوئے مگر اپنی زندگی کا زیادہ حصہ دہلی میں گذارا۔ آبرو نے جب شاعری کا آغاز کیا تو اس وقت گوالیار میں فارسی روایت کے علاوہ بھاکا شاعری کا بھی چلن تھا۔ گوالیار بھاکا کا علاقہ تھا۔ اس کے دوہرے لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ آبرو نے اپنی شاعری میں اصناف سخن تو فارسی زبان میں ہی برقرار رکھے۔ اس کے علاوہ تلمیحات اور ضمیات فارسی اور ہندی دونوں زبانوں سے لئے مگر انھوں نے اپنی شاعری میں بھاکا الفاظ بھی شامل کئے۔ جس کی وجہ سے انکی شاعری میں فارسی اور ایسی رواتیں آپس میں گھل مل گئیں ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا آبرو کی شاعری کے بارے میں یہ خیال ہے

> ''آبرو ایک قادر الکلام معنی یاب اور متین خیال شاعر تھا۔ جس کا پورا کلام اب تک شائع نہیں ہوا۔ آبرو کے کلام کے مطالعے سے جو تصور شاعری سامنے آتا ہے وہ یہ ہے۔

---

[۱] مختصر تاریخ ادب اردو، سید اعجاز حسین، اردو کتاب گھر دہلی۔۶ ص ۳۳ ۔ ۳۵

[۲] مشفق خواجہ، مضمون اردو ادب کی پہلی تاریخ، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نوشاہی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔۶، ۱۹۹۳ء ص ۳۰۲

(۱) صرف قافیے ملانے سے شاعری تخلیق نہیں کی جا سکتی۔اس کے لئے ضروری ہے کہ اچھے مضامین شعر میں باندھے جائیں۔

(۲) شاعری کے لئے طبع کی روانی اور نئی فکر ضروری ہے۔

(۳) قافیے کے ساتھ اگر ردیف بھی شعر میں ہو تو اس سے حسن شعر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

(۴) شاعری کا مقصد یہ ہے کہ حسن و عشق کے تجربے بیان کئے جائیں۔ خصوصاً ایسے تجربے جنھیں سن کر محبوب خوش ہو اور پسند کرے۔ ''[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس باب میں آبرو کے چند اشعار بھی درمیان میں شامل کئے ہیں۔

تیسرا باب ''ایہام گو شعرا: ''ناجی وغیرہ'' ہے بقول ڈاکٹر جمیل جالبی

''ایہام گوئی کی تحریک بھی بنیادی طور پر اردو کے رواج کی تحریک تھی۔اسی لئے اس کے مزاج میں اردو پن اور ہندوستانیت زیادہ ہے۔

شاکر ناجی کا یہ شعر اسی بات کا اظہار کرتا ہے۔

بلندی سن کے ناجی ریختے کی　　　　ہوا ہے پست شہرہ فارسی کا''[۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس باب میں ایہام گوئی کے سلسلے میں صرف ناجی کو ہی نہیں بلکہ مضمون، آبرو اور حاتم کو بھی مرکزی حیثیت دی ہے۔سب سے پہلے محمد شاکر ناجی کے بارے میں لکھا ہے۔ یہ دلی کے رہنے والے تھے۔ پیدائش، پرورش اور وفات دلی میں ہی ہوئی۔ ناجی فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ناجی کے سال وفات پر کافی بحث کی ہے انھوں نے ۶ مثالیں دے کر سمجھایا ہے۔

(۱) ''ناجی نے آبرو کا سال وفات (۱۱۴۶ھ/۱۷۳۳ء) اپنی غزل کے ایک مصرع سے نکالا ہے۔اس کے معنی یہ ہوئے کہ (۱۱۴۶ھ/۱۷۳۳ء) میں ناجی زندہ تھے۔

(۲) دہلی پر نادر شاہ کے حملے کے وقت (۱۱۵۱ھ/۱۷۳۹ء) میں ناجی زندہ تھے اس کا ثبوت مخمس شہر آشوب کے وہ دو بند ہیں۔جنھیں قاسم نے اپنے تذکرے[۱۴] میں نقل کیا ہے جن سے نادر شاہ کے حملے کے بعد دلی کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

(۳) میر نے ناجی سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔میر نادر شاہ کے حملے کے بعد (۱۱۵۲ھ/۱۷۴۰ء) میں دلی آئے

(۴) حاتم نے ناجی کی زمین میں تین غزلیں ۱۱۳۷ھ، ۱۱۴۲ھ، ۱۱۵۵ھ میں لکھیں۔قیاس کیا جا سکتا ہے۔

[۱] تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۲۳۰۔ ۲۳۱

[۲] تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۲۳۱

کہ ناجی ۱۱۵۵ھ/۴۳-۱۷۴۲ء میں زندہ تھے۔

(۵) ۱۱۶۵ھ/۵۲-۱۷۵۲ء میں جب میر نے اپنا تذکرہ مکمل کیا تو ناجیؔ وفات پا چکے تھے

(۶) نواب امیر خاں انجام ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء میں قتل ہوئے۔ ''غم عمدہ'' ۱۶ سے سال وفات نکلتا ہے۔''[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان سب باتوں سے یہ نتیجہ نکالا ہے۔ ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء میں ناجی زندہ تھے۔ اس کے علاوہ انکی شاعری پر بھی جو تبصرہ ہوا ہے۔ وہ ہر تذکرہ نگار کا الگ الگ ہے۔ میرؔ نے انہیں لکھ دیا کہ انکا مزاج زیادہ تر ہزل گوئی کی طرف مائل تھا۔

''مزاجش بیشتر مسائل بہ ہزل بود۔''[۲]

قائم نے مزاح کا شاعر بتایا۔ گردیزی نے ہجو گو بتایا۔ جبکہ جمیل جالبی کا خیال ہے دیوان ناجیؔ دیکھا جائے تو ایہام میں ڈوبا ہوا ہے۔ یادگار شعراء میں بھی ناجیؔ کے بارے میں لکھا ہے۔

''ناجیؔ نے ۱۱۶۸ھ میں انتقال کیا۔ ایک دیوان چھوڑا جو ایہام سے پر ہے، مگر اس زمانے کی روش یہی تھی۔ مزاح شاعری میں ناجیؔ ممتاز تھے۔ (میر و گلشن ہند)۔''[۳]

مختصر تاریخ ادب اردو میں ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب نے لکھا ہے

''اپنے ہم عصروں کی طرح رعایت لفظی ناجیؔ کو بہت مرغوب ہے۔ تھوڑا بہت جو کچھ کلام ہے۔ دستیاب ہوا ہے اس میں قدم قدم پر اس رغبت کا پر زور ثبوت نظر آتا ہے۔''[۴]

انھوں نے ہزل کا ذکر بھی کیا ہے مگر میر تقی میرؔ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ہزل کی طرف رجحان تھا۔ ایہام گوئی میں تیسرا شاعر شیخ شرف الدین مضمونؔ ہے یہ آرزوؔ کے شاگرد تھے۔ انکا دیوان نایاب ہے۔ مختلف تذکرہ نگاروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایہام گو ہیں۔ انکا کلام شگفتہ و دلنشین ہے۔ آبرو، ناجی، مضمون کے بعد جن ایہام گو شعراء کا ذکر ہے ان میں مصطفیٰ خاں یکرنگؔ، احسن اللہ احسنؔ سعادت علی امروہوی، اور میر محمد سجاد شامل ہیں۔

چوتھا باب۔ ''غیر ایہام گو شعراء: اشرف، فائز وغیرہ'' ہے۔ اس میں ان شاعروں کا ذکر ہے جو ولیؔ کنی کے

---

[۱] تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۲۳۳ ـ ۲۳۴

[۲] تذکرہ نکات الشعراء، میر تقی میر، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۴ء ص ۴۰

[۳] یادگار الشعراء، اسپرنگر، مترجمہ طفیل احمد اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۵ء ص ۱۷۲

[۴] مختصر تاریخ ادب اردو، سید اعجاز حسین، اردو کتاب گھر دلی۔ ۶ ص ۴۹ ـ ۵۰

زمانے کے تھے۔ جو غیر ایہام گو شعراء تھے۔ اور جنھوں نے وؔلی سے متاثر ہو کر اس روایت کو آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے سب سے پہلے اشرف کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے تین اشرف شاعروں کے بارے میں لکھا ہے۔ پہلا اشرف سید شاہ اشرف بیابانی جن کی تصانیف 'لازم المبتدی'، واحد باری اور نوسر ہار ہے۔ دوسرا اشرف، حسن شوقی کے فوراً بعد اور وؔلی دکنی سے پہلے نسل کا شاعر ہے۔ تیسرا شاعر محمد اشرف، اشرف گجراتی جو خود کو ''اشرف الموسوی المدنی الشاہی'' لکھتا ہے انکے بعد نواب صدر الدین محمد خاں فائز کا ذکر ہے یہ دہلی کے رہنے والے تھے۔

> بقول ڈاکٹر جمیل جالبی ''فائز نے اردو شاعری دؔلی میں دیوان وؔلی کے آنے کے بعد شروع کی اور ۱۱۴۳ھ/ ۳۱۔۱۷۳۰ء میں جب اپنا کلیات مرتب؛ کیا تو دس گیارہ سال کا اردو شاعری کا سرمایہ بھی اس میں شامل کردیا۔ آبؔرو کا پہلا دیوان ۱۱۳۹ھ/ ۲۷۔۱۷۲۶ء سے پہلے اور دوسرا دیوان ۱۱۴۴ھ/ ۳۲۔۱۷۳۱ء تک مرتب ہو چکا تھا۔ فائز کا دیوان اردو ۱۱۴۳ھ میں مرتب ہوا تھا۔ فائز، آبرو، ناجی، یکرنگ، مضمون، آرزو اور انجام وغیرہ کے معاصر ہیں اور ان اردو شعراء میں شامل ہیں۔ جنھوں نے وؔلی کے زیر اثر ریختہ کا چراغ روشن کیا۔''[۱]

فائز نے اپنی شاعری میں ایہام گوئی کو نہ اپنا کر وؔلی دکنی کا اثر قبول کیا۔ فائز کی کافی غزلیں وؔلی کی زمین میں ہیں بنیادی طور پر فائز فارسی کے شاعر ہیں لیکن اردو میں اپنا دیوان مرتب کرنے کے بعد وہ فارسی کے ریختہ گویوں سے الگ ہو گئے۔

انکے بعد عبید اللہ خاں مبتؔلا کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے مبتؔلا کا جو مشاہدہ کیا ہے اس سے انھوں نے یہ اندازہ لگایا ہے۔ کہ عبید اللہ خاں مبتؔلا، میر جملہ عبید اللہ خاں مخاطب بہ شریعت اللہ خاں (م ۴/ رجب ۱۱۴۴ھ/ ۲۴ دسمبر ۱۷۳۱ء) کا بیٹا تھا۔ یہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ حالانکہ انکے بارے میں تذکرہ نگاروں نے نہیں لکھا ہے مبتؔلا کے بعد شاہ تراب علی ترابؔ کا تذکرہ ہے۔ انکے بارے میں بھی ڈاکٹر جمیل جالبی نے ہی لکھا ہے باقی دوسرے تذکرہ نگاروں نے کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ انکی غزلوں سے انکی حالات زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ دیوان تراب کے علاوہ انکی ۶ نظموں کا ذکر ہے۔ (۱) ظہور کلی (۲) گلزارِ وحدت (۳) گنج الاسرار (۴) مثنوی تراب (۵) گیان سروپ (۶) من سمجھاون یہ سب

---

[۱] تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۳۰۱

نظمیں تصوف کی وجہ سے پسند کی جاسکتی ہیں۔

اس باب میں میرؔ محمود صابر کا بھی ذکر ہے۔ انھوں نے بھی فائز کی طرح فارسی اور اردو میں بھی دیوان مرتب کیا۔ انکے اردو دیوان میں ۶۱۶ غزلیات ہیں جن میں ولی دکنیؔ کا رنگ سخن ہے۔ صابر کے ہم عصر سید عبدالولی عزلت ہیں انھوں نے فارسی اور اردو میں دیوان مرتب کئے۔ فارسی دیوان میں ۱۴ ہزار اشعار ہیں۔ اور اردو میں ۲۱۰۰ اشعار ہیں۔ دو مثنویاں ہیں۔ "ساقی نامہ" اور "راگ مالا" "ایک کتاب شطرنج کبیر" ہے۔ میرؔ نے "بیاض عزلت" کا بھی ذکر کیا ہے۔

"نکات الشعراء میں میرؔ نے عزلتؔ کا ذکر کیا ہے۔ لیکن حسیب اور یونس کے ذکر میں بیاض عزلت کا ذکر ہے۔ "از بیاض سید (عبدالولی) صاحب مذکور نوشتہ شدہ۔"[۱]

"از بیاض سید صاحب (معزی الیہ) نوشتہ شدہ۔"[۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی "تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول میں صفحہ ۳۲۷ پر نکات الشعراء کا حوالہ دیا ہے۔ عزلت کی شاعری کی خصوصیت علامات کا شعور ہے۔ جس نے اردو غزل کو ایک نئے انداز سے روشناس کرایا۔

فصل چہارم
"ردّ عمل کی تحریک"

اس میں تین باب ہیں۔ پہلا باب "اسباب خصوصیات، معیار سخن" ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس حصے میں دلّی کا وہ دور دکھایا ہے۔ جب نادر شاہ کا حملہ ہوا تھا۔ اس وقت معاشرہ عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس قتل و غارت گری کے بعد شاعری پر بھی اثر پڑا۔ پسند ناپسند اور ذہنی فکر میں تبدیلی آئی ایسے حالات میں ایہام گوئی کی شاعری کو قبول نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نئے خیالات سامنے آنے لگے۔ نئے رجحان کو اپنانے والوں میں پہلا نام مرزا مظہر جان جاناں کا نام سامنے آیا۔ جنھوں نے ایہام گوئی کو ترک کر کے اردو اور فارسی کی شاعری میں روحانی انداز کو اپنایا۔ اس انداز کو "ردّ عمل کی تحریک" کا نام دیا گیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس تحریک کی خاص خاص پانچ باتیں بتائیں ہیں۔

(۱) ردّ عمل کی تحریک کے زیر اثر ایہام گوئی کو ترک کر دیا۔

---

۱ ۲ تذکرہ نکات الشعراء، میر تقی میر، اتر پردیش اردو اکادی لکھنؤ ۱۹۸۴ء ص ۱۰۶ / ۱۰۷

(۲) شاہ جہاں آباد کی اردو معلّٰی کو شاعری کی زبان بنایا۔

(۳) فارسی کے تازہ گویوں کی پیروی میں ایسا اندازِ شاعری اختیار کیا۔ جس سے مجازی اور حقیقی عاشقانہ جذبات کا اظہار ہو سکے۔

(۴) اس تحریک کے شعراء نے ایسی فارسی تراکیب استعمال کیں جو زبان ریختہ کے مزاج سے مناسبت رکھتی تھیں۔

(۵) ردِ عمل کی تحریک کے زیر اثر فارسی زبان و شاعری کے اثرات بڑھ گئے اور اردو شعراء شعوری طور پر فارسی شاعری اور تازہ گویوں کی پیروی کرنے لگے۔"[۱]

بقول ڈاکٹر جمیل جالبی

> "شاہ حاتم نے ردِ عمل کی تحریک کے زیر اثر نیا رنگِ سخن اس حد تک اپنایا کہ اپنا "دیوان قدیم" مسترد کر دیا۔ ۱۱۶۹ھ/ ۵۶۔۱۷۵۵ء میں پرانے رنگ اور پرانی زبان کے سارے اشعار نکال کر یا بدل کر اپنا نیا منتخب دیوان "دیوان زادہ" کے نام سے مرتب کیا۔ اور اس پر مقدمہ لکھ کر اس دور کے نئے شعری رجحانات اور زبان و بیان کے جدید نکات کو محفوظ کر دیا۔"[۲]

شاہ حاتم نے اس نئی شاعری کو مقبول کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ جس نے اردو شاعری کا رخ بدل دیا۔؛ اور میرؔ، سوداؔ اور دردؔ جیسے شاعروں کے لئے راستہ بالکل صاف کر دیا۔ اس دور میں شاعری اصول و قواعد بھی بنائے گئے مثلاً ریختہ میں فارسی کے فعل و حرف کا استعمال کرنا جائز نہیں۔ عربی و فارسی کے کثیر الاستعمال کو شاعری کی زبان میں بدلنے پر زور دیا گیا، دہلی اور میرزایان ہند کے عام فہم و خاص پسند روزمرہ کو اختیار کرنے پر زور دیا گیا تعقید کو شاعری کا عیب شمار کیا گیا، عربی و فارسی الفاظ کو شاعری میں استعمال کرنے پر زور دیا گیا۔ اس دور میں رشتہ، تسبیح، عبث، قطرہ، غیر صحیح املا کے ساتھ لکھے جانے لگے، ساکن الفاظ کو ساکن اور متحرک کو متحرک الفاظ میں لکھا جانے لگا، آبرو اور اس کے معاصرین ولی کے زیر اثر جو الفاظ استعمال کرتے تھے۔ ان کو ترک کر دیا، اسی طرح زیر، زبر، پیش کے الفاظ کا قافیہ بنایا یا فارسی کو ہندی قافیے کے ساتھ باندھنا عیب سمجھا جانے لگا۔ پردہ کو پردا اور بندہ کو بندا لکھنا صحیح سمجھا گیا۔ اور عام بول چال کی زبان اور محاوروں کو شاعری میں استعمال کرنا مستحسن قرار دیا گیا۔ اس تحریک کے زیر اثر انسانی تجربات کا اظہار اور دل کی بات

---

[۱] [۲] تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۳۳۹۔ ۳۵۰ / ۳۵۰

شعر کی زبان میں بیان کرنا اردو شاعری میں شامل ہو گیا۔

دوسرا باب ''ردِ عمل کے شعراء۔ مظہر جانجاں، یقین وغیرہ''

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس باب میں ردِ عمل کی تحریک کو اپنانیوالے شعراء کا تذکرہ کیا ہے۔ جن میں خاص مظہر جانجاں، یقین اور انکے ہم عصر شعراء شامل ہیں۔ مظہر جانجاں اس تحریک کے قائد تھے۔ مرزا مظہر کا نام جانِ جاں، تخلص مظہر اور لقب شمس الدین حبیب اللہ تھا، عوام میں جان جاناں کے نام سے مشہور ہوئے۔ مرزا مظہر کے سال ولادت کے بارے میں کچھ مختلف باتیں لکھیں گئیں۔ یہ اختلاف خود مرزا کے بیان سے پیدا ہوا۔ ڈاکٹر جالبی نے انکے سال ولادت پر مختصر سی بحث کی ہے۔ مرزا نے اپنے فارسی دیوان میں والد کی وفات کے وقت اپنی عمر ۱۶ سال بتائی ہے۔ ایک جگہ دیوان کے مطابق پیدائش ۱۱۱۰ھ ہے اور اسی دیوان سے ۱۱۱۳ھ کا حساب نکلتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے حساب سے

''مرزا مظہر کی تاریخ ولادت ۱۱ رمضان المبارک شب جمعہ ۱۱۱۰ھ/۳ مارچ ۱۶۹۹ء متعین کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا۔''[۱]

جبکہ دوسری طرف سید اعجاز حسین'' مختصر تاریخ ادب اردو'' میں لکھتے ہیں۔

''۱۱۱۱ھ میں جب شاہ عالمگیر دکن میں فوج لئے پڑا تھا۔ تو خبر آئی کہ مرزا جان کے بیٹا بمقام کالاباغ علاقہ مولوہ میں پیدا ہوا جب عالمگیر کو خبر ہوئی تو فرمایا کہ ''پسر جان پدری باشد'' باپ مرزا جان ہے ہم نے لڑکے کا نام'' جانجاناں'' رکھا۔ ابھی یہ صرف اٹھارہ برس کے تھے کہ مرزا جان انتقال کر گئے۔''[۲]

مرزا مظہر کی تاریخ ولادت میں اختلاف پائے جاتے ہیں۔ مرزا کی تصانیف میں دیوان فارسی، جزیطہ جواہر، مکاتیب نثر (فارسی) اردو کلام شامل ہیں۔

مرزا کے بعد انعام اللہ خاں یقین کے بارے میں ہے۔ وہ ایسے شاعر مانے جاتے ہیں، جنھوں نے اردو شاعری میں نئے رجحانات کو اس طرح شامل کیا کہ دوسرے شعراء اپنی تخلیقات میں اسی رنگ سخن کو اپنانے لگے۔ مرزا مظہر یقین کے استاد تھے۔ یقین نے اپنی شاعری کو ولی دکنی کی شاعری سے آزاد کر لیا تھا۔ انکے

۱۔ تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۳۶۱

۲۔ مختصر تاریخ ادب اردو سید اعجاز حسین، اردو کتاب گھر دہلی۔ ۶ ص ۶۲

دیوان میں ۷۰ اغزلیں شامل ہیں۔

اس زمانے کے شاعروں میں میر عبدالحی تاباں کا نام بھی آتا ہے۔ یہ دہلی کے رہنے والے تھے تاباں کا دیوان کافی ضخیم ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ رباعیات قطعات، مثلث، مخمس، مسدس، ترکیب بند، تضمین، مستزاد قصیدہ، مثنوی اور قطعاتِ تاریخ بھی شامل ہیں۔

میر محمد باقر حزیں وظہور بھی ردعمل کے شعراء میں شامل ہیں۔ انکی شاعری کی وہی خصوصیات ہیں جو یقینؔ اور تاباں کی شاعری میں ملتی ہیں۔ حزیں کے ساتھ ساتھ دردمند کا نام بھی سامنے آتا ہے۔ یہ غزلوں کا دور تھا اس کے باوجود دردمند کا ساقی نامہ اہمیت کا حامل ہے۔ انکے بعد اشرف علی خاں فغاں ظریف الملک کوکہ خاں بہادر یکہ جنگ کا نام آتا ہے۔ انکی وابستگی مغلیہ دربار سے تھی۔ خواجہ احسن الدین خاں بھی اسی تحریک سے تعلق رکھتے تھے انھوں نے بھی مرزا مظہر کی شاگردی کی ہے۔ انھوں نے قصیدے، مخمس، مسدس، نعت اور مرثیے بھی لکھے ہیں۔

تیسرے باب میں ردعمل کے شعراء شاہ حاتمؔ ہے یہ ایسے شاعر ہیں جنھوں نے دو تحریکوں کو اپنایا۔ پہلے ایہام گوئی کی تحریک آبروؔ ناجیؔ، اور مضمونؔ کے ساتھ رہے اور دیوان قدیم مرتب کیا۔ اس کے بعد مرزا مظہر تحریک کے زیر اثر اپنا ''دیوان زادہ'' مرتب کیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس باب میں شاہ حاتمؔ کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ شیخ ظہورالدین حاتم والد کا نام شیخ فتح الدین تھا۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ ماہ رمضان ۱۱۹۷ھ میں وفات پائی۔ انکی وفات کی تاریخ پر کافی بحث کی گئی ہے۔ کئی تذکروں کے حوالے دے کر سمجھایا گیا ہے۔ شاہ حاتمؔ کی تین تصانیف نظم کی شکل میں ہیں۔ (۱) دیوانِ قدیم (۲) دیوان زادہ (۳) دیوان فارسی اور نثر میں دو مختصر تحریریں فارسی واردو میں سامنے آئی ہیں (۱) دیباچہ دیوان زادہ (نثر فارسی) (۲) نسخہ مفسرح الضحک (نثر اردو)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے شاہ حاتمؔ کے بارے میں لکھا ہے۔

''شاہ حاتمؔ ایک ایسے تنقیدی شعور کے مالک تھے۔ جو انھیں بدلتے زمانے اور نئے ذہنی ماحول کا ساتھ دینے کی ہر دم ترغیب دے سکتا تھا۔ اپنا (دیوان زادہ) اسی تنقیدی شعور کے ساتھ اس انداز سے مرتب کیا کہ نہ ان سے پہلے اور نہ ان کے بعد کسی نے اپنا دیوان اس طور پر مرتب کیا۔''[۱]

---

[۱] تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۳۵۱

فصل پنجم

فصل پنجم ''ردعمل کی تحریک کی توسیع'' اس میں تین باب ہیں۔ پہلا باب '' میر وسودا کا دور ادبی ولسانی خصوصیات'' ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس باب میں اٹھارویں صدی میں شاعری کے عروج پر لکھا ہے۔ اس میں سیاسی نزول ہو رہا تھا۔ اور شاعری ترقی کر رہی تھی۔ ردعمل تحریک عام ہوگئی تھی۔ اس دور میں میرؔ، سوداؔ اور دردؔ شاعری میں اپنا مقام بنا رہے تھے۔ میرؔ نے اپنی شاعری میں غم والم کو پوری طرح سمو دیا تھا۔ سوداؔ نے اردو شاعری کو ایک نیا آہنگ دیا۔ میرؔ کے ہاں اندر کی دنیا آباد ہے۔ سوداؔ کے ہاں باہر کی دنیا آباد ہے۔ میرؔ، دردؔ نے شاعری کو نئے رجحان عطا کئے۔ انکے نزدیک شاعری کو دنیا کمانے کا ذریعہ نہیں بنانا چاہئے۔ انکا خیال ہے کہ ایسی شاعری کرنی چاہئے کہ سننے والے کے دل پر اثر ہو۔ میرؔ وسوداؔ کے دور میں اردو شاعری نے فارسی کی جگہ لے لی تھی۔ اب فارسی شاعری تفنن طبع کیلئے کی جاتی تھی۔ سوداؔ نے قصیدے، غزل اور ہجو کو اردو شاعری میں مستقل کر دیا۔ اس دور میں بہت شاعروں نے قصیدے لکھے مگر سوداؔ کے قصیدوں تک کوئی نہیں پہونچ سکا۔ دردؔ نے قصیدہ کی صنف کو نہیں اپنایا۔ میرؔ نے مثنوی کی صنف کو پنایا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ میرؔ نے کل ۳۷ مثنویاں لکھیں جن مین ۹ عشقیہ، ۱۳ واقعاتی، ۳ مدحیہ اور ۱۲ ہجویہ مثنویاں لکھیں۔ قائمؔ نے بھی طویل مثنویاں لکھیں۔ اسی دور میں میر حسن نے بھی گیارہ مثنویاں لکھیں۔ اسی دور میں مرثیہ کو بھی اپنایا گیا۔ اس زمانے میں جن شعراء نے شہر آشوب لکھے ان میں میرؔ، سوداؔ، قائمؔ، اور جعفر علی حسرتؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس دور میں مختلف اصناف سخن میں مختلف فنی اصولوں کی پابندی کی گئی۔ اردو شاعروں نے تذکرے بھی لکھے۔ یہ تذکرے اردو زبان کے ساتھ فارسی زبان میں بھی لکھے گئے۔ غرض میرؔ وسوداؔ نے اردو شاعری کی روایت کو آگے بڑھایا۔

دوسرا باب '' محمد تقی میر حیات، سیرت، تصانیف'' ہے ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس باب میں میرؔ کے حالات زندگی اور انکی شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ میرؔ کی تاریخ ولادت کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

> '' محمد تقی میر (۱۱۳۵ھ۔ ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ/ ۲۳۔ ۱۷۲۲ء، ۲۰ ستمبر ۱۸۱۰ء) کی ولادت کے بارے میں مختلف آراء ہیں لیکن یہ سب قیاسات دیوان چہارم نسخہ محمود آباد کی اس عبارت کے بعد جو خود میر کے بھیجتے محمد محسن کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی ہے۔

ختم ہو جاتے ہیں۔''[۱]

میر کا انتقال ۲۰ شعبان کو جمعہ کے دن شام کے وقت ۱۲۲۵ھ میں ہوا۔ یہ آگرہ میں پیدا ہوئے مگر حالات کے پیش نظر دلی میں آکر آباد ہو گئے۔ خاں آرزو انکے استاد تھے۔ مگر اس بات میں بھی تضاد ہے۔ ''ذکر میر'' میں خاں آرزو کو اپنا دشمن بتایا اور ''نکات اشعراء'' میں آرزو کو استاد پیر و مرشد بتایا ہے۔

دلّی آکر جنون کے مرض میں مبتلا ہو گئے، شعر گوئی کی صلاحیت پیدائشی تھی۔ دلّی کے ممتاز شعراء میں شمار ہونے لگا۔ نجف خاں ذوالفقار الدولہ کے زمانے میں میر لکھنو آگئے۔

جہاں تک میر کی سیرت کا تعلق ہے۔ وہ ایک فقیر صفت انسان تھے انھیں خود احساس تھا کہ وہ ایک بڑے شاعر ہیں۔ مگر زمانے نے انکی قدر نہیں کی۔ میر کے اندر انانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بے حد حساس طبیعت کے مالک تھے جس کی وجہ سے پریشان رہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس باب میں انکی تصانیف کا بھی حوالہ دیا ہے۔ وہ کچھ اس طرح ہیں۔ نکات الشعراء، فیض میر، دریائے عشق (نثر فارسی) ذکر میر، دیوان فارسی، کلیات اردو، دیوان اوّل، دیوان دوم، دیوان سوم، دیوان چہارم، دیوان پنجم، دیوان ششم، دیوانچہ اور دیوان زادہ ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

''کلیات میر پہلی بار فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ۱۸۱۱ء/۱۲۲۶ھ میں میر کی وفات کے ایک سال بعد اردو ٹائپ میں شائع ہوا۔ اس میں چھ دواوین شامل ہیں۔''[۲]

تیسرا باب ''محمد تقی میر مطالعہ شاعری'' اس باب میں ڈاکٹر جالبی نے میر کی شاعری کو موضوع بنایا ہے۔ جس میں انکے اشعار کی مثال دے کر میر کی شاعری پر خاصہ تبصرہ کیا ہے۔ میر غزل کے بادشاہ ہیں۔ اسی میدان پر انھوں نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ اس باب میں میر کی شاعری کی انفرادیت اور خاصیت سمجھائی گئی ہے۔ بقول جمیل جالبی کہ میر کے اشعار کے معنی سمجھے بغیر اس کا اثر قبول کر لیتے ہیں۔

قاری تک اثر پہلے پہنچتا ہے معنی بعد میں۔ یہ ایک بڑی خصوصیت ہے۔ میر کے اندر انا پرستی بہت ہے۔ لیکن ان کی یہ خاصیت ہے کہ انھوں نے انا کو اپنی شاعری میں اتنا ہی شامل کیا ہے جتنی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے۔

''اب تک میر کے غم کو دو انداز سے دیکھا گیا ہے ایک یہ کہ میر کے غم میں

۱، ۲ تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ص ۵۰۳ / ۵۵۶

چونکہ غم دوراں چھپا ہوا ہے اس لئے میرؔ جن حالات سے دوچار ہوئے ان کی ترجمانی میرؔ نے کردی۔ دوسرا یہ کہ غم چونکہ ان کی فطرت کا محسوس حصہ تھا۔ اس لیے ان کی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ لیکن اگر میرؔ کے غم کی یہی نوعیت ہے تو اس سے میرؔ کی سی بڑی شاعری پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔ میرؔ کی شاعری اگر ایسی ہوتی تو وہ بہت عرصے تک ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ میرؔ تو اپنے غم کے اظہار سے اپنے قاری کو پستی کے عالم سے اٹھا کر بلندی کی طرف لے جاتے ہیں۔‘‘[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی کے اس خیال سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ میرؔ کی شاعری کو الگ انداز سے دیکھتے ہیں ۔ میرؔ کی شاعری میں جو غم ہے وہ انھیں ہومیو پیتھی کی دوا کی طرح لگتا ہے۔ جو پہلے مرض کو بڑھاتا ہے۔ اس کے بعد مریض کا علاج کرتا ہے۔ میرؔ کا غم بھی انتہا کو پہونچ کر قاری کو تسکین بخش کیفیت دیتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے میرؔ کے غم کو جس انوکھے انداز سے پیش کیا ہے اور سراہا ہے۔ اس انداز کو دیکھتے ہوئے محمد حسین آزاد کا تبصرہ جو کہ ’’آب حیات‘‘ میں کیا گیا ہے۔ بہت عجیب لگتا ہے۔ محمد حسین آزاد نے میرؔ کے غم کا ذکر نہ کر کے ان کے مزاج پر زیادہ انگلی اٹھائی ہے وہ لکھتے ہیں۔

’’میر صاحب کی بلند نظری اس غضب کی تھی۔ کہ دنیا کو کوئی بڑائی۔ اور شخص کا کمال یا بزرگی انہیں بڑی نہ دکھائی دیتی تھی۔ اس قباحت نے نازک مزاج بنا کر ہمیشہ دنیا کی راحت اور فارغ البالی سے محروم رکھا اور وہ وضعداری اور قناعت کے دھوکے میں فخر سمجھتے رہے۔‘‘[۲]

آگے لکھتے ہیں۔

’’عظمت واعزاز جوہر کمال کے خادم ہیں اگرچہ انہوں نے لکھنؤ میں بھی میرؔ صاحب کا ساتھ نہیں چھوڑا مگر انھوں نے بھی بدد ماغی اور نازک مزاجی کو جو ان کے ذاتی مصاحب تھے اپنے دم کے ساتھ ہی رکھا۔‘‘[۳]

تنقید نگاری ہر تنقید نگار اپنے نظریہ سے کرتا ہے اسی دونوں کی تنقید میں فرق ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے میرؔ کی زبان پر جو تبصرہ لکھا ہے۔ وہ بھی باقاعدہ اشعار اور الفاظ کی مثال دے کر سمجھایا ہے۔ میرؔ نے دلّی

---

۱ تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۵۸۵

۲،۳ آب حیات، محمد حسین آزاد، اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۹۸ء ص ۱۹۵ / ۱۹۶

کے گلی کوچوں کی زبان استعمال کی ہے۔انھوں نے فارسی الفاظ وتراکیب اردو کے مزاج میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔آخر میں میر کی مثنویوں پر بھی تذکرہ کیا ہے۔مشفق خواجہ کا خیال ہے۔

"آخری فصل اٹھارویں صدی کے اردو نثر کے بارے میں ہے اردو نثر کے سرمائے کا جائزہ موضوعات اور اسالیب کے اعتبار سے لیا گیا ہے۔جمیل جالبی نے موضوع کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا۔اس تاریخ کی اہم خصوصیت ادوار کی سائنٹیفک تقسیم ہے۔کرم خوردہ، دریدہ، آب رسیدہ اور بڑی حد تک ناخوانا مخطوطات سے جس طرح استفادہ کیا ہے وہ انھیں کا کام تھا۔اگر وہ صرف مطبوعہ ادبی ذخیرے سے استفادہ کرتے تو یہ تاریخ ادب اپنی بہت سی خوبیوں سے محروم ہو جاتی۔اسی طریق کار کی وجہ سے جالبی نقل درنقل کی روایت سے بچ گئے اور اسی کا یہ فائدہ ہوا کہ انھیں متعدد ایسی تحریرون اور ادیبوں کا سراغ ملا جو پہلی بار انھیں کی تاریخ ادب کے ذریعے متعارف ہو رہے ہیں۔"[۱]

ڈاکٹر گیان چند نے ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو" کا جائزہ کافی تفصیل سے لیا ہے۔انکا خیال ہے۔

"ڈاکٹر جمیل جالبی نے وہ کام اپنے ذمے لیا ہے۔ جسے ادارے بھی سر نہیں کر سکتے۔انھوں نے اپنا ادبی تاریخ کا نظریہ جلد اول کے پیش لفظ میں سرسری طور پر اور جلد دوم کے حصہ اول کے پیش لفظ میں وضاحت سے پیش کیا ہے۔نظم ونثر کی دوئی کو انھوں نے بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔اور ہر ادیب کی نظم ونثر کا ایک ساتھ جائزہ لیا ہے۔اس سے ایک نقصان یہ ہوا کہ نثر کا ارتقا وضاحت سے سامنے نہیں آیا۔"[۲]

ڈاکٹر گیان چند آگے لکھتے ہیں۔

"رشید حسن خاں کو شکوہ ہے کہ جالبی صاحب نے ثانوی حوالوں پر تکیہ کیا ہے۔ میں حیرت میں ہوں کہ جالبی نے نمونے درج کرتے وقت کسی کثرت سے اصل ماخذوں کو دیکھا ہے۔ان ماخذ کی بنا پر میں یہ اعتراض کرنے پر مجبور ہوں کہ اردو ادب کے جس قدر تخلیقی اور تحقیقی کام ڈاکٹر جمیل جالبی کی نظر سے گذرے ہیں اتنے کسی دوسرے کی نظر سے نہیں گذرے۔دکنی ادب کے جتنے مخطوطات میں وہ ڈوب چکے ہیں

---

۱ مشفق خواجہ، مضمون اردو ادب کی پہلی تاریخ، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ء ص ۳۰۴

۲ ڈاکٹر گیان چند مضمون جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو۔ایک جائزہ،مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ء، ص ۳۳۳۔۳۳۴

اتنا کوئی معاصر محقق نہیں ہو سکا۔"[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی کی "تاریخ ادب اردو" کے بارے میں یونس احمر کا خیال ہے۔

"اس کتاب کی اعلیٰ قدر و قیمت میرے نزدیک یہ ہے کہ ڈاکٹر جالبی نے اپنے نقطہ نظر کو حوالوں اور پختہ ثبوتوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی ایک اور خصوصیت اس کا تہذیبی اور تاریخی پس منظر ہے۔ مثلاً اٹھارویں صدی میں قوع پذیر ہونے والے واقعات کا جب وہ ذکر کرتے ہیں تو ان کے سامنے اس دور کا سیاسی پس منظر تہذیبی و معاشرتی طرزِ فکر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ اردو ادب اپنی انفرادی تحقیق اور بیباک تحریر کی وجہ سے نہ صرف چونکا دینے والی ہے بلکہ ان سے تحقیق کا ایک نیا راستہ دکھائی دیتا ہے۔"[۲]

جو تبصرے ہمیں مہیا ہو سکے ہیں وہ ہم نے پیش کر دیئے ہیں شاید پاکستان میں زیادہ کتابیں موجود ہونگی۔

---

۱ ڈاکٹر گیان چند مضمون جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو۔ ایک جائزہ مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ء ص ۳۳۹

۲ یونس احمر مضمون پاکستانی کلچر اور تاریخ ادب اردو مشمولہ ارمغان سہ ماہی کراچی، جمیل جالبی نمبر، شمارہ ۳ (اپریل، مئی، جون ۹۶ء) ص ۸۸۔ ۹۱

تاریخ ادب اردو جلد دوم حصّہ دوم

مرزا محمد رفیع سودؔا

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب " تاریخ ادب اردو" کے جلد دوم کے حصّہ دوم کا آغاز مرزا محمد رفیع سودؔا سے کیا ہے۔ انکی شاعری اور زندگی کے حالات و کوائف پر تحقیقی نظر ڈالی ہے جو ۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ سودؔا سے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے۔ سودؔا کا اصل نام مرزا محمد رفیع ہے۔ مرزا محمد شفیع انکے والد تھے، جنکا پیشہ تجارت تھا سودؔا دہلی میں پیدا ہوئے انکے خاندان اور تعلیم وغیرہ کے بارے میں معلومات زیادہ تفصیل سے نہیں ملتی ہیں انکے نانا کے بارے میں کچھ مبہم سی باتیں ہیں شاہ کمال نے "مجمع الانتخاب" میں لکھا ہے کہ سودا کی والدہ نعمت خاں کی بیٹی تھیں اور قاضی عبدالودود نے ایک قلمی رسالے "ذکر مغنیان ہندوستان بہشت نشان" کا ذکر کیا ہے جس میں سودؔا کو مرشد قلی خاں کا نواسہ لکھا ہے۔ لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی ان دونوں سے متفق نہیں ہیں اور اس بارے میں انھوں نے اپنی رائے بھی نہیں دی ہے سودؔا کی اولاد کے سلسلے میں بھی کوئی یقینی رائے نہیں پیش کی ہے البتہ کچھ تذکرہ نگاروں کی رائے سے اندازہ لگانے کی کوشش ضرور کی ہے مثلاً قائم نے غلام حیدر کو مرزا صاحب کا خلف الرشید بتایا ہے۔ میر حسن نے خلف استاد لکھا ہے۔ مصحفی نے "پسر خواندہ مرزا رفیع" لکھا ہے۔ قدرت اللہ قاسم نے "سر آمد شعرائے فصاحت مرزا محمد رفیع سودا کے متبنّیٰ" لکھا ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ غلام حیدر مجذوب نے ایک شعر میں خود اعتراف کیا ہے کہ وہ سودؔا کے جانشین ہیں اس پر انھیں بہت فخر ہے وہ شعر اس طرح ہے۔

اے میر سمجھیو مت مجذوب کو اوروں سا　　ہے وہ خلف سودا اور اہل ہنر بھی ہے

اس اعتراف پر یقین کیا جاسکتا ہے ہے لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے۔

"سودا کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی اور انھوں نے غلام حیدر مجذوب کو گود لے کر بیٹے کی طرح پرورش کیا تھا۔" [۱]

اس شعر سے یہ بات کہاں ثابت ہوتی ہے کہ انھوں نے غلام حیدر کو گود لے لیا تھا ایسا لگتا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی طرف سے یہ رائے دی ہے سودؔا کی تاریخ پیدائش پر کافی بحث و مباحثہ رہا ہے۔

---

[۱] تاریخ ادب اردو جلد دوم حصّہ دوم ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۶۵۰

محققوں نے اپنی اپنی تحقیق کی رو سے اپنی رائے پیش کی ہے خاص طور سے ولادت سے متعلق دو تاریخیں زیر بحث رہی ہیں ۔ ۱۱۲۵ھ اور ۱۱۱۸ھ ۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ سودا ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے وہ اسکی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ''خوش معرکہ زیبا'' میں ایک فقیر کا قول لکھا ہے ''حیات و عمر تخلص کے ہم عدد ہوگی'' ۔

سودا کے عدد ۷۱ ہوتے ہیں ۔ انکا انتقال ۱۱۹۵ھ میں ہوا تھا ۱۱۹۵ میں سے ۷۱ نکال دینگے تو ۱۱۲۴ بچتے ہیں جس میں ۱۱۹۵ کے سال کا ایک جوڑنے سے ۱۱۲۵ ہوتے ہیں اس لئے سودا کی عمر ۱۱۲۵ھ نکالی گئی ہے ۔ محمود شیرانی نے جو تحقیق کی ہے ۔ اس سے سودا کا سال ولادت ۱۱۱۸ھ سے ۱۱۲۰ھ کے درمیان نکلتا ہے ۔ قاضی عبدالودود نے ۱۱۱۵ھ سے ۱۱۱۸ھ کے درمیان کا سال لکھا ہے ۔ ڈاکٹر خلیق انجم بھی ان ہی سالوں سے متفق ہیں ۔ اور ۱۱۱۸ھ کو انھوں نے صحیح مانا ہے ۔ رشید حسن خاں نے لکھا ہے کہ سودا بارہویں صدی کے دوسرے یا تیسرے عشرے میں پیدا ہوئے تھے ۔ میر حسن کے تذکرے پر ہم سب سے زیادہ بھروسہ کرسکتے ہیں ۔ کیونکہ انھوں نے سودا سے کئی بار ملاقات کی تھی جس کا ذکر انھوں نے ''تذکرہ شعرائے اردو'' میں کیا ہے ۔ اس وقت سودا کی عمر ۷۰ سال بتائی ہے ۔ انھوں نے یہ تذکرہ ۱۱۸۴ھ میں لکھنا شروع کیا تھا سودا سے انکی ملاقات فیض آباد میں ہوئی تھی یہ وہ زمانہ تھا جب ۱۱۸۸ھ میں نواب شجاع الدولہ کی حکومت تھی ۔ سودا فرخ آباد سے فیض آباد شجاع الدولہ کے زمانے میں آئے تھے اسی بات کی تصدیق مصحفی اور فائق رامپوری نے بھی کی ہے ۔ مصحفی ۱۱۸۵ھ میں اودھ پہونچے تھے ۔ اسی زمانے میں انکی ملاقات سودا سے ہوئی تھی ۔ مصحفی لکھتے ہیں ۔

> ''فقیر در عہد نواب شجاع الدولہ بہادر روزے برائے دیدن این بزرگ بخد متش رسیدہ بو بہ پرورش سگان ابریشم پشم شوق تمام داشت ۔ '' [۱]

میر حسن نے اپنا تذکرہ ۱۱۸۸ھ میں مکمل کیا تھا سودا کے حالات آخر میں لکھے تھے ۔ اس طرح ۱۱۸۸ھ میں سے ۷۰ نکال دیئے جائیں تو ولادت کا سن ۱۱۱۸ھ نکلتا ہے ۔ ڈاکٹر جمیل جالبی بھی ان تذکرہ نگاروں کی رائے سے متفق ہیں کیونکہ یہ حقیقت سے قریب ہے ۔

سودا نے جب شاعری کا آغاز کیا تو فارسی زبان کا چلن تھا ۔ انھوں نے بھی اس زبان کو اپنالیا اور اپنی شاعری کو بلندیوں پر پہونچایا ۔ لیکن آگے چل کر اپنی شاعری کا رخ اردو کی طرف موڑ دیا ۔ ایسا انھوں نے اپنے استاد خاں آرزو کی خواہش پر کیا تھا ۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ زبان اردو میں سودا کا ایک قطعہ لکھا ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سودا نے کسی کے کہنے پر اردو میں شاعری شروع کی تھی لیکن اس قطعے سے

---

[۱] تذکرہ ہندی، غلام ہمدانی مصحفی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۵ء ص ۱۳۳۔۱۳۴

یہ بات سامنے نہیں آتی کہ استاد خان آرزو کے کہنے پر انھوں نے اردو میں شاعری شروع کی تھی قطعہ اس طرح ہے۔

میں ایک فارسی داں کہا کہ اب مجھ کو
ہوئی ہے بندش اشعار فرس ذہن نشین
جو آپ کیجئے اصلاح شعر کی میرے
نہ پایئے غلطی تو محاورہ میں کہیں
کہا یہ بعد تائل کے دوں جواب تجھے
جو میری بات کا اے یار تجھ کو ہووے یقیں
جو چاہے یہ کہ کہے ہند کا زباں داں شعر
تو بہتر اس کے لیے ریختہ کا ہے آئین
وگرنہ کہہ کے وہ کیوں شعر فارسی ناحق
ہمیشہ فارسی داں کا ہو مورد نفریں
کوئی زبان ہو لازم ہے خوبی مضموں
زنانِ فرس پہ کچھ منحصر سخن تو نہیں
کہاں تک انکی زباں تو درست بولے گا
زبان اپنی میں تو باندھ معنی رنگیں

اس قطعے کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک حوالہ اور دیا ہے جس میں عاشق عظیم آبادی کا قول نقل کیا ہے۔انھوں نے بھی یہی لکھا ہے کہ استاد خان آرزو کے کہنے پر سودا نے اردو میں شاعری شروع کی تھی۔

سودا اردو میں شاہ حاتم کے شاگرد تھے اور فارسی میں خانِ آرزو سے مشورہ کیا کرتے تھے۔شاہ حاتم کا شاگرد ہونے کی تصدیق مصحفی اور قدرت اللہ قاسم نے بھی کی ہے۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ حاتم نے اپنے شاگردوں کے نام لوح دیوان لکھے ہوئے تھے اور قاسم نے اپنے استاد کا قول لکھا ہے کہ ہدایت اللہ نے حاتم کی زبان سے کئی بار یہ مصرع سنا تھا۔

''مرتبہ شاگردی من نیست استاد مرا''

یہ مصرع پڑھ کے استاد کہا کرتے تھے کہ یہ مصرع میری استادی اور مرزا کی شاگردی کے بارے میں کہا گیا ہے ۔ سوداؔ ۔ میرؔ دونوں معاصر تھے ۔ اور میرؔ سوداؔ کے بہت قائل تھے انھوں نے اپنے ''تذکرہ نکات الشعراء'' میں سوداؔ کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ اس طرح ہے۔

''مرزا (محمد) رفیع (سلمہ اللہ) المتخلص بہ سودا کہ جوانیست، خوش خلق وخوش خوے، گرم خوش یار باش، شگفتہ روے مولد اوشاہ جہان آباد است نوکر پیشہ غزل وقصیدہ مثنوی وقطعہ ومخمس رباعی ہمہ راخوب می گوید۔

سرآمد شعرائے ہندی اوست ۔ بسیار (خوش فکرو) جوشگو است بلا گردان ہر شعرش طرف لطف رستہ رستہ، درچمن بندی الفاظش گل معنی دستہ دستہ، ہر مصرع برجستہ اش راسرو آزاد بندہ، (۱) پیش فکر عالیش طبع عالی شرمندہ۔ شاعر ریختہ (۲) چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ اوراشاید ۔ قصیدہ درہجو (۳) (اسب) گفتہ (مسمّٰی) ''بہ تضحیک روزگار'' دوراز حد مقدور دراو صنعتہا بکار بردہ مطلعش انیست۔''[۱]

قائم نے لکھا ہے کہ سوداؔ کو کسی بادشاہ نے ملک الشعراء کا خطاب دیا تھا۔ لیکن بادشاہ کا نام نہیں بتایا ہے۔ شورش عظیم آبادی نے اپنے تذکرے ''یادگار دوستان روزگار'' میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ انھیں خطاب ملا تھا بلکہ یہ لکھا ہے کہ انھیں ریختہ گویوں کا ملک الشعراء ماننا چاہئے امر اللہ الہ آبادی نے تو اس بات کو کھول کر لکھا ہے کہ یہ غلط فہمی قائم کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی ۔ اہل ادب انکی شاعری سے متاثر تھے اور انھیں ملک الشعراء کا درجہ دیتے تھے یہ خطاب انھیں سرکاری طور پر نہیں ملا تھا شاید کسی اردو شاعر کو یہ خطاب نہیں ملا۔ حالانکہ سوداؔ کئی بادشاہوں کے درباروں سے منسلک رہے ۔ بہر حال سوداؔ ایک قادرالکلام شاعر تھے ۔ انھیں ملک الشعراء کا خطاب نہیں ملا یہ تعجب کی بات ہے ۔ شاعری کے ساتھ ساتھ سوداؔ کے کچھ اور مشغلے تھے جس میں موسیقی اور کتے پالنے کا شوق بھی شامل ہے۔ یہ کتے پالنے کا شوق اتنا زیادہ تھا کہ میر تقی میرؔ نے اس پر باقاعدہ ہجو بھی لکھی تھی ۔ اس شوق کا ذکر مصحفی نے بھی کیا ہے۔ جہاں تک موسیقی کا سوال ہے میر حسن سے پہلے کسی نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ میر حسن نے لکھا ہے کہ سوداؔ موسیقی کے ماہر تھے۔ عشقی عظیم آبادی اور مصحفی نے بھی انکے شوق کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں ان کا یہ شوق اس طور پر نمایاں نہیں ہوا تھا کہ

---

[۱] تذکرہ نکات الشعراء، میر تقی میرؔ، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو ۱۹۸۴ء ص ۴۸

معاصر تذکرہ نگار سودا کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے لیکن جب وہ فرخ آباد میں مہربان خاں رند کے متصل ہوئے تو نواب کی صحبت اور ذوق موسیقی نے ان کی ادبی صلاحیتوں کا ابھارا اور انھوں نے اس فن کی طرف اتنی توجہ دی کہ ان کا یہ ذوق قابلِ ذکر ہو گیا۔''[۱]

یہ ممکن ہے کہ جب سودا دہلی میں مقیم تھے تو ان کو ایسا کوئی شوق نہ ہو یہ شوق فرخ آباد جا کر ہی ہوا ہو۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس پر خاصی بحث کی ہے کہ سودا کب تک دہلی میں مقیم رہے اور کن درباروں سے وابستہ رہے۔ سودا ۱۱۷۳ھ تک دہلی رہے یہاں وہ محمد شاہ کے خواجہ سرا بسنت علی خاں سے وابستہ ہوئے۔ پھر سیف الدولہ احمد علی خاں بہادر اور انکے علاوہ نواب غازی الدین خاں عماد الملک کے دربار سے منسلک رہے۔ ۱۱۷۳ھ میں عماد الملک نے جلاوطنی اختیار کی اور سورج مل جات کے پاس چلے گئے۔ تو سودا بھی انکے ساتھ ساتھ چلے گئے۔ ۱۱۷۶ھ میں جب احمد خاں بنگش نے عماد الملک کو مدد کے لئے خط لکھا تو سودا بھی انکے ساتھ فرخ آباد پہونچ گئے عماد الملک کا وہاں پہونچنا اس لئے ضروری تھا۔ کیونکہ نواب شجاع الدولہ نے شاہ عالم کے ساتھ مل کر فرخ آباد پر حملہ کر دیا تھا۔ وہاں مہربان خاں رند نے عماد الملک سے سودا کو مانگ لیا سودا کے قطعہ تاریخ سے اسی بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۱۷۶ھ میں فرخ آباد میں موجود تھے۔ یہ قطعہ انھوں نے مہرباں خاں رند کی شادی پر لکھا تھا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک ثبوت اور پیش کیا ہے کہ شاہ حاتم نے سودا کی زمین میں جو غزلیں کہی ہیں وہ ۱۱۵۴ھ، ۱۱۵۹ھ، ۱۱۶۲ھ ۱۱۶۵ھ ۱۱۶۶ھ ۱۱۶۷ھ ۱۱۶۸ھ ۱۱۶۹ھ ۱۱۷۱ھ اور ۱۱۷۲ھ کی ہیں۔ یعنی سودا اس زمانے تک دہلی میں رہے۔ انکی ایک غزل ۱۱۹۳ھ میں ملتی ہے جب سودا لکھنو میں مقیم تھے یہ بات کچھ مبہم سی ہے اس کی مزید وضاحت ہونی چاہئے تھی۔

سودا کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں لکھنو میں ہوا سودا آصف الدولہ کے ساتھ فیض آباد سے لکھنو آ گئے تھے آغا امام باقر کے امام باڑے میں دفن ہوئے۔ لچھمی نرائن شفیق نے قطعہ تاریخ وفات لکھا ہے۔

لکھنو بیچ میرزائے رفیع

چوتھی رجب کی جان میں گذرے

جب کہ ------ کیا ہوئی تاریخ

ہائے سوداجیاں میں گذرے

---

[۱] تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ دوم، ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی۔۶، ۱۹۸۲ء ص ۶۵۶

مصحفی نے بھی ایک قطعہ تاریخ لکھا ہے۔جس کا آخری شعر یہ ہے۔

تاریخ رحلتش بدر آورد مصحفی

سودا کجا و آں سخن دلفریب او

ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ مصحفی نے قطعہ تاریخ وفات تب لکھا تھا جب انھوں نے سودا کے مزار پر میر فخر الدین ماہر کا قطعہ تاریخ وفات لکھا دیکھا تھا۔جس میں تعمیہ خلاف قاعدہ تھا جب کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لچھمی نرائن شفیق کا حوالہ دیا ہے۔

سودا ایک خوش مزاج اور دلچسپ انسان تھے ۔جس دربار سے منسلک ہوتے اپنی ایک جگہ بنالیا کرتے تھے سودا ہر حال میں اچھی طرح سے زندگی گذارتے تھے انکی شاعری کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے دوحصوں میں تقسیم کیا ہے تصانیف نثر اور تصانیف نظم نثر میں ایک مثنوی ''سبیل ہدایت'' کا اردو دیباچہ مثنوی ''عبرت الغافلین'' کا فارسی دیباچہ تیسرا شعلہ عشق اردو نثر چوتھا تذکرہ شعراء شامل ہیں تصانیف نظم میں دیوان غزلیات اردو دوسرا دیوان قصائد ہجویات ومراثی وغیرہ اور دیوان فارسی بھی شامل ہیں سودا کو سب سے زیادہ شہرت قصیدہ نگاری میں حاصل ہوئی اس صنف میں انکا کوئی حریف نہیں ہے۔انھوں نے فارسی کے بہترین قصیدوں کے مقابلے پر اردو میں قصیدے لکھے ۔ اور اردو قصیدہ کو فارسی کے برابر کھڑا کردیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ سودا پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہجو کو باقاعدہ طور پر ایک فن کا درجہ دیا۔قصیدہ کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس فن کو اعلی درجہ پر پہونچادیا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔وہ ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو ادب کی محققانہ تاریخ میں سودا کے کلام،سودا کی اردو شاعری میں ایک اہم شاعر کی حیثیت اور انکی شخصیت پر بہت وضاحت سے لکھا لیکن ابتدائی دور کے اردو تذکروں پر انھوں نے جو نظر ڈالی ہے وہ اس درجے کی ناقدانہ اور محققانہ نہیں ہے جس کی ایک عظیم ادبی تاریخ کے جائزے میں ضرورت تھی۔میر کا تذکرہ نکات الشعراء ۱۱۶۴ھ مطابق ۱۷۵۲ء میں لکھا گیا۔میر نے نکات الشعراء میں سودا کے کلام کا انتخاب دیا ہے وہ ۱۱۰۱اشعار پر مشتمل ہے۔ادب کی دنیا میں سودا قصیدے کے بادشاہ ہیں لیکن نکات الشعراء میں سودا کی غزل گوئی پر زیادہ زور دیا گیا ہے اسی طرح ۱۱۶۸ء میں قائم نے مخزن نکات لکھا اور اس میں بھی سودا غزل ہی کے شاعر نظر آتے ہیں۔

''تاریخ ادب اردو'' میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے کلیات سوؔدا کے کئی خطی نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ جس میں سب سے اہم حبیب گنج کا نسخہ کلیات سوؔدا جو ۱۱۷۴ میں لکھا گیا ہے اس کے علاوہ بھی کئی نسخے دنیا میں موجود ہیں لیکن کوئی نسخہ سوؔدا کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ لیکن ایک نسخہ ایسا ہے جو سوؔدا کی مرضی سے لکھنو میں انگریزوں کے نائب ریزیڈنٹ رچرڈ جونسن کے لیے لکھوایا گیا تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا کہ معاصر تذکروں میں سوؔدا کے کلام کا جو انتخاب دیا ہے وہ سوؔدا کے کن خطی نسخوں میں سے دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سوؔدا بحیثیت مجموعی قصیدے کے شاعر کی حیثیت سے ایک امتیاز کے مالک تھے۔ قصیدے میں انکی قادرالکلامی پر انگلی نہیں رکھی جاسکتی۔ لیکن اردو ادب کے تاریخ نگاروں اور نقادوں نے اسی معاملے کو نظر انداز کر دیا۔ مولوی عبدالحق کی نگرانی میں شیخ چاند کی تصنیف ''سوؔدا'' لکھی گئی۔ اس کے بعد آخری دور میں شمس الدین صدیقی اور خلیق انجم نے سودا پر توجہ کی۔ لیکن یہ سوال تشنہ تحقیق رہا کہ سوؔدا کے کلام کے اتنے خطی اور مطبوعہ نسخے کیسے سامنے آئے آخری دور میں پروفیسر عتیق صدیقی کے مرتبہ ''قصائد سودا'' سامنے آئے۔ اور منشاءالرحمٰن خاں منشاء نے ممنون پر جو تحقیق شائع کی سوؔدا اور میر ممنون کا کلام ایڈیٹ کر کے شائع کیا اس کے تقابلی مطالعے سے معلوم ہوا کہ ممنون کے قصائد جو ائمہ اطہار کی شان میں تھے وہ سوؔدا کے کلام میں شامل کر دیئے گئے مثلاً

''ممنون: لخت دل آہ سے جاتے ہیں بکھر وقت قلق [1]

سودا: لخت دل بکھرے ہیں یوں آہ سے ہنگام قلق [2]

ممنون: ہوا سے دشت ہے مثل چمن طرب مانوس [1]

سودا: ہوا ہے دشت برنگ چمن طرب مانوس'' [2]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے کلام سوؔدا میں الحاق کا اقرار تو کیا ہے جو بہت اہم ہے اور اس سے اردو ادب کی تاریخ صرف نظر نہیں کر سکتی۔ لیکن اس اہم موضوع پر انھوں نے کوئی بحث نہیں کی ہے۔ اس کے علاوہ مشفق خواجہ صاحب کے ''جائزہ مخطوطاتِ اردو'' کے بارے میں بھی کچھ بیان نہیں کیا ہے جبکہ مشفق خواجہ صاحب نے کلام سوؔدا کے قلمی نسخوں کی بڑی فہرست پیش کی ہے جو کافی اہم ہے۔

سوؔدا صرف قصیدے کے بادشاہ نہیں بلکہ اصل میں شوکتِ الفاظ ذخیرہ الفاظ نادر تشبیہات رمز و کنایہ کی زبان

---

[1]، [2] میر نظام الدین ممنون دہلوی حیات، شخصیت اور شاعری، ڈاکٹر منشاءالرحمٰن خاں، ص ۹۹

[1]، [2] قصائد سوؔدا عتیق احمد صدیقی ص ۱۹۹

میں استعارہ اورمحاکات کے بادشاہ بھی ہیں۔ اس لئے انگریزوں نے اپنے افسران کو اردو سکھانے کے لئے کلام سوؔدا کا انتخاب کیا۔ یہ سلسلہ فورٹ ولیم کالج سے لے کر ۱۸۵۷ء تک جاری رہا قاضی عبدالودود کے ادارہ تحقیقات اردو نے اور خود قاضی عبدالودود نے کلام سودا پر بہت توجہ کی ہے ادارہ تحقیقات اردو نے دو مجلدات شائع کئے ہیں جس میں کلام سوؔدا پر کچھ مضامین شامل ہیں۔

سوؔدا کی قصیدہ گوئی کے سلسلے میں جو تنقیدی رائیں ڈاکٹر جمیل جالبی نے دی ہیں وہ بعض اوقات غیر واضح اور اغلاق سے بھری ہوئی ہیں۔ جیسے انھوں نے پیچیدہ استعارے کے لفظ استعمال کئے ہیں۔ استعارہ ہمیشہ کچھ پیچیدہ ہوتا ہے استعارہ کی زبان براہ راست نہیں ہوتی۔

دوسری جگہ ڈاکٹر جمیل جالبی فرماتے ہیں ''سوؔدا کا ہر قصیدہ قافیہ پیمائی کا کمال ہے۔''[۱]

نہایت ادب سے عرض کرنا ہے کہ یہاں پہ خالی قافیہ پیمائی کی ترکیب استعمال کرنا فن شعر میں نقص سمجھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ ''پرانے علوم وفنون کی اصطلاحات واشارات سے عدم رواج کی وجہ سے آج قصیدہ کو عام پڑھا لکھا آدمی بغیر استاد کی مدد کے نہیں سمجھ سکتا۔''[۲]

انکی یہ بات بالکل سچ ہے سوؔدا کے قصیدے ہر آدمی آسانی سے نہیں پڑھ سکتا اس کو ایک استاد کی ضرورت ضرور پیش آئے گی۔

آخر میں کہا جاسکتا ہے کہ سوؔدا کی شخصیت اور شاعری سے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق وتنقید اردو ادب کی تاریخ میں گراں بہا کارنامہ نہ سہی لیکن قابلِ قدر کوشش ضرور ہے۔

۱، ۲ تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ دوم، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۶۹۷ / ۶۹۷

میر محمدی بیدار

''تاریخ ادب اردو'' جلد دوم کے حصہ دوم میں مختلف شعراء کا حال شامل ہے۔ ان میں میر محمدی بیدآر کی شخصیت نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بیدار پر خاص توجہ کی ہے۔ انکی شاعری اور حالاتِ زندگی پر تحقیقی نظر ڈال کر بیدآر کو اردو ادب سے روشناس کرایا ہے۔ اور انکے بارے میں وہ باتیں تلاش کر کے بیان کی ہیں، جو دوسرے تذکروں اور اردو ادب کی تاریخوں میں نہیں ملتیں۔

بیدآر کے بارے میں مختلف تذکرہ نگاروں نے الگ الگ رائے قائم کی ہے۔ انکے نام ونسب پر مختلف خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ ''یادگار شعراء'' میں اسپرنگر نے ایسے شاعروں کا ذکر کیا ہے، جن کا تخلص بیدآر ہے اور نام بھی تقریباً ملتے جلتے ہیں، لیکن استاد مختلف ہیں۔

> ''ایک میر محمدی ساکن دہلی شاگرد درد ہیں۔ اور دوسرے محمدی شاہ مرید فخر الدین ہیں۔ یہ آگرہ میں رہا کرتے تھے اور انھوں نے ۱۲۱۲ھ میں انتقال کیا اور اردو کے دو دیوان چھوڑ گئے۔ ان دو شعراء کے علاوہ عشقی نے ایک تیسرے بیدار کا ذکر کیا ہے، جن کا نام میر محمد علی ہے۔ مصحفی سے، جو ان کو جانتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ میر محمدی یا غالباً میاں محمدی ہیں۔ ''آگرہ'' جانے سے قبل دہلی کے قریب عرب سرائے میں رہا کرتے تھے۔''[۱]

اسپرنگر نے صرف ذکر کیا ہے۔ کسی کے بارے میں کوئی اطمینان بخش رائے نہیں قائم کی۔ حالانکہ تذکروں میں بیدار کے یہ تینوں نام ملتے ہیں۔ عبدالغفور نساخ نے ''سخنِ شعراء'' میں صرف اتنا تذکرہ کیا ہے۔

> ''بیدار تخلص میر محمد علی عرف میر محمدی دہلوی شاگرد مرتضٰی قلی خاں فراق ومرید حضرت مولانا فخر الدین شعر گوئی میں اچھی مشق پیدا کی تھی اکبر آباد میں جا کر راہی ملک بقا ہوئے صاحب دیوان گذرے ہیں۔''[۲]

---

۱ یادگار شعراء، اسپرنگر، مترجمہ طفیل احمد، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ۔ ۱۹۸۵ء ص ۳۹

۲ سخن شعراء عبدالغفور نساخ، ص ۴۷

''تذکرہ ءہندی'' میں مصحفی نے بیدار پر تفصیلی نظر ڈالی ہے۔ انکے حالات کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

''بیدار کہ میر محمد علی نام دارد بہ میر محمدی بیدار مشہور است شاگرد مرتضیٰ قلی بیگ فراق تخلص کہ شاعر فارسی گوگذشتہ جوانیست محمد شاہی قامت حال خود را بہ لباس درویشی آراستہ دارد یعنی پھینٹھ گیروی بر سر تاج می بندد و دیگر لباس او بطور دنیا داران است۔ درعرب سرائے اقامت دارد۔ دیوان ریختہ اش مشہور است۔''[1]

تذکرہ گل عجائب میں اسداللہ خان تمنا نے بیدار کا بہت مختصر ذکر کیا ہے

''معنی یاب خوش گفتار، بیدار۔ احوائش تفصیلاً معلوم نشدہ ظاہراً از ہنداست از وست۔''[2]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تحقیق کے ذریعے بیدار کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں' وہ توجہ کے قابل ہیں انھوں نے صرف اندازے نہیں لگائے اور نہ دوسرے تذکرہ نگاروں کی طرح سرسری ذکر کیا ہے۔ بلکہ انھوں نے ٹھوس ثبوت کے ساتھ تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ تاریخ ادب اردو میں بیدآر کا اصل نام شیخ عمادالدین لکھا ہے۔ تخلص بیدار تھا۔ گھر میں محمدی کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ بیدار کے زمانے میں میر محمدی مائل نام سے ایک شاعر گذرے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اُن کے نام کی مناسبت سے بیدار کے نام کے آگے میر لگا دیا گیا ہوگا۔ اور دوسری وجہ یہ رہی ہوگی کہ یہ دونوں ہی مولانا فخرالدین صاحب کے مرید تھے اتفاق سے دونوں محمدی کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ مائل کو میر سید ہونے کی وجہ سے پکارا جاتا تھا۔ انکے ساتھ ساتھ بیدار کو بھی میر کے نام سے پکارنے لگے۔

مصحفی اور میر حسن نے اپنے تذکروں میں بیدار کا نام محمد علی لکھا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس نام سے متفق نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محمد علی نام بیدار کے خاندان کے ناموں سے بالکل مختلف انداز کا ہے اور شیخ عمادالدین انکے بزرگوں کے نام سے مطابقت رکھتا ہے۔ انکے خاندان کا سلسلہ شیخ فریدالدین گنج شکر سے ملتا ہے۔ بیدار کے دادا کا نام شیخ رکن الدین، والد کا نام شیخ عین الدین

۱۔ تذکرہ ہندی، غلام ہمدانی مصحفی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو ۱۹۸۵ء ص ۳۹

۲۔ تذکرہ گل عجائب، اسداللہ خاں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو ۱۹۸۵ء ص ۳۲

اور چھوٹے بھائی کا نام امام الدین تھا۔ یہ بات کافی حد تک مانی جاسکتی ہے، مگر یقین نہیں کیا جا سکتا' کیونکہ بہت خاندانوں میں نام ایک دوسرے سے ملتے جلتے نہیں ہوتے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ''چمنستان رحمتِ الٰہی'' جو واحد یار خاں کی تصنیف ہے۔ اسکا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ اس میں واحد یار خاں نے اپنے مرشد حضرت عبداللہ فاروقی کا ذکر کیا ہے اس عبداللہ کے دادا اور والد کے ذکر کے ساتھ انکے تایا یعنی شاہ محمدی بیدار کا بھی ذکر کافی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ لکھا ہے کہ بیدآر بدایوں کے شیخ فاروقی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس خاندان کا تعلق فریدالدین گنج شکر کی اولاد سے تھا۔ یہ لوگ برسوں سے بدایوں میں بڑی تمکنت اور عزت کے ساتھ متمکن اور ساکن تھے۔ اسی لئے یہ خاندان شیخ فریدی کہلاتا تھا۔ بیدآر کے والد کی شادی حضرت سلیم چشتی کی اولاد میں ہوئی تھی۔ بیدار کی پرورش ننھیال میں ہوئی۔ انھوں نے تعلیم دہلی میں حاصل کی تھی۔ وہ مولانا فخرالدین سے اس حد تک عقیدت رکھتے تھے کہ ان کے دیدار کے لئے روزانہ عرب سرائے سے مدرسۂ غازی الدین خاں جایا کرتے تھے۔ عرب سرائے میں انکی رہائش تھی روز ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا مشکل ہوتا ہے۔ انسان ایسا حد سے زیادہ محبت میں ہی کرسکتا ہے۔ بیدار مولانا کو اس حد تک مانتے تھے کہ انکی خواہش کے مدِنظر انھوں نے دہلی سے اکبرآباد جاکر شیخ سلیم چشتی کے سجادہ ارشاد کو زینت بخشی اور وہیں ۲۷ ذی الحجہ ۱۲۱۰ھ/۴ جولائی ۱۷۹۶ء کو انکا انتقال ہوا وہاں آپ کا مزار ہے۔ ہر سال ۲۶۔۲۷ ذی الحجہ کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔ انکے مزار پر ایک قطعۂ تاریخِ وفات کندہ ہے۔

بیدار کہ بود فخر اہل عرفاں
ہر گہ کہ ازیں سرائے فانی بگذشت
تاریخ برائے رحلتش ہاتف گفت
''آں ہادی آفاق بحق واصل گشت''
۱۲۱۰ھ / ۱۷۹۶ع

اس قطعے کے ذریعے ہمیں بیدار کے حالاتِ زندگی کے بارے میں کافی کچھ معلومات فراہم ہوئی ہیں جن پر یقین کرسکتے ہیں ایک تو یہ انکا اصل وطن بدایوں تھا اور دوسری انکی تاریخِ وفات کا پتہ

چلتا ہے۔ جہاں تک انکی شاعری کا سوال ہے' تو ہمیں انکے دو دیوان کے بارے میں معلوم ہوا ہے ایک اردو میں ایک فارسی میں ہے وہ فارسی میں مرتضیٰ قلی خاں فراق کے شاگرد اور اردو میں خواجہ میر درد کے شاگرد رہے ہیں۔ انکی شاعری پر دردؔ کا اثر بہت نمایاں ہے۔ انھوں نے درد کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے دیوان بیدار کے بارے میں کہا ہے کہ وہ ۱۱۹۴ھ سے پہلے مرتب ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے مبتلاؔ لکھنوی کی گلشن سخن اور مصحفیؔ کے تذکرۂ ہندی کا ذکر بھی کیا ہے۔ لیکن میر تقی میرؔ کے تذکرہ نکات الشعراء کا حوالہ دیتے ہوئے صرف یہ لکھا ہے کہ میرؔ نے بیدارؔ کو جوان دیکھا تھا۔

جبکہ میر تقی میر نے اپنے تذکرہ میں یہ اطلاع بھی دی ہے۔

''صاحب دیوان است۔''[1]

اس اطلاع سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ بیدار کا دیوان ۱۱۶۴ھ کے آس پاس مرتب ہو چکا تھا کیونکہ تذکرہ نکات الشعراء ۱۱۶۵ھ میں مکمل ہوا تھا۔

بیدار کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخ ادب اردو میں لکھتے ہیں

''شاہ محمدی بیدار اس دور کے قابلِ ذکر شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں اس دور کی ساری آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انکے کلام میں ان شاعروں کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں جو ان سے پہلے گذرے مثلاً ولیؔ اور آبرو کی آوازیں اور ان بزرگ معاصر شعراء کی مثلاً شاہ حاتم اور مظہر جانجاناں کی آوازیں اور ان معاصر شعراء کی آوازیں بھی جن میں میرؔ، دردؔ، سوداؔ، قائمؔ، یقینؔ، تاباںؔ وغیرہ شامل ہیں۔ بیدار کا کلام انھی مختلف آوازوں کا مجموعہ ہے۔''[2]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے بیدار کے کلام پر بہت اچھے پیرائے میں تبصرہ کیا ہے۔ انھوں نے خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں پر بھی توجہ کی ہے۔ جگہ جگہ انکی غزلوں کے اشعار سے مثال دے کر کلام کے بارے میں رائے قائم کی ہے۔ انکا یہ کام قابلِ فخر ہے۔ انھوں نے ایک ایسے شاعر پر توجہ دی ہے جس پر ادب میں ایک مدت سے خاص توجہ نہیں دی جا رہی تھی۔ حالانکہ بیدار کے دیوان دو

---

[1] تذکرہ نکات الشعراء، میر تقی میر ، ص ۱۳۶

[2] تاریخ ادب اردو جلد دوم، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء، ص ۹۰۳

مرتبہ شائع ہو چکے تھے۔ پھر چند نقاد جیسے مجنوں گورکھپوری نے ان پر تفصیلی تبصرہ کیا اور دوسرے نقادوں نے صرف معمولی سا جائزہ لے کر چھوڑ دیا۔ انکی شاعری پُر اثر ہے۔ ابتدا میں بیدار کی شاعری میں گہرائی اور لطافت نہیں تھی۔ ایک ادھوراپن سا محسوس ہوتا تھا۔ لیکن جب انھوں نے میرؔ، دردؔ اور سوداؔ کی روایت کو اپنایا' تو انکی شاعری نے ایسی صورت اختیار کر لی جس میں گہرائی کے ساتھ دلکشی بھی تھی اور لطف بھی تھا۔

بیسوی صدی میں آزادی سے پہلے دو ادیبوں نے بیدآر کے دیوان ایڈٹ کئے۔ جلیل قدوائی نے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے دیوانِ بیدار مرتب کر کے شائع کیا اور محوی صدیقی نے مدراس (یونیورسٹی) سے دیوانِ بیدآر مرتب کر کے شائع کیا۔ یہ دیوان بیدآر جلیل احمد قدوائی کو بدایوں سے حاصل ہوا۔ اس دیوان کے کاتب بنی بخش ہیں۔ کتابت بہت اچھی نہیں ہے۔ کہیں کہیں املا کی غلطیاں ہیں۔ اس کا سائز بانگ درا کی طرح ہے۔ یہ ۱۴۷ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ۲۲۶ غزلیں، ۲۶ رباعیاں، ۲ نعتیہ مسدس اور ۱ مخمس شامل ہیں۔

جلیل قدوائی نے جو دیوانِ بیدار فراہم کیا۔ اس میں بیدآر کے اردو اور فارسی دونوں دیوانِ شامل تھے۔ جلیل صاحب نے اردو دیوان مرتب کر کے شائع کر دیا ساتھ ہی اس پر ایک جامع مقدمہ تحریر کیا' جس کے ذریعے ہمیں بیدار کے حالاتِ زندگی اور شاعری کے بارے میں کافی تفصیلی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ مقدمہ ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں شاعر کے نام و نسب سے لے کر انکی شاعری پر تبصرہ بھی شامل ہے۔ اس میں شاعر کا نام میر محمد علی عرف میر محمدی اور تخلص بیدار لکھا ہے۔ وہ دہلی عرب سرائے کے رہنے والے تھے۔

مولانا فخر الدین کے مرید تھے۔ اور انکی شخصیت کا بیدار پر اتنا اثر پڑا درویشی کا رنگ اختیار کر لیا۔ ساری زندگی صوفیانہ انداز میں گذار دی۔ آخری وقت میں آگرہ چلے گئے اور وہاں کڑہ دندان فیل میں قیام کیا اور دہلی سے ناطہ توڑ لیا۔ انھوں نے آگرہ میں ہی زندگی کو خیر باد کیا۔

بیدآر کا دیوان اردو ادب کی دنیا میں بہت کم لوگوں کی نظر سے گذرا ہے۔ جلیل صاحب کا کہنا ہے

''میرے علم میں علی گڑھ میں اس کا ایک ایک نسخہ مولوی احسن مارہروی

صاحب کے پاس ہے اور ایک نسخہ مولوی عبدالحق صاحب کے پاس ہے اور مولانا حسرت موہانی نے بیدآر کا دیوان دیکھا ہے کیونکہ انھوں نے ان کے کلام کا انتخاب عرصہ ہوا رسالہ اردوئے معلیٰ میں چھاپا تھا اور جگہ بھی شاید اس کے نسخے ہوں جن کا مجھے علم نہیں۔'' [۱]

ادب میں بیدآر سے بہت کم لوگ واقف تھے یہی وجہ ہے کہ انکا ذکر تذکروں میں بھی بہت مختصر سا دیا ہوا ہے جو لوگ واقف تھے انھوں نے بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی جبکہ انگی شاعری میں لطافت پائی جاتی ہے کلام روکھا پھیکا نہیں ہے پڑھنے والا محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہے گا۔ پھر بھی انکے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں تذکرہ نویسوں میں صرف میر حسن ایسے ہیں جنھوں نے ''تذکرۂ شعرائے اردو'' میں بیدار کے بارے میں زیادہ لکھا ہے۔ اور اپنی واقفیت بھی ظاہر کی ہے۔ ''تذکرہ شعراء اردو'' کا زمانہ تالیف ۱۱۸۸ سے ۱۱۹۲ کا اور ''نکات الشعراء'' کا زمانہ ۱۱۶۴ سے ۱۱۶۶ کا ہے۔ میر حسن نے بیدآر کو درویشی کے لباس میں دیکھا تھا اور میر تقی میرؔ نے ان کو جوان دیکھا تھا۔ لیکن تب انھوں نے درویشی اختیار نہیں کی تھی لیکن میر حسن نے بھی ان کو جوان ہی دیکھا تھا۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ درویشی کے وقت ان کی عمر ۳۰ یا ۳۱ کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ مولوی عبدالحئ اُن کا سن وفات ۱۲۰۹ھ لکھتے ہیں۔ اس حساب سے بیدار کی عمر تقریباً چونسٹھ برس کی رہی ہوگی۔ لیکن آگرہ میں میوہ کٹرہ کے پاس انکا مزار ہے اسکے پتھر پر سنِ وفات ۱۲۱۰ھ لکھا ہے جس پر یقین کیا جاسکتا ہے۔

بیدآر کے استادوں کے بارے میں بھی مختلف خیالات پیش کئے گئے ہیں۔ میر حسن کے خیال میں مرتضیٰ قلی بیگ فراقؔ بیدآر کے استاد تھے اور میر تقی میرؔ فراقؔ کو بیدآر کا دوست لکھتے ہیں مرزا علی لطف نے بیدار کے دوستوں میں خواجہ میر دردؔ کو شامل کرلیا ہے۔ مولوی عبدالحئ صاحب نے جو بات کہی ہے وہ دوسرے تذکرہ نویسوں سے مختلف ہے۔ حوالہ تو انھوں نے بھی نہیں دیا ہے۔ مگر انکا خیال ہے کہ بیدآر اردو میں خواجہ میر دردؔ کے شاگرد تھے اور فارسی میں فراق کے شاگرد تھے۔ ان تذکرہ نویسوں نے ثبوت نہیں پیش کئے ہیں۔ اس لئے کوئی بھی بات پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔ بیدآر کی شاعری میں کہیں کہیں دردؔ کا انداز موجود ہے۔ انھوں نے کچھ غزلوں پر تضمینیں بھی کہی ہیں۔ بیدار نے

۱؎ دیوان بیدار، جلیل احمد قدوائی، ص ۲

دردؔ کی وفات پر قطعۂ تاریخ بھی لکھا ہے۔ اس میں بھی شاگردی کے بارے میں واضح طور پر کوئی بیان نہیں ہے۔ جب تک کوئی بات ٹھوس ثبوت اور حوالوں کے ساتھ نہ کہی گئی ہو اس کو ماننا تحقیق کے اصول کے خلاف ہے۔

جلیل احمد قدوائی نے دیوانِ بیدارؔ میں لکھا ہے کہ

''بیدار کے تلمذ کی نسبت بغیر مکمل تحقیق کے میرا دل مطمئن نہیں ہوتا۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ وہ عام طور پر دردھی کے شاگرد سمجھے جاتے ہیں چنانچہ مجھے دورانِ تحقیق میں حکیم آغا جان عیش دھلوی کا ایک مقطع ملا ہے جس کے دیکھنے کے بعد لطف اور مولوی عبدالحئی کا یہ کہنا غلط نہیں معلوم ہوتا کہ بیدار اردو میں خواجہ میر درد کے شاگرد تھے وہ شعر یہ ہے۔

مجرم کا میں شاگرد وہ بیدار کے شاگرد

ہے عیش سلالہ مرا یوں درد و اثر تک۔''[۱]

اس شعر سے یہ بات کافی حد تک ثابت ہوتی ہے کہ بیدار خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ استاد کا اثر شاگرد پر اتنا تھا کہ کچھ غزلوں سے اگر مقطعہ نکال دیا جائے تو ان پر دردؔ کی غزلوں کا گمان ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں سادگی اور شیرینی پائی جاتی ہے۔ یہی سادگی اور شرینی درد کے کلام کا حصّہ ہے۔ یہ باتیں ہمیں مجبور کرتی ہیں کہ ہم بیدار کو درد کا شاگرد مان لیں۔ بیدار کا کلام سوز وگداز سے پُر ہے ان کے یہاں جذبات و وارداتِ عشق کے نہایت دلکش نمونے ملتے ہیں انکی شاعری میں اپنے زمانے کا پورا اثر پایا جاتا ہے۔ میر محمدی بیدارؔ کے وطن کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے نہایت غیر واضح اور مبہم بیانات دیئے ہیں کسی نے اُن کو دہلوی قرار دیا اور بعد میں ان کو آگرہ اکبر آباد کا ساکن بتایا۔ حد یہ ہے کہ مشہور محقق امتیاز علی خاں عرشی نے جب دستور الفصاحت ۱۹۴۳ء مصنّف حکیم سید احد علی خاں یکتا مرتب کر کے شائع کی اس میں بیدار اور ان کے وطن کے بارے میں کوئی واضح اطلاع نہیں دی جمیل جالبی نے بیدار کے وطن کے متعلق ایک غیر معروف کتاب ''چمنستانِ رحمتِ الٰہی'' مصنّف واحد یار خاں کا حوالہ دے کر یہ صحیح اطلاع دی ہے کہ میر محمدی بیدار بدایوں کے رہنے والے تھے۔ تذکرہ نگاروں میں قدرت اللہ شوق نے میر محمدی کو باشندۂ بدایوں بتایا۔ جلیل قدوائی کو دیوانِ بیدارؔ کا جو قلمی نسخہ ملا تھا' وہ بھی حضور احمد بدایونی کے ذریعہ سے ملا تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے

---

[۱] دیوان بیدار، جلیل احمد قدوائی ص ۶

بیدار کے بھتیجے عبداللہ بیتاب کا ذکر کیا ہے، جو بدایوں میں درگاہِ قادریہ مجیدیہ کے اندرونی ہال میں حضرت شاہ فضلِ رسول قادری کے برابر مدفون ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے بیدار کی وفات کا سن ۱۲۱۰ھ ٹھیک لکھا ہے۔ بیدار کا مزار آگرہ شہر کے بازار میوہ کٹرہ کے قریب اب بھی موجود ہے بیدار اپنے زمانے کے سب سے بڑے بزرگ حضرت شاہ فخر الدین چشتی (متوفی ۱۱۹۹ھ) کے مرید بلکہ خلیفہ ہیں۔ آگرہ کے معروف بزرگ شاہ امجد علی اصغر جعفری قادری سے ان کے خاص تعلقات تھے۔ لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے حضرت شاہ فخر الدین کی شخصیت کے بارے میں بہت کم لکھا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بیدآر پر جو کچھ لکھا اس میں بڑی حد تک تنقید اور تحقیق کا حق ادا کر دیا بیدار کا وطن بیدآر کا نام بیدآر کا نسب ان سب پر انھوں نے ہمیں کچھ نئے ، ماخذ سے بھی متعارف کرایا۔

محمد رفیع سودا اور بیدار کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ہم ''تاریخ ادب اردو'' کے جلد دوم حصہ دوم کے دوسرے شعراء پر بھی نظر ڈالیں گے۔ اس میں سب سے پہلے ہم خواجہ میر دردؔ کا جائزہ لیں گے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے دردؔ کو پانچویں باب میں شامل کیا ہے۔ انھوں نے خواجہ میر دردؔ کے حالاتِ زندگی کا بغور جائزہ لیا ہے۔ خواجہ میر نام دردؔ تخلص رکھتے تھے۔ پیدائش سے وفات تک کا سفر (۱۱۳۳ھ۔۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ/۲۱۔۱۷۲۰ء۔ ۷ جنوری ۱۷۸۵ء) ہے۔ والد کی طرف سے انکا سلسلۂ نسب حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند سے تھا۔ اور والدہ کی طرف سے سید عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے۔ یہ بخارا کے رہنے والے تھے۔

فارسی و عربی زبان کے ساتھ ساتھ دردؔ قرآن، حدیث، فقہ ہندی، تفسیر اور علم تصوّف سے بھی بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے پندرہ سال کی عمر میں فارسی زبان میں رسالہ تصنیف کیا جس کا نام ''اسرار الصلوٰۃ'' ہے اردو شاعری کی ابتداء بھی اسی وقت کی تھی۔ انکی پرورش مذہبی ماحول میں ہوئی تھی۔ شاہ گلشن سے بہت لگاؤ تھا۔ کیونکہ وہ انکے والد کے پیر صحبت تھے۔ اس کے علاوہ وہ شاعر اور موسیقی میں بھی خسروِ زماں مانے جاتے تھے خود بھی تصوّف، شاعری اور موسیقی کی طرف کافی جھکاؤ رکھتے تھے۔ انکا زیادہ وقت عبادت اور ریاضت میں گزرتا تھا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

> ''استقلال ان کے مزاج میں ایسا تھا کہ دلّی اجڑنے پر جب عزت دار بے عزت ہو گئے۔ اور اہلِ کمال ایک ایک کر کے دلّی چھوڑ کر باہر جانے لگے۔ وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے اور ساری تکلیفیں خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے۔''[1]

دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ انھوں نے دلّی کو ترک کرنا پسند نہیں کیا۔ وہ دلّی میں ہی پیدا ہوئے اور دلّی میں ہی وفات پائی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے خواجہ میر دردؔ کی تصانیف کی تعداد بارہ بتائی ہے۔ اس میں اسرار الصلوٰۃ، واردات، علم الکتاب، نالۂ درد، آہِ سرد، شمع محفل، دردِ دل، حرفِ تمنا، واقعاتِ درد،

---

[1] تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ دوم ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دلی ۶ ۱۹۸۲ء ص ۷۳۰

سوزِ دل، دیوانِ فارسی اور دیوانِ اردو شامل ہیں۔ ان تمام کتابوں کے بارے میں مختصراً لکھا ہے کہ کس کتاب میں کیا بیان کیا گیا ہے۔ انھوں نے میر دردؔ کے دو رخوں پر کافی تفصیلی بحث کی ہے۔ اس میں پہلا رُخ تصوّف ہے اور دوسرا عشق ہے۔ انھوں نے دردؔ کے دونوں پہلوؤں کو بہت ہی مؤثر طریقے سے سمجھایا ہے۔

دردؔ میرؔ و سوداؔ کے ہمعصر شاعر ہیں۔ انکی زبان بھی ان شاعروں کی زبان سے ملتی ہوئی ہے۔ جس طرح انکی زبان کے الفاظ متروک اور تبدیل ہوگئے اسی طرح دردؔ کے بھی کچھ الفاظ متروک اور بدل گئے۔ انکی زبان میں صفائی اور سادگی ہے اور محاوروں کا بھی خوبصورت استعمال ہے۔ مگر میر تقی میرؔ کی طرح انکی زبان خالص عوام کی نہیں تھی انکی زبان عوام و خواص دونوں کے لئے ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کی روایت کو آگے بڑھایا۔ وہ غزل کے ساتھ ساتھ رباعی کے بھی شاعر ہیں۔

چھٹے باب میں قائمؔ، میرؔ سوز اور میر آثر کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی قائم چاند پوری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جس پر پہلے ؒ سے ہی میر اور سوداؔ چھائے ہوئے تھے۔ حالانکہ قائمؔ بھی اپنے دور کے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں کچھ تذکرہ نگاروں نے قائم کا نام محمد قائم لکھا ہے۔ لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی اس کو غلط مانتے ہیں کیونکہ قائمؔ نے خود اپنا نام محمد قیام الدین بتایا ہے۔ وہ ضلع بجنور کے قصبہ چاند پور میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن بچپن میں ہی اپنے بڑے بھائی کے پاس دہلی چلے گئے۔ یہاں ہوش سنبھالا' تو سرکاری ملازمت کر لی۔ لیکن جب صفدر جنگ کی بغاوت اور خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہوا' تو قائم نے ملازمت چھوڑ دی اور خالی وقت کا فائدہ اٹھا کر تذکرہ لکھنا شروع کیا۔ جس کا نام ''مخزنِ نکات'' ہے، جو ۱۱۶۸ھ میں مکمل ہوا۔ انھوں نے ۱۱۶۹ھ میں نواب نعمت اللہ خاں دہلوی کے بیٹے کی شادی کا قطعۂ تاریخ لکھا ایک قطعہ احمد شاہ ابدالی کے دہلی سے چلے جانے پر لکھا اس کی تاریخ بھی ۱۱۶۹ھ نکلتی ہے لیکن ابدالی ۱۱۷۰ھ میں دہلی سے رخصت ہوا تھا یعنی ۱۱۷۰ھ تک قائم دہلی میں تھے اس کے بعد وہ وطن واپس چلے آئے۔ یہاں انھیں ایک بستی کا قاضی بنایا گیا۔ لیکن وہاں کے قاضی نے اپنے عہدے سے ہٹنے سے انکار کر دیا۔ قائم نے اس واقعہ پر ایک قطعہ لکھا پھر ۱۱۸۴ھ میں نواب محمد یار خاں امیر کی دعوت پر ٹانڈا آ کر ملازمت کر لی۔ ۱۱۹۰ھ میں لکھنؤ چلے گئے۔ زندگی کے آخری پڑاؤ میں وہ رام پور چلے گئے اور یہاں ۱۲۰۸ھ

میں انتقال ہوا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے قائم کو سودا اور میر درد کا شاگرد بتایا ہے۔ پہلے وہ درد کے شاگرد تھے لیکن جلدی ہی وہ سودا کے شاگرد ہو گئے۔ سودا کے ساتھ بھی انکا مزاج نہ مل سکا حد تو یہ ہے کہ سودا نے ان سے تنگ آ کر انکی ہجو بھی لکھی جو بعد میں صلح صفائی کے بعد فوقی کے نام سے منسوب ہو گئی سودا سے قائم کو لگاؤ بھی بہت تھا اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں۔

''سودا اور قائم کے اس طویل رشتے کا پتا اس بات سے چلتا ہے کہ قائم کا بہت سا کلام وفات کے وقت سودا کے پاس موجود تھا۔ جو وفاتِ سودا کے بعد غلطی سے کلیاتِ سودا میں شامل ہو گیا اور جو کلیاتِ سودا کے اس نسخے میں شامل نہیں ہے جو خود سودا کی نگرانی و زندگی میں جور چرڈ نسن کے لئے تیار کرایا گیا تھا؛ مثلاً قائم کی یہ مثنویات، حکایات اور اشعار غلطی سے سودا کے کلام میں شامل ہیں۔

ا۔ حکایت: سلف کے زمانے کا تاریخ داں
یہ لکھتا ہے احوال وارفتگاں [1]

(کلیاتِ قائم، جلد دوم: ص ۱۳۸۔۱۴۰)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی بات سمجھانے کے لئے صرف چند حکایات ہی پیش کیں۔ اشعار کی کوئی مثال نہیں پیش کی ہے۔

قائم کی دو تصانیف ہیں۔ ایک ''کلیاتِ قائم'' اور دوسری ''مخزنِ نکات''۔ ''کلیاتِ قائم'' میں ۴۰۷ غزلیات، ۱۹۹ اردو رباعیات، ۲ مستزاد رباعیاں، ۳۲ قطعات، ۴ متفرقات، ۷ مخمسات، مسدسات، ا ترجیع بند، ۱۳ قصائد، ۱۱ حکایات ۱۲ مختصر مثنویاں، ۳ طویل مثنویاں، ۳ سلام، ۴ مراثی کے علاوہ فارسی کی ۲۳ غزلیات، ۴ رباعیات، ۳ قطعات اور ایک سلام بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی نظر میں کلیاتِ قائم میں دو مخمسات بہت اہم ہیں۔ ایک ''شہر آشوب'' اور دوسرا ''در ہجو قاضی'' اس کے علاوہ انکی مشہور مثنویاں ''رمز الصلوٰۃ''، ''قصہ نٹ مسمی بہ حیرت افزا'' اور قصہ شاہ لدھا مسمی بہ عشق درویش'' یہ مثنوی غلطی سے ایک زمانے تک سودا سے منسوب رہی۔

انکی شاعری پر میر اور سودا دونوں کا بہت زیادہ اثر ہے۔ قائم کی زبان میں خوبیوں کے ساتھ

---

[1] تاریخ ادب اردو جلد دوم ڈاکٹر جالبی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۷۶۹

کمزوریاں بھی موجود ہیں۔انکی زبان پر دہلی کی زبان کے ساتھ ساتھ کھڑی بولی کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔قائم کے تذکرہ ''مخزنِ نکات'' کا شمار اہم تذکروں میں کیا جاتا ہے۔اس میں غیر جانبداری سے کام لیا گیا ہے۔انھوں نے کسی کی بھی بے جا تعریف نہیں کی ہے۔انھوں نے اپنے تذکرے کی تالیف کرتے ہوئے کئی مآخذ سے استفادہ کیا ہے۔ایک ''بیاضِ طالب''، دوسرا ''بیاضِ عزلت'' اور تیسرا ''مجمع النفائس'' ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے قائم کی شاعری کے بارے میں جس قدر بیان کیا ہے، اس سے کہیں زیادہ انکا دوسرے شاعروں سے مقابلہ کیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے قائم کے بعد میر سوؔز کے بارے میں لکھا ہے۔سوز کا نام محمد میر ہے اور تخلّص بھی میر رکھا تھا لیکن میر تقی میؔر کی شہرت بہت بڑھ گئی تو انھوں نے اپنا تخلّص سوز رکھ لیا۔سوز دہلی کے رہنے والے تھے اور دہلی میں ہی پیدا ہوئے۔انکے والد سید ضیاء الدین بخاری ایک بلند پایہ بزرگ اور حضرت قطب عالم گجراتی کی اولاد میں سے تھے۔

سوؔز تیراندازی اور گھوڑسواری میں ماہر تھے۔علم موسیقی سے بھی واقف تھے اور بلند پایۂ ہفت قلم خطاط تھے۔جس زمانے میں قائم نے دہلی چھوڑی اسی زمانے میں انھوں نے بھی دہلی کو خیر باد کہا۔ سوؔز، سوؔدا سے پہلے نواب مہرباں خاں رند کے متوسل ہو گئے۔سوؔدا سے انکے تعلقات میں کبھی کوئی دراڑ نہیں آئی۔ان سے شعر گوئی میں بھی مشورہ لیتے تھے۔۱۱۸۵ھ میں نواب احمد خاں کی وفات کے بعد وہ فرخ آباد سے فیض آباد آ گئے۔یہاں شجاع الدولہ کی حکومت تھی جب آصف الدولہ تخت نشین ہوئے تو سوؔز ان سے وابستہ ہو کر لکھنؤ آ گئے ۱۲۱۳ھ میں سوؔز نے وفات پائی۔

وہ بہت سادہ اور غریب پرور انسان تھے اور ساتھ میں بہت خوش گفتار بھی تھے۔انکے شعر پڑھنے کا انداز بہت انوکھا تھا انکی شاعری میں قصیدہ گوئی اور مدح سرائی کہیں نہیں ملتی۔سوؔز کی دو تصانیف ہیں ایک رسالہ تیراندازی جو اب ناپید ہو چکا ہے۔اور دوسرا دیوانِ سوؔز انکی بہت سی غزلیں دیوانِ رند میں موجود ہیں اور کچھ دیوانِ سوؔدا میں غلطی سے شامل ہو گئیں ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ سوؔز اپنے دور کے الگ شاعر ہیں۔انکی شاعری میؔر و سوؔدا اور درؔد و قائؔم سے مختلف ہے ان شاعروں جیسی گہرائی نہیں ملتی بلکہ وہ ظاہر کے شاعر ہیں۔جو کچھ انکو سامنے نظر

آتا ہے، وہ لکھ دیتے ہیں گہرائی میں جانے کی کوشش نہیں کرتے۔ سوز نے اپنا ایک الگ طرز ادا بندی کا رجحان پیدا کیا۔ انکا انداز سادہ ہے۔ وہ عشقیہ شاعری کرتے ہیں۔ مگر متانت اور سنجیدگی کے ساتھ انکی شاعری میں فارسی زبان کا استعمال بہت کم ہے۔ انکی شاعری میں خالص اردو زبان ہے۔ صفائی و سادگی ہے۔

قائم اور سوز کے بعد میر اثر کا ذکر آتا ہے محمد میر نام آثر تخلص رکھتے تھے خاندانی نسبت سے خواجہ اور سلسلے کی نسبت سے محمدی نام تھا خواجہ میر آثر دہلی میں ۱۱۴۸ھ/۳۶-۱۷۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ یہ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے۔ آثر اپنے بھائی کے زبردست مرید تھے۔ ان پر درد کا بڑا گہرا اثر تھا۔ کیونکہ انکی پرورش درد نے کی تھی اور اپنی مرضی کے مطابق انکو ڈھالا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میر آثر وہ نہ بن سکے جو وہ بن سکتے تھے۔

> بقول ڈاکٹر جمیل جالبی ''مثنوی 'خواب وخیال' کو پڑھ کر ایک ایسی مضطرب و بے قرار روح سامنے آتی ہے جس میں اعلیٰ درجے کا تخلیقی جوہر تھا۔ اور جس سے غنائی عشقیہ شاعری کے سدابہار پھول کھلائے جاسکتے تھے۔''[1]

ڈاکٹر جمیل جالبی کے قول سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کبھی کبھی انسان کسی کے زیر اثر اس حد تک آجاتا ہے کہ اپنے اندر کے فن کو دنیا کے سامنے کبھی نہیں لاسکتا اور اس طرح وہ دوسروں کے مطابق ڈھل جاتا ہے۔

خواجہ میر آثر نے تصوف، موسیقی اور تاریخ گوئی پر عبور حاصل کیا تھا۔ علم ریاضی کے بھی ماہر تھے۔ انکی تصانیف میں مثنوی ''خواب وخیال''، مثنوی ''بیان واقعہ'' اور دیوانِ آثر ہیں۔ میر آثر ہمارے سامنے ایک مثنوی نگار کی حیثیت سے آئے مثنوی ''خواب وخیال'' انکی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ جس میں آثر نے اپنی زندگی کے عشقیہ تجربے کو بڑی بے باکی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ یہ مثنوی دو دفعہ میں لکھی گئی ایک بار میں خالص جسمانی عشق اور سچے عاشق کی بے قراری بیان کی گئی ہے جو انھوں نے اپنے دوستوں سے بیان کی تھی ان لوگوں نے یہ اشعار اپنی اپنی بیاضوں میں محفوظ کر لئے اور اس طرح میر اثر کے عشق کا قصہ مشہور ہو گیا جو انکی پشیمانی کا باعث بنا۔ دوسری بار جب لکھی تو اس کو عشقِ حقیقی کا رنگ دے دیا۔

---

[1] تاریخ ادب اردو جلد دوم ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس ۱۹۸۲ء ص ۸۰۰

میر اثؔر مرضِ عشق میں بہت شدّت سے مبتلا تھے۔اور انکا علاج میر دردؔ نے اس طرح کیا کہ انھیں سو شعر لکھ کر دیئے۔اس سے آگے میر اثر نے لکھنا شروع کیا۔اپنے عشق اور خیالات کو اشعار کے سانچے میں ڈھال دیا اس طرح یہ مثنوی وجود میں آئی۔

''خواب وخیال'' ایک قابلِ ذکر مثنوی ہے۔اس میں ہیئت ،تکنیک اور ترتیب کا خاص خیال رکھا گیا ہے،لیکن بے جا طوالت ہے اور میر دردؔ کی غزلیں بھی بیچ میں آئی ہیں تو بری لگتیں ہیں ، پھر بھی اس میں جو عشق کی کیفیات بیان کی گئی ہیں ،وہ پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہیں۔مثنوی کے بیان میں جو صداقت اور روانی ہے وہ بھی متاثر کرنے والی ہے۔میر اثر کی زبان میں سادگی وسلاست ہے۔ انھوں نے عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔اپنی غزلوں میں بھی انھوں نے یہی طرز اپنایا ہے۔جسکی وجہ سے انکے یہاں ایک انفرادیت ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ساتویں باب میں میر حسن کا تذکرہ کافی تفصیل سے کیا ہے۔انکا نام میر غلام حسن اور تخلص حسنؔ تھا۔انکے والد میر غلام حسین ضاحک تھے۔میر حسن پرانی دہلی کے محلہ سید واڑہ میں پیدا ہوئے تھے۔انکی پیدائش کے بارے میں صرف اندازے لگائے گئے ہیں کسی بھی تذکرہ نگار کو انکی تاریخ پیدائش کا صحیح علم نہیں ہے۔تاریخ وفات پر بھی الگ الگ رائے پیش کی گئی ہے۔مصحفی نے میر حسنؔ کی عمر انتقال کے وقت ساٹھ سال بتائی ہے۔وفات کا سال ۱۲۰۱ھ/ ۸۷۔۱۷۸۶ء اور ولادت کا سال ۱۱۴۰ھ/ ۲۸۔۱۷۲۷ء تحریر کیا ہے قاضی عبدالودود کے اندازے سے انکی پیدائش ۱۱۵۰ھ کے آس پاس ہوئی تھی۔اس طرح سے الگ الگ خیال پیش کئے گئے ہیں۔لیکن حقیقت وہی ہوگی جو میر حسن نے اپنے تذکرے میں خود لکھی ہوگی۔ڈاکٹر جمیل جالبی کا بھی یہی خیال ہے کہ خود میر حسنؔ کے تذکرے سے اصلیت سامنے آجائے گی۔انھوں نے جو تاریخ میر حسنؔ کے تذکرے سے نکالی ہے وہ ۳۷۔۱۷۳۶ء نکلتی ہے۔

میر حسنؔ شروع میں فارسی زبان میں شعر کہتے تھے،لیکن جب فیض آباد آگئے ،تو اردو میں شاعری کرنے لگے۔یہاں وہ میر ضیاء سے اصلاح لینے لگے۔لیکن جب میر ضیاء عظیم آباد چلے گئے،تو وہ مرزا رفیع سوداؔ سے اصلاح لینے لگے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے میر حسنؔ کی دو تصانیف کا ذکر کیا ہے ایک ''کلیاتِ میر حسن'' دوسرا ''تذکرہ شعراء اردو'' ''کلیاتِ میر حسن'' انکے تمام کلام پر مشتمل ہے۔اس میں زیادہ تر

غزلیات اور مثنویات شامل ہیں۔ ''تذکرہ شعراء اردو'' میں شاعروں کے حالات اور انکے کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے مثنوی ''سحرالبیان'' کا کافی تفصیلی جائزہ لیا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے میرحسن کی دوسری مثنویوں کا بھی ذکر کیا ہے ان میں نقلِ کلاونت ،نقلِ زنِ فاحشہ،ہجوِ قصائی، نقلِ قصائی،مثنوی شادی آصف الدولہ،مثنوی رموز العارفین،مثنوی ہجو حویلی،مثنوی گلزارِ ارم،مثنوی درتہنیت عید،مثنوی در وصفِ قصرِ جواہر،مثنوی درخوانِ نعمت ہیں۔

میرحسن کے دیوان میں ۵۱۰ غزلیں ہیں۔انکی شاعری سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک طرف اپنے بزرگ شعراء کی پیروی کررہے تھے اور دوسری طرف اپنے دور کے جوان شعراء کا رنگ اختیار کر رہے تھے۔وہ رہنے والے تو دہلی کے تھے،لیکن شاعری فیض آباد میں شروع کی۔اس لئے یہاں کا رنگ انکی شاعری پر چھایا ہوا ہے۔

آٹھواں باب ''دوسرے شعرا'' کے عنوان سے ہے۔اس میں سب سے پہلے جعفرعلی حسرت کا ذکر کیا گیا ہے۔ان کا شمار ایسے شاعروں میں کیا جاتا ہے،جنھوں نے دہلوی روایت کے مقابلے میں لکھنوی روایت کو اہمیت دی ہے۔انکے شاگردوں کی تعداد زیادہ ہونے کا یہی سبب تھا۔

حسرت دہلی میں پیدا ہوئے۔انکی پیدائش کی صحیح تاریخ نہیں معلوم ہوسکی۔ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

> ''۱۱۴۷ھ اس لئے زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ احمد شاہ ابدالی کے حملے اور مخمس ''دراحوالِ شاہ جہاں آباد'' لکھتے وقت حسرت کی عمر تقریباً ۲۳ سال قیاس کی جاسکتی ہے۔''[۱]

مخمس ''دراحوالِ شاہ جہاں آباد'' حسرت کا تحریر کردہ ہے یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ۱۱۴۷ھ کو اعتبار کے لائق سمجھا ہے۔لیکن پوری طرح سے یقین وہ بھی نہیں کرتے ہیں۔

تاریخ ادب اردو''میں حسرت کی دو تصانیف کا ذکر ہے ایک ''کلیاتِ حسرت''اور دوسری ''طوطی نامہ''ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''طوطی نامہ'' کا ''سحرالبیان'' سے،موازنہ کیا ہے۔دونوں مثنویوں کے چند اشعار لے کر انکی خوبیاں اور خامیاں بیان کی ہیں۔انکے خیال میں حسرت نے

۱۔ تاریخ ادب اردو جلد دوم حصّہ دوم ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ص ۸۷۹

''سحرالبیان'' کو سامنے رکھ کر ''طوطی نامہ'' لکھی تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے موازنہ پر زیادہ زور دیا ہے۔ ''کلیاتِ حسرتؔ'' کا بھی سوداؔ کے کلام سے موازنہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ حسرتؔ کے کلام کی خصوصیات کو آٹھ حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں رعایت لفظی، ایہام، بال کی کھال نکالنے والی مضمون آفرینی، معاملہ بندی، تماش بینی اوراس سے پیدا ہونے والے معاملات، عشق پسند معاشرے کا ابتذال اور بوالہوسی، سنجیدگی میں سطحیت، ظاہر داری، تکلّف وتصنّع صنعت گری اہم ہیں۔ حسرت نے اپنی شاعری میں لکھنوی رجحان کونمایاں کیا ہے۔

حسرتؔ کے بعد میر محمدیؔ بیدار کا ذکر آتا ہے ان پر ہم شروع میں تفصیلی جائزہ لے چکے ہیں اب آگے شیخ قدرتؔ اللہ قدرت کا بیان کیا گیا ہے یہ شاہؔ قدرت کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے انھیں ایک ایسا شخص بتایا ہے، جوحق کی تلاش میں سرگرداں پھرتا ہے۔ وہ دنیا میں ایک قلندرانہ مزاج لے کر آئے۔

دہلی کے رہنے والے تھے۔ وہاں کے حالات بگڑے، تو ترکِ وطن کر کے لکھنؤ، عظیم آباد اور پھر مرشد آباد گئے۔ اس بات کی معلومات تذکروں سے ملتی ہے۔ تاریخ پیدائش ۱۱۲۵ھ اور وفات ۱۲۰۴ھ بتائی گئی ہے۔

شاہ قدرتؔ اردو کے شاعر تھے اور فارسی میں بھی شاعری کرتے تھے۔ انکی شاعری اس دور کے شاعروں سے بالکل مختلف تھی وہ عشق کا اظہار بالکل الگ طریقے سے کرتے تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے انکی شاعری کی مثال غالبؔ کی شاعری سے دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''شاہ قدرت اور مرزا غالبؔ میں مزاج اور لہجے کی ہم آہنگی صرف الفاظ وتراکیب کی مناسبت سے پیدا نہیں ہوئی، بلکہ یہ مناسبت دراصل اس ادراک و شعور سے پیدا ہوئی ہے، جو ان دونوں میں مشترک ہے۔''[۱]

انکی شاعری کی انکے اپنے زمانے میں کوئی اہمیت نہیں تھی کیونکہ انکے اندازِ سخن کو اس زمانے میں پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ آگے چل کر اس ناپسندیدہ انداز کو غالبؔ عرش کی بلندیوں پر پہونچا دینگے۔

قدرتؔ کے پسندیدہ موضوعات میں عبرت و بے ثباتیِ دہر بہت گہرائی سے شامل ہیں۔ اس پر

---

[۱] تاریخ ادب اردو جلد دوم حصّہ دوم ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ص ۹۱۴

انھوں نے بڑی خوبصورت غزل کہی ہے۔ میر حسنؔ نے اسی غزل کو ''مشہورِ عالم'' کا نام دیا ہے۔ مصحفی نے اپنے ''تذکرۂ ہندی'' میں لکھا ہے۔

''یک غزلش کہ برالسنۂ صغیر و کبیر جاریست وشہرتِ تمام یافتہ ۔''[۱]

آگے غزل بھی لکھی ہوئی ہے۔ قدرت کی شاعری اپنے دور کی شاعری سے مختلف ہے۔ اس میں الگ رنگ و آہنگ محسوس ہوتا ہے۔

قدرتؔ کے بعد ایک اور شاعر کا ذکر ملتا ہے جو ہدایت اللہ خاں ہدایتؔ کے نام سے جانے جاتے تھے۔ یہ بھی میرؔ و سوداؔ کے ہمعصر تھے۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ پیدائش اور وفات دہلی میں ہی ہوئی۔ صاحب دیوان شاعر تھے۔ میر درد کی شاگردی اختیار کی۔ طبابت انکا پیشہ تھا۔ انکے شاگرد قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے کہ ان کا دیوان نو ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ دیوان کے علاوہ کچھ مثنویاں بھی تھیں اور علمِ تصوف میں ایک رسالہ ''چراغ ہدایت'' کے نام سے لکھا تھا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے انکے کچھ اشعار بھی پیش کئے ہیں۔ جن کو سامنے رکھ کر انھوں نے ہدایت کی شاعری کے بارے میں رائے بھی قائم کی ہے انکے کلام میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو مقبول شعراء کی شاعری میں ملتی ہیں۔ انکے یہاں حسن و عشق بھی ہے۔ اور اخلاق و تصوف بھی ملتا ہے۔

آٹھویں باب کے آخری شاعر میر محمد حیات ہیں، جن کا تخلّص حسرت اور خطاب ہیبت قلی خاں تھا۔ یہ عظیم آباد کے ابتدائی شاعروں میں صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ دیوانِ حسرت کا ایک نسخہ ہے، جو رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ اس میں ایک نعتیہ مخمس، ایک مثمن، دو سلام اور تیرہ رباعیات کے علاوہ سب غزلیں شامل ہیں۔ اس دیوان میں بھی انکا سارا کلام موجود نہیں ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ انکے کلام میں وہ اثر اور گہرائی نہیں ہے، جو میرؔ و سوداؔ کے ہاں نظر آتی ہے۔ انکے یہاں دہلوی شاعری کا رجحان تو ہے، لیکن دہلوی شعراء کے کلام میں جو سوز و گداز ہے، وہ انکے یہاں نہیں ملتا۔ انکے جذبے میں حرارت کی کمی ہے۔ اسکی وجہ یہ بھی تھی کہ دہلی انقلابات سے گذر رہی تھی۔ جس کا اثر شاعروں اور ادیبوں پر ہوا تھا۔

حسرتؔ کی شاعری میں سادگی و سلاست ہے اسی سادہ انداز نے انھیں مقبولیت بخشی ہے۔ انکی

---

[۱] تذکرہ ہندی غلام ہمدانی مصحفی ص ۱۸۵

زبان میں صفائی سادگی اور روزمرہ، محاورہ کا استعمال ہے۔ آگے چل کر انکی شاعری میں لکھنوی رجحان بھی نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے نواں باب ''چند اور شعرا'' کے عنوان سے دیا ہے۔ اس میں جن شعراء کا ذکر ہے ان میں سب سے پہلے شیخ رکن الدین عشق کا نام ہے یہ مرزا گھسیٹا کے نام سے مشہور تھے۔ تاریخ پیدائش ۱۱۳۷ھ، ۱۷۲۴ء وفات ۱۲۰۳ھ، ۱۷۸۹ء ہے۔ شاہجہاں آباد میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ چالیس سال کی عمر میں درویشی اختیار کر لی اور عظیم آباد میں حضرت مخدوم منعم پاک کی صحبت اختیار کی۔ انکی بزرگی کا کافی فائدہ اٹھایا۔ انکے بعد حضرت برہان الدین سے بیعت کی۔ اس طرح رکن الدین عشق کا بڑے صوفیوں میں شمار ہونے لگا۔ انکے معتقدین کی بڑی تعداد تھی۔

رکن الدین عشق کی ایک کلیات ہے جو شائع ہو چکی ہے۔ جس میں ۹۸۰ غزلیات، تین مثنویاں۔ مثنوی حکایتِ سنار، ساقی نامہ اور مثنوی عارفانہ۔ سوز و گداز کے نام سے ایک واسوخت، پانچ تضمینیں، ایک نظم ''مطلعہا در مثل'' کے عنوان سے ہے۔ جس کے ہر مصرع ثانی میں ایک ضرب المثل کو باندھا گیا ہے اور ۸۱ رباعیات، دس قطعات بھی شامل ہیں، صوفیانہ موضوعات پر چند رسالے بھی لکھے ہیں۔

عشق کے کلام میں تصوّف ہے اور انداز سادگی لیئے ہوئے ہے۔ غزلیں زیادہ تر چھوٹی، بحر میں ہیں۔ انکی زبان عام بول چال کی زبان ہے، جس میں ہندی الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ انکو صوفیانہ شاعری میں مقبولیت حاصل تھی۔

عشق کے بعد انکے شاگرد مرزا محمد علی فدوی کا ذکر ہے جو مرزا بچھو کے نام سے مشہور تھے۔ یہ شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے۔ وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی، پھر ترکِ وطن کر کے لکھنؤ، فیض آباد اور عظیم آباد چلے گئے۔ یہاں فدوی مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرنے لگے۔

انکا ایک دیوان جو ''کلیاتِ فدوی'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں ۸۳۵ غزلیات، ۱۱۹ متفرق اشعار، ۳۳۸ رباعیات، ۶ مخمسات، ۱ واسوخت، ۲ ترجیع بند، ۱ ترکیب بند اور ۸ قطعات شامل ہیں۔ فدوؔی ایک پُر گو شاعر تھے۔ انکی شاعری میں اپنے زمانے کے شاعروں کا پورا پورا اثر تھا۔

لیکن انکے یہاں کوئی انفرادیت نہیں نظر آتی۔ یہ مشکل زمینوں میں شعر کہتے تھے۔ زبان پر قدرت حاصل تھی، جسکی وجہ سے شاعری میں لطف محسوس ہوتا تھا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اب فدوی کے شاگرد راسخ کے بارے میں بیان کیا ہے۔ نام شیخ غلام علی راسخ انکی پیدائش ۱۱۷۰ھ، ۵۷۔ ۱۷۵۶ء اور وفات ۱۲۳۸ھ، ۱۸۲۳ء میں ہوئی راسخ عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ راسخ فدوی کے شاگرد تھے۔ یہ بات پورے یقین سے نہیں کہی جاسکتی ہے۔ صرف شعر سے پتہ چلتا ہے۔ اس طرح میر کی شاگردی اختیار کرنے کا پتہ بھی انکے شعروں سے پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

''راسخ نے غالباً فدوی کی وفات کے بعد میؔر کی شاگردی اختیار کی اور اس پر اتنا فخر کیا کہ اپنی غزلوں کے کم از کم ۱۲ شعروں میں میر کا ذکر کیا ہے:

راسخ کو ہے میر سے تلمذ ☆ یہ فیض ہے ان کی تربیت کا

ڈاکٹر جمیل جالبی نے انکی دو تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ ایک علم عروض کے بارے میں ۳۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ایک رسالہ ہے جس پر سرخ روشنائی سے تحریر ہے۔

''رسالہ درفن عروض مشماة بخلاصة الخلاصم من تصنیف ملک الشعرا جناب شیخ غلام علی راسخ'' [۱]

''دوسری تصنیف کلیاتِ راسخ''، جس میں ۳۴۴ غزلیں، ۸ قصائد، ۱۵۰ قطعات مدحیہ، ۷۷ رباعیات، ۴ مخمسات، ۱ واسوخت، ۴ مرثیے اور ۱۵ مثنویاں شامل ہیں۔ راسخ کے کلام میں میؔر، سوؔدا اور دردؔ کا اثر ہے۔ انھوں نے عظیم آباد میں رہتے ہوئے بھی دہلوی روایت کو قائم رکھا تھا۔ انکے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فدوی کے انتقال کے بعد انھوں نے میر کی شاگردی اختیار کر لی تھی۔ شاید یہی وجہ ہوگی کہ ہمیں انکی شاعری میں دبستان دہلوی کا رنگ نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے راسخ کا میؔر سے مؤازنہ کیا ہے۔ راسؔخ نے اپنی شاعری میں میؔر کی پیروی کرنے کی کوشش کی ہے، جس طرح میر غزل اور مثنوی کے شاعر تھے۔ اس طرح راسؔخ نے بھی غزل اور مثنوی میں نام کمایا۔ ڈاکٹر جمیل

۱۔ تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ دوم ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۹۳۶

جالبی نے راسخ کی مثنویوں کو پانچ خانوں میں بانٹ دیا ہے عشقیہ، معاشرتی، اخلاقی، مدحیہ اور ہجویہ۔ انھوں نے ٢٠ مثنویاں لکھی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے انکی مثنویوں کی پانچوں قسموں پر کافی بحث کی ہے۔ ہر قسم کو الگ الگ بیان کیا ہے۔

راسخ کے بعد محمد روشن جوشش کا ذکر آیا ہے۔ یہ جسونت رائے کے بیٹے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب انھوں نے شعور سنبھالا تو اسلام قبول کر لیا کیونکہ بچپن سے ہی جوشش اسلام کی طرف راغب تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انکی والدہ کی تربیت کا اتنا اثر ہوا کہ وہ مسلمان ہو گئے۔

جوشش کی دو تصانیف ہیں۔ ایک دیوان جس کو سب سے پہلے قاضی عبدالودود نے مرتب کیا۔ اور بعد میں ایک اور خطی نسخے کی مدد سے کلیم الدین احمد نے مرتب کیا، جس میں ۵۹ غزلیں اور ٢١ اشعار ایسے ہیں، جو قاضی عبدالودود کے مرتب کئے ہوئے دیوان میں نہیں ہیں۔ نئے مطبوعہ دیوان میں ٦٦٩ غزلیں، ١٤١ متفرق اشعار، ١٤١ رباعیات، ٣ مخمسات، ٤ مثنویات، ٤ قطعات اور ۵ قصائد شامل ہیں۔

جوشش ایسے شاعر ہیں جنکی شاعری میں اپنے زمانے کا ہر رنگ موجود ہے۔ انکے یہاں ہمیں مضمون آفرینی نظر آتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو اور فارسی کے مخصوص مضامین کو اپنے شعروں میں ڈھالا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ انکی شاعری معیاری ہونے کے باوجود اس میں ربط اور رنگینی سے عاری ہے، کیونکہ جوشش نے دوسرے شعراء کے مضامین میں اپنے اشعار کو ڈھالا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے جوشش کے اور انکے بڑے بھائی محمد عابد دلؔ کے بارے میں لکھا ہے۔ انکی شاعری میں بھی وہی رنگ ملتا ہے، جو جوشش کے یہاں ہے۔ دونوں کی خوبیاں تقریباً یکساں تھیں۔ دلؔ عربی، فارسی، علمِ ہیئت، حساب اور طبابت میں ماہر تھے۔ انکی دو تصانیف ہیں۔ ایک ''دیوانِ دلؔ'' جس میں ٣٢٣ غزلیں، ٦ قطعات اور ١٢ رباعیات شامل ہیں۔ انکی دوسری تصنیف ''عروض الہندی'' ہے۔ اس رسالے میں قواعدِ عروض بیان کئے ہیں۔ انکی شاعری میں کوئی انفرادیت نہیں ملتی۔ انھوں نے اردو شاعری کی روایت کو آگے بڑھایا اور مذاقِ سخن کو عام کیا ہے۔

نویں باب کے آخری شاعر شیر محمد خاں ایمانؔ ہیں۔ انکی اپنے زمانے میں بڑی قدر و منزلت

تھی ۔ یہ استادِ وقت سمجھے جاتے تھے ۔ انھوں نے دکن میں رہتے ہوئے دہلی کی زبان کو بڑی خوبصورتی اور اعتماد کے ساتھ استعمال کیا تھا ۔ ایمانؔ حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور تعلیم و تربیت بھی یہیں حاصل کی تھی ۔ عربی اور فارسی زبان سے خوب واقفیت تھی ۔ تجلی علی شاہ تجلی انکے استاد تھے ۔ انکی ایک خوبی تاریخ گوئی تھی ۔ اس فن میں انھیں بڑا کمال حاصل تھا اور دکن کا ہر تاریخی واقعہ ان کے ذہن میں محفوظ تھا ۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے انکی جن تصانیف کا ذکر کیا ہے، ان میں دیوانِ ایمان، ''سردار نامۂ شطرنج''، رسالہ ''عروض و قافیہ'' اور ''گلدستۂ گفتار'' شامل ہیں ۔

ایمانؔ نے اپنی شاعری میں جو زبان استعمال کی ہے وہ دہلی کی روزمرہ زبان ہے ۔ قدیم زبان کا اثر انکے یہاں بالکل نظر نہیں آتا ۔ انکی شاعری میں مجلسی مزاج ہے ۔ اشعار کے موضوع سے باریک بینی اور مضمون آفرینی کا پتہ چلتا ہے ۔ وہ مشکل زمینوں میں بڑی روانی کے ساتھ شعر کہتے ہیں ۔ ''تاریخ ادب اردو'' کے جلد دوم کے حصہ دوم کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے ۔ ایک حصہ شاعری پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ نثر پر مشتمل ہے، جس میں پانچ ابواب ہیں ۔ ہر باب میں الگ الگ موضوع پر بحث کی گئی ہے ۔ اس حصّے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو نثر کے سرمائے کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے ۔

پہلے باب کا موضوع ''اردو نثر کے رجحانات اسالیب و ادبی خصوصیات'' ہے ۔ اس میں اٹھارویں صوی کی اردو زبان کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ کن کن راستوں سے گذری کس کس موڑ پر ٹھہری اور کیسے حالات سے گذر کر اپنی منزل تک پہونچی ۔ جب اٹھارویں صدی میں مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہو رہی تھی اور انگریزوں کا دور دورا تھا اور یہی وہ دور تھا جب فارسی کا رواج کم ہوتا جارہا تھا اردو کو لوگوں نے زیادہ سے زیادہ اپنایا ادب کی دنیا میں ہر طرف اردو زبان کا چرچا تھا ۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ اُردو نثر فورٹ ولیم کالج کی مرہونِ منت ہے ۔ انکے خیال میں

> ''اردو نثر فورٹ ولیم کالج سے بہت پہلے اپنا راستہ تلاش کر چکی تھی اور اس میں اتنی تصانیف وجود میں آچکی تھیں کہ ان کو نظر انداز کر کے اردو نثر کا پہلا مرکز فورٹ ولیم کالج کو کہنا کسی طرح درست نہیں ہے ۔''[۱]

---

[۱] تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ دوم ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۹۸۵

انھوں نے ان تصانیف کو دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دور میں اس اسلوب کو رکھا ہے جس پر فارسی زبان کے اثرات ہیں اور دوسرے دور میں اس اسلوب کو رکھا ہے، جس کی زبان بہت سادہ اور عام فہم ہے۔ اس کے علاوہ موضوع کے اعتبار سے بھی اس دور کی نثر کو تقسیم کیا ہے۔ اس کو چار حصّوں میں پیش کیا ہے تنقیدی و علمی نثر، مذہبی نثر، تاریخی نثر اور افسانوی نثر۔

اس طرح ڈاکٹر جمیل جالبی نے یہ بتانے کوشش کی ہے کہ اٹھارویں صدی کی اردو نثر کن حالات سے گذری اور کیا اثرات اس نے قبول کئے۔

دوسرا باب ''تنقیدی نثر اور اسالیب'' پر مشتمل ہے۔ اس حصّے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے چند شعراء کے اسلوب پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ ان میں سید برکت اللہ عشقی، مرزا محمد اسمٰعیل عرف مرزا جان طپش دہلوی، سید عبدالولی عزلت، مرزا علی نقی خاں انصاف حیدرآبادی، مرزا رفیع سودا اور محمد باقر آگاہ ایلوری وغیرہ شامل ہیں۔ ان شعراء کے اسلوب پر تنقید کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی کہ اس زمانے میں کس قسم کی نثر اور اسلوب کا رواج عام ہو گیا تھا۔

انکی نظر میں فارسی کا رواج بالکل ختم نہیں ہوا تھا حالانکہ عام بول چال میں اردو زبان حاوی ہو گئی تھی۔ مگر ادبی دنیا میں فارسی کا چلن خاصا تھا۔ تذکرے فارسی میں لکھے جارہے تھے۔ تاریخیں بھی فارسی میں لکھی گئی تھیں۔ عشقی کا ایک دیوان فارسی میں موجود ہے اور دو رسالے ''جواب و سوال''، ''عوارف ہندی'' بھی فارسی ہی میں ہیں۔ اس کے علاوہ ''عوارف ہندی'' کی کچھ امثال کا بھی ذکر کیا ہے۔ طپش دہلوی نے ایک فرہنگ مرتب کی، جس کا نام ''شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان'' رکھا۔ اس میں معنی کی تشریح فارسی زبان میں کی ہے اور ثبوت کے طور پر کچھ اشعار بھی پیش کئے گئے ہیں۔ اس میں اردو اشعار کی تعداد زیادہ ہے اور فارسی کے اشعار کم ہیں۔

عزلتؔ اور انصافؔ کا انداز الگ ہے۔ عزلتؔ نے اپنے اردو دیوان کا دیباچہ اردو میں ہی لکھا ہے۔ لیکن انکی نثر پر فارسی کی تھوڑی سی چھاپ ہے۔ مگر انصافؔ کی اردو نثر فارسی اسلوب میں رنگی ہوئی ہے انھوں نے اپنے رسائل کے مجموعے کا دیباچہ اردو نثر میں لکھا ہوا ہے۔

تیسرا باب ''مذہبی تصانیف اور اسالیب'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس میں اٹھارویں صدی کی مذہبی کتابوں اور اسلوب پر کافی بحث کی ہے۔ اس موضوع میں ڈاکٹر جمیل جالبی ان علماء کی

تصانیف زیر بحث لائے ہیں، جن کے ذریعے مذہب آسانی سے اور عام بول چال کی زبان میں عوام تک پہونچا ہے۔

انھوں نے سب سے پہلے فضلی کی ''کربل کتھا'' کو پیش کیا ہے ہندوستان مین اسلام دھیرے دھیرے آرہا تھا۔ اس میں تیزی لانے کے لئے علماء نے اردو زبان میں کتابیں لکھنا شروع کیں۔ واعظ کاشفی کی تصنیف ''روضہ الشداء'' کے خلاصے کو فضلی نے اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام کربل کتھا رکھا یہ کتاب مجلس میں پڑھی جاتی تھی۔ فضلی نے اس میں فنی توازن قائم رکھا ہے بیان میں جوش وولولہ ہے اور کتاب میں غم کا احساس ہوتا ہے۔ فضلی نے اردو نثر کو بہت بہتر بنا کر پیش کیا ہے۔ اسکی نثر اردو میں ہونے کے باوجود اسلوب پر فارسی کا خاصا اثر ہے۔ لیکن ایسا کتاب کے ابتدائی حصّے میں ہے آگے چل کر روزمرّہ کی عبارت نظر آتی ہے۔ اس میں افسانوی انداز مکالماتی، بیانیہ اور خطیبانہ انداز ملتا ہے۔ فضلی نے اردو زبان کو ایک فطری اسلوب دیا ہے۔ انکی زبان نہ تو ہریانوی نہ پنجابی ہے اور نہ دکنی بلکہ خالص اردو زبان ہے شاہ معین الدین حسین علی بھی اس موضوع کا ایک حصّہ ہیں۔ انھوں نے ایک فارسی رسالے ''جامِ جہاں نما'' کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ اس رسالے کا نام ''فتوح المعین'' ہے۔ اس کا دیباچہ فارسی میں لکھا گیا ہے۔ اس میں اردو اصطلاحاتِ تصوّف استعمال کی گئیں ہیں چونکہ اس رسالے کا موضوع فلسفۂ تصوّف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسکی نثر میں سنجیدگی ہے۔ مشکل موضوع کو آسان انداز میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس رسالے کا کچھ حصّہ مثال کے طور پر پیش کیا ہے تاکہ اسکی نثر کو سمجھا جا سکے۔

اٹھارویں صدی میں قرآن شریف کی تفسیریں لکھی گئیں اور کئی ترجمے کئے گئے ہیں۔ ان میں ایک اہم تفسیر ''پارۂ عمّ'' ہے، جو اردو میں لکھی گئی ہے۔ اس کو شاہ مراد اللہ نے لکھا ہے یہ ''تفسیرِ مرادیہ'' کے نام سے کلکتہ، بمبئی، کانپور اور لاہور میں چھپ چکی ہے۔ اسکا تاریخی نام ''خدائی نعمت'' ہے۔

شاہ مراد نے اسلام پھیلانے کا یہ آسان طریقہ نکالا کہ قرآن شریف کو ایسی زبان میں لکھا جائے، جس کو عام لوگ آسانی سے سمجھ سکیں۔ اس کے لئے انھوں نے اردو زبان کا انتخاب کیا۔ اس تصنیف میں جتنے اردو کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، اس سے پہلے شمال کی کسی تصنیف میں نہیں لائے گئے شاہ مراد نے اس تفسیر کو بہت سلیس اور سادہ زبان میں پیش کیا ہے۔ جملے کافی طویل ہیں، مگر

سننے اور پڑھنے میں الجھن نہیں ہوتی ہے۔ انکا انداز خطیبانہ ہے۔ اپنی بات کو بہت ہی وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

قرآن پاک کا ترجمہ کرنے والوں میں شاہ محمد رفیع الدین کا نام قابلِ ذکر ہے ترجمے کے علاوہ انھوں نے تفسیر بھی لکھی ہے جو ''تفسیرِ رفیعی'' کے نام سے جانی جاتی ہے یہ اردو میں لکھی گئی ہے اس میں سورۂ بقر کی تفسیر بیان کی گئی ہے اسکا اندازِ بیان بھی خطیبانہ ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس میں شاہ مراد اللہ اور شاہ رفیع کی نثر کا مقابلہ کیا ہے۔ دونوں انداز خطیبانہ ہیں۔ اسالیب میں سادگی ہے مگر شاہ مراد اللہ کے مقابلے میں شاہ رفیع اللہ کے یہاں بات کو مختصر پیرائے میں کہا گیا ہے انھوں نے لفظ بہ لفظ ترجمہ کیا ہے۔

شاہ عبدالقادر نے ''موضح قرآن'' کے نام سے قرآن شریف کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ انھوں نے لفظ بہ لفظ ترجمہ نہیں کیا ہے۔ کیونکہ انکا مقصد وضاحت تھا، جس کے لئے انھوں نے مناسب الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ قرآن مجید کا یہ ترجمہ اردو ہندی لغت کا ایک بڑا خزانہ ہے۔ اس ترجمے کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبدالقادر عام لفظوں کو نئے معنی دے کر انھیں نئی زندگی دے رہے ہیں اس میں کثرت سے ایسے عام الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جنھیں ہم آج بھی عربی و فارسی کے بجائے استعمال کر کے اپنے اظہار کو ایک نیا رنگ دے سکتے ہیں۔ شاہ عبدالقادر نے عربی لفظ کے لئے اردو کے مناسب لفظ کا استعمال کیا ہے مثلاً ضیاء کے لئے چمک نور کے لئے اجالا، حور کے لئے گوری اور عذابِ عظیم کے لئے بڑی مار وغیرہ۔

یہ حقیقت ہے کہ اس طرح کے الفاظ ایسے انداز میں کسی نے نہیں استعمال کئے یہ ایک انوکھا اور خوبصورت انداز ہے، جس سے پڑھنے والے کو لطف محسوس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے اسلوب کا فرق واضح کرنے کے لئے دونوں کے ترجموں کا حوالہ دیا ہے۔ اس میں سورہ یوسف کا ترجمہ پیش کیا ہے تاکہ فرق کا اندازہ ہو سکے۔ اس موضوع کے لئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے حکیم محمد شریف کا نام بھی فہرست میں رکھا ہے۔ انھوں نے قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر کی ہے۔ اس میں اردو زبان کافی صاف اور واضح ہے۔ الفاظ کی پابندیوں پر زور نہیں دیا گیا ہے اس کے علاوہ اور کتابیں بھی لکھی ہیں ان میں کاشف المشکوۃ، آثارِ نبوت، تالیفِ

شریفی، علاجِ امراض، دستورالقصد اور عجالہ نافعہ وغیرہ شامل ہیں یہ کتابیں عربی اور فارسی میں ہیں لیکن قرآن پاک کا ترجمہ اردو میں ہے۔

اس باب میں آگے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اردو زبان کو کسی وجہ سے لوگوں نے اپنایا جب ہندوستان میں مغربی قوموں نے قدم رکھا، تو انھوں نے اردو زبان کو اپنے مقصد کے لئے اپنایا۔ اس زبان کو سیکھا اس کے لغات و قواعد مرتب کئے۔ اس کے ذریعے یہ قوم ہندوستان سے تجارتی، معاشرتی، سیاسی اور تبلیغی رشتہ قائم کرنا چاہتی تھی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گئے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان کتابوں کے قواعد کو سمجھنے کے لئے دو اقتباس کے حوالے دیئے ہیں ایک ''حضرت عیسیٰ کی دعا'' اور دوسری ''اعتباری کا دعا ایچ'' وغیرہ۔

اس زمانے میں جہاں مسلمان علماء نے قرآن پاک کے ترجمے کئے وہیں، دوسرے مذہب عیسائی اور ہندؤں نے بھی بائبل اور بھگوت گیتا کے ترجمے کئے۔ انیسویں صدی کے آتے آتے اردو زبان نے بہت ترقی کر لی تھی۔ اس زبان کو سب نے اپنے اپنے مقصد کے لئے اپنایا لیکن یہ اپنانے کا عمل اردو کے حق میں بہتر ثابت ہوا۔

چوتھے باب کا موضوع ''تاریخی نثر، اس کا اسلوب'' ہے اس میں یہ بات زیرِ بحث ہے کہ تاریخی پیمانے پر اردو زبان کا کتنا استعمال ہوا ہے اس زمانے کی ایک تاریخی تصنیف ''قصہ واحوالِ روہیلہ'' سامنے آئی جو اردو نثر میں لکھی گئی ہے۔ ''قصہ واحوالِ روہیلہ'' سید رستم علی بجنوری کی تصنیف ہے۔ انھوں نے اس میں بیانیہ انداز اختیار کیا ہے جو دلچسپ ہے جملے چھوٹے چھوٹے اور مکمل ہیں۔ کہیں کہیں عربی و فارسی زبان کا اثر ہے۔ لیکن اردو زبان آہستہ آہستہ اپنا انفرادی لہجہ بدل رہی تھی اور اپنے وجود کو منوانے کی کوشش کر رہی تھی۔ رستم علی نے اس میں عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔ کھڑی اور روہیل کھنڈی بولی کا بھی اثر نظر آتا ہے۔ انھوں نے فارسی کے وہ الفاظ بھی استعمال کر لیئے ہیں جو روز مرّہ میں بولے جاتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ''قصہ واحوالِ روہیلہ'' کا اسلوب اردو نثر کا وہ نیا اسلوب ہے، جو اس زمانے میں عام ہو گیا تھا۔ اور بڑے بڑے علماء اور شاعر و ادیب اس کو اپنانا اپنی شان سمجھتے تھے۔

محمد رفیع سودؔا نے بھی اپنی مثنوی ''سبیلِ ہدایت'' کا دیباچہ اردو زبان میں لکھا ہے۔ جسکی

عبارت مقفّٰی اور مسجّع ہے۔ وزن کا بھی پورا خیال رکھا گیا ہے۔ محمد باقر آگاہ ایلوری نے بھی اپنی کئی کتابوں کے دیباچے اردو نثر میں لکھے ہیں۔ باقر نے اپنی نثر کو دکنی کہا ہے کیونکہ انھوں نے اپنی نثر کو فارسی کے اثر سے دور رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس زمانے میں پُر تکلّف اردو نثر لکھنے کا رواج تھا۔ باقر نے اس رواج کو ختم کرنا چاہا ہے۔

بقول جمیل جالبی کے ''اس دکنی نثر میں سوائے چند مخصوص الفاظ، جمع بنانے کے طریقے، علامت فاعل نے کو محذوف کر کے فعل کو براہِ راست فاعل کا تابع بنانے کے وہی معیاری زبان استعمال ہوئی ہے جو یکساں طور پر شمال اور دکن میں بولی جاتی تھی'' [1]

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کے خیال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ باقر اس رواج کو ترک تو کرنا چاہتے تھے مگر وہ فارسی نثر کے اثر سے بچ نہیں سکے کیونکہ اس زمانے میں فارسی کا اثر خاصا تھا۔

باقر آگاہ نے جو اردو نثر میں دیباچے لکھے ہیں، ان میں پانچ کتابوں کا ذکر ''تاریخ ادب اردو'' میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔ (۱) دیباچہ ہشت بہشت (۲) دیباچہ محبوب القلوب (۳) دیباچہ گلزارِ عشق (۴) دیباچہ ریاض الجنان (۵) دیباچہ دیوانِ ہندی (اردو) وغیرہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''تنقیدی نثر، اس کا اسلوب'' میں جن شعراء اور ادیبوں کا حوالہ دیا ہے انکی نثر اور اسلوب پر جو تبصرہ کیا ہے، وہ تو ٹھیک ہے، لیکن ان کے حالاتِ زندگی پر تبصرہ کچھ مناسب نہیں لگتا، کیونکہ موضوع کی مناسبت سے نثر اور اسلوب پر ہی لکھنا ضروری تھا۔

پانچویں باب کا موضوع ''افسانوی تصانیف اور اسالیب'' ہے۔ اس میں داستانوں کے نثری اسلوب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ سب سے پہلے نواب عیسوی خاں کی داستان ''قصہ مہر افروز و دلبر'' ہے۔ یہ قدیم داستانوں میں سے ایک ہے اٹھارویں صدی میں جس طرح کی داستانیں لکھی گئیں ہیں یہ بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ وہ سب خوبیاں جو داستان میں ہونی چاہئے۔ وہ اس میں موجود ہیں۔ اس کی زبان روز مرّہ کی بولی جانے والی ہے۔ اس میں سنسکرت اور پراکرت الفاظ کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس پر ہریانی، پنجابی، برج بھاشا اور کھڑی اور بندیلی بولی کے بھی اثرات ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اردو زبان نے ہندوستان کے ہر حصّے کی بولی کو اپنے اندر سمو لیا تھا۔ اس

---

[1] تاریخ ادب اردو جلد دوم حصّہ دوم ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۱۰۱۱

سے ہم اردو زبان کی وسعت کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ اس داستان پر سب سے زیادہ کھڑی بولی کا اثر تھا۔ کیونکہ عیسوی خاں کو ہندی زبان سے گہری واقفیت تھی۔ اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اسکی نثر فارسی زبان سے آزاد ہوتی نظر آرہی ہے۔

اسی زمانے کی ایک تصنیف ''نوطرزِ مرصّع'' ہے۔ اس کے مصنّف میر محمد حسین عطا خاں تحسین ہیں۔ یہ انکی اپنی تخلیق نہیں ہے۔ اس کو قصہ ''چہار درویش'' سے لیا گیا ہے۔ یہ فارسی میں لکھا گیا تھا۔ تحسین نے جب اس کو سُنا تو انکے دل میں اس قصّے کو اردو زبان میں لکھنے کا خیال پیدا ہوا انھوں نے اس مین ایک نیا پن پیدا کیا اردو کو فارسی کے ساتھ ملا کر لکھا اس طرز کو مرصّع سازی کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا قول بالکل ٹھیک ہے۔

''یہ قصّہ نہ ہندی الاصل ہے اور نہ فارسی الاصل بلکہ ان دونو تہذیبوں کے صدیوں کے میل ملاپ کا نتیجہ ہے''[۱]

اس زمانے میں ہندوستان اور ایران کی تہذیبوں کا سنگم ہو رہا تھا۔ ''نوطرزِ مرصّع'' پر اس میل جول کا بہت اثر پڑا اس کا اسلوب مقفّی و مسجّع ہے عبارت رنگین مگر مشکل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے جو ''نوطرزِ مرصّع'' کے اسلوب پر طویل بحث کی ہے۔ انھوں نے تین اقتباس کی مثال دے کر اسلوب پر روشنی ڈالی ہے۔

جب انگریزوں نے ہندوستان میں قدم رکھا تو ملک میں ہر قسم کی تبدیلیاں ہونے لگیں۔ اردو زبان کا چلن عام ہوگیا۔ انگریز حکمرانوں کو سیاست کرنے کے لئے اردو سیکھنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ ایسے وقت میں مہر چند مہر نے ''نوآئینِ ہندی'' کے نام سے ایک داستان لکھی۔ اس کی نثر پر انھوں نے خاص توجہ دی۔ اسکی نثر عام فہم اور سادہ ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس قصّے کو لکھنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس وقت کینلی نام کے کسی انگریز کو مہر اردو پڑھا رہے تھے ایسے میں انھیں ایک ایسی کتاب کی ضرورت محسوس ہوئی جس کو ہر آدمی آسانی سے سمجھ سکے۔ اسی لئے انھوں نے ''نوآئینِ ہندی'' لکھ کر اس ضرورت کو پورا کیا۔

منشی مہر چند کھتری کے حالاتِ زندگی کے بارے میں مختلف رائیں پیش کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے جگر کے ''تذکرۂ بے جگر'' کو مستند قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ مہر نے اپنے حالات خود بے جگر کو لکھ کر

---

[۱] تاریخ ادب اردو جلد دوم حصّہ دوم ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ص ۱۰۹۸

بھیجے تھے۔ گیان چند بھی ڈاکٹر جمیل جالبی سے متفق نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب ''اردو کی نثری داستانیں'' میں جمیل جالبی کا حوالہ دیا ہے۔

''مہر چند کھتری کے حالات کا بہترین ماٗخذ خیراتی لعل بے جگر کا ''تذکرۂ بے جگر'' ہے۔ یہ ۱۲۲۵ھ اور ۱۲۳۷ھ کے بیچ مرتب ہوا خود مہر نے اس کے لئے اپنے حالات لکھ کر بھیجے تھے۔ اس لئے یہ مستند ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی ''تاریخ ادب اردو'' جلد دوم میں ان کا خلاصہ دیا ہے''۔ [۱]

مہر نے ''نوآئین ہندی'' میں ایسی نثر کا استعمال کیا ہے، جو سادہ اور عام فہم ہے۔ لہجے میں تصنع اور تکلف کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ فارسی وعربی کے ان الفاظ کا استعمال ہے۔ جو عام طور پر لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے جگہ جگہ اشعار اور دوہے لکھے ہوئے ہیں پھر بھی نثر میں سادگی نظر آتی ہے۔

اس باب کے آخری شاعر سید حسین شاہ حقیقت ہیں۔ انکی تصنیف ''جذبِ عشق'' ہے۔ یہ اردو کے شاعر ہیں۔ فارسی اور اردو نظم ونثر میں بھی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ صنم کدۂ چین، جذبِ عشق، تحفۃ العجم، خزینۃ الامثال، مثنوی ہشت گلزار، ہیرامن طوطا، دیوان حقیقت اور تذکرۂ احباء وغیرہ۔

حقیقت کے بڑے بھائی شاہ ضبط نے جذبِ عشق کو فارسی میں لکھا تھا۔ ان کے کہنے پر حقیقت نے اس داستان کو اردو میں لکھا۔ اسکی عبارت صاف، سادہ اور دلچسپ ہے۔ اور اس میں اپنے استادوں کے اشعار درج کئے ہیں۔ اسکی خوبی یہ ہے کہ نظم ونثر ایک دوسرے میں جذب ہوگئیں ہیں۔

اس حصے میں ہمیں شاہ عالم ثانی کی تصنیف ''عجائب القصص'' کا بھی ذکر ملتا ہے۔ یہ انیسویں صدی کے بادشاہ تھے۔ انھیں شعر وشاعری سے کافی رغبت تھی۔ ادبی ذہن ہونے کی وجہ سے انھوں نے یہ قصہ تصنیف کیا۔ اردو زبان استعمال کرنے والوں کے لئے یہ اہم کتاب ہے۔ اس کا اسلوب بہت معیاری ہے۔ اس میں ایسی اردو نثر کا استعمال کیا گیا ہے جس کو عوام وخواص دونوں نے اپنایا ہے۔ اس میں فارسی زبان سے دوری اختیار کی گئی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس بات پر کئی بار توجہ دلائی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے وجود میں آنے سے پہلے اردو نثر کا رواج عام ہوگیا تھا وہ اس بات کو

---

[۱] اردو کی نثری داستانیں، گیان چند ص ۲۰۹

ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ فورٹ ولیم کالج میں سب سے پہلے ایسی تصانیف لکھی گئیں جن کی زبان عام بول چال کی تھی انھوں نے ثبوت کے طور پر ''عجائب القصص'' کو پیش کیا ہے جو فورٹ ولیم کالج سے پہلے کی تصنیف ہے اس میں روزمرہ کی زبان پیش کی گئی ہے۔

دیوانِ حسن شوقی

بیسویں صدی کے آغاز میں دکنی ادب پر تحقیق وتدوین کا کام شروع ہوا۔ اس سے پیشتر کسی کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا خاص طور پر شمالی ہند کے محققوں نے اس طرف بالکل توجہ نہیں دی تھی۔ یہی وجہ ہے تھی کہ ابتدائی اردو کے بارے میں کوئی خاص جانکاری نہیں تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں دکنی ادب کی تلاش وتحقیق کے مرحلے کو سر کرنے کی جن حضرات نے کوشش کی، ان میں چند معتبر نام شامل ہیں۔ مولوی عبدالحق۔ محی الدین قادری زور، حکیم شمس اللہ قادری، عبدالقادر سروری، نصیر الدین ہاشمی، سید محمد میر سعادت علی رضوی اور عبدالمجید صدیقی وغیرہ۔

ان لوگوں کی تلاش اور کوششوں سے دکنی ادب پر جو کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں تحقیق پر توجہ بہت کم ہے اور تدوین پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ شاید ایسا اس لئے کیا گیا کہ یہ لوگ قدیم ادب کو محفوظ کرنا چاہتے تھے کیونکہ اگر تدوین کا کام نہ ہوتا تو تحقیق کے بارے میں کوئی سوچ بھی کیسے سکتا تھا۔ ان کتابوں سے نئے آنے والوں کے لئے تحقیق کی راہیں مہیا ہو گئیں۔

۱۹۶۵ء میں قدیم دکنی ادب پر دوبارہ تحقیقی کام شروع ہوا۔ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو سے ''قدیم اردو'' کے نام سے ایک مجلّہ شائع ہوتا ہے اس میں قدیم دکنی ادبیات کے منتخب متون کو صحت کے ساتھ مرتب کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ ''قدیم اردو'' کے ابتدائی شمارے آج بھی تحقیق وتنقید اور تدوین متن کے مستند نمونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دکنی ادب کی تحقیق کے سلسلے میں زیادہ تر محققین دکن ہی کی پیداوار ہیں یا پھر جامعہ عثمانیہ سے تربیت حاصل کئے ہوئے ہیں لیکن جنھوں نے دکن سے دور رہ کر وہاں کے ادب کو ترتیب دینے اور تحقیق کا مرحلہ سر کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سرفہرست ڈاکٹر جمیل جالبی کا نام آتا ہے۔ انھوں نے دور رہ کر ایک ایسا قدم اٹھایا کہ اہل دکن کو پیچھے چھوڑ دیا اور اپنی کوشش سے سات پردوں میں چھپے ہوئے قدیم ادب کو منظر عام پر لے آئے۔

تحقیق کا اصل مقصد حقائق کی تلاش ہے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ تلاش وجستجو سے تمام

معلومات حاصل کی جائیں۔ وہ معلومات ایسی ہوں کہ دلیل دیتے وقت کام آسکیں اور اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ جن مآخذ سے کام لیا جائے وہ نہ تو مشکوک ہوں اور نہ ان میں بہت زیادہ قیاس آرائی سے کام لیا گیا ہو۔ ہو سکے تو براہ راست مآخذ سے استفادہ کرنا چاہیے ایسا کرنے سے غلط فہمیوں سے بچا جا سکتا ہے۔

اردو ادب میں تنقید اور تحقیق دونوں الگ الگ راستوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک نقاد تحقیق کا کام کرے یہ ایک انوکھی اور غیر متوقع بات ہے۔

بقول وحید قریشی ''نقادوں کے نزدیک تحقیق محض ایک میکانکی عمل ہے اور محققین کے نزدیک کسی ادب پارے سے تنقیدی نکات کا استخراج دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے۔''[1]

مگر ڈاکٹر جمیل جالبی نے تنقید و تحقیق دونوں کا بیڑا اٹھا کر یہ ثابت کر دیا کہ انھیں ایک ساتھ ایک راستے پر چلانا کوئی مشکل کام نہیں۔ بلکہ محقق میں تنقیدی شعور کا ہونا اچھی بات ہے۔ اس طرح تحقیقی کام اعلیٰ طریقے سے تکمیل کو پہونچ سکتا ہے۔ دکن کے ادب کی تحقیق اور تدوین کے سلسلے میں انھوں نے بہت احتیاط، صبر اور واضح دلیلوں کے ساتھ ان خدمات کو انجام دیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی پہلی تحقیقی کتاب ''دیوان حسن شوقی'' ہے یہ کتاب ۱۹۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور ۱۹۷۱ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کی جانب سے شائع ہوئی۔ اس میں دو مثنویاں ''فتح نامہ نظام شاہ'' اور ''میزبانی نامہ'' تقریباً تیس غزلیں اور ایک نظم شامل ہے حالانکہ اس سے پہلے شوقی کی دو مثنویاں اور تین غزلیں مولوی عبدالحق صاحب منظر عام لا چکے تھے اور انکے بعد مولوی سخاوت مرزا اور ڈاکٹر حسینی شاہد کم از کم آٹھ غزلیں دریافت کر کے اردو ادب سے روشناس کرائیں لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس گمشدہ ادب کو تلاش کرنے میں اپنے دو سال انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانہ خاص میں صرف کر دئے۔ شوقی کی وہ غزلیں جو مختلف قدیم بیاضوں میں بکھری پڑی تھیں ان کو یکجاں کر کے ترتیب دیا اور ایک کتاب کی شکل میں پیش کیا۔ انھوں نے تحقیق و تدوین اور تنقید متن کے جدید اصولوں کی روشنی میں قدیم اردو کے ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر کے کلام کو مرتب کر کے ''دیوان حسن شوقی'' کے نام سے پیش کیا ہے۔

---

[1] ڈاکٹر وحید قریشی، مضمون دیوان حسن شوقی، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نوشاہی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ء، ص ۲۶۲

''دیوان حسن شوقی'' میں انھوں نے سب سے پہلے ایک فاضلانہ مقدمہ تحریر کیا ہے جو ۶۸ صفحات پر مشتمل ہے اور معلومات سے پر ہے اس میں شوقی کے بارے میں جو کچھ اطلاعات فراہم ہوسکیں ہیں وہ تحریر کردی گئیں ہیں انکی پیدائش کب ہوئی اور زندگی کس طرح گذری۔ یہ سب تو نہیں دیا گیا ہے۔لیکن انکی شاعری کے بارے میں کافی کچھ پتہ چلتا ہے۔اس کے علاوہ شاعر کے زمانے کے بادشاہوں کے بارے میں زیادہ جانکاری دی گئی ہے ۔ ان لوگوں کے حالات زندگی بہت ہی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں اسکی وجہ شاید یہ رہی ہوگی کہ شاعر کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں ہوسکا ہوگا۔لیکن ان کی دونوں مثنویوں کا جو جائزہ لیا گیا ہے اور غزلوں پر اشعار کے ساتھ جو تبصرہ کیا گیا ہے وہ واقعی قابل تحسین ہے۔محقق نے اور بھی تعریف کے قابل کام کئے مثلاً لسانی مطالعہ ۔ املا کے بارے میں بیاضوں کا تعارف ترتیب کے بارے میں اور ساتھ ہی ساتھ دونوں مثنویاں تیس (۳۰) غزلیں اور ایک نظم بھی قلم بند کردی ہے۔ سب سے قابل داد کام کتاب کے آخر میں فرہنگ کا پیش کرنا ہے تا کہ پڑھنے والے کوکسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے مثنوی 'فتح نامہ نظام شاہ' پر محققانہ بحث کی ہے ان کی نظر کے سامنے سے دو نسخے گذرے ہیں جن پر مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے رائے دی ہے ۔ وہ نسخہ اوّل کو صحیح مانتے ہیں اور نسخہ ثانی کے اشعار کو الحاقی تصور کرتے ہیں ۔ڈاکٹر جمیل جالبی نسخہ کو صحیح مانتے ہیں ۔انھوں نے مولوی عبدالحق سے اپنے اختلاف کو دلیلوں اور مثالوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر جالبی کی دلیل یہ ہے کہ اس کے ذریعے شاعر کی نامکمل مثنوی تکمیل کو پہنچتی ہے۔انھوں نے بہت ہی محنت اور عرق ریزی سے چھان بین کر کے دونوں نسخوں کے اشعار کو سمیٹ کر انھیں اپنی جگہ پر رکھا اور مثنوی کو اپنی کوششوں سے مکمل روپ عطا کیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ (۹۷۲ھ) میں حسن شوقی نظام شاہی کے دربار سے وابستہ تھا اسی لئے اس نے فتح نامہ جنگ تالیکوٹ نہ لکھ کر فتح نامہ نظام شاہ لکھا۔ اگر وہ کسی دوسرے دربار سے وابستہ ہوتا ،تو وہ اپنی مثنوی بھی اسی دربار کے بادشاہ سے منسوب کرتا کیونکہ اس جنگ میں چاروں بادشاہ ابراہیم قطب، علی عادل شاہ اول علی مرید شاہ اور حسین نظام شاہ برابر کے شریک تھے۔

دوسری چیز یہ مولوی عبدالحق صاحب کا یہ خیال ہے کہ مثنوی فتح نامہ نظام شاہ اور مثنوی میزبانی

نامہ کے درمیان میں بہت فرق ہے۔ انکے خیال میں شوؔقی اتنے لمبے عرصے تک زندہ رہ سکتا۔ انکی ایک بات تو ممکن ہوسکتی ہے کہ جنگ تالیکوٹ کے وقت شوؔقی پیدا نہ ہوا، لیکن یہ کہنا کہ وہ اتنے لمبے عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتا، کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا کیونکہ پہلے زمانے میں عمریں دراز ہوا کرتی تھیں۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی کہ ''جب شاہ باجن نے ۱۲۳ سال کی عمر پائی اور گیسودراز ۱۰۵ سال تک زندہ رہے تو پھر حسن شوقی ۹۲ یا ۹۳ سال تک کیوں زندہ نہیں رہ سکتا''۔ انھوں نے جو اسکی عمر کا حساب لگایا ہے وہ سمجھ میں آتا ہے کیونکہ ۹۷۲ھ اور ۱۰۴۱ھ کے بیچ اتنا طویل وقت نہیں گذرا کہ شوقی اتنے عرصے تک زندہ نہ رہ سکے۔ انھوں نے ''پھولبن'' سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ''پھولبن'' ۱۰۶۶ھ میں لکھی گئی تھی اور اسی وقت شوقی وفات پا چکے تھے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو ابن نشاطی یہ شعر نہ کہتے۔

''حسن شوؔقی اگر ہوتے تو فی الحال ہزاروں بھیجتے رحمت مجہ اپر ال''

اس کے علاوہ ایک حوالے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۴۱ء تک وہ زندہ تھا اسی سال شوقی قطب آخرالزاماں کے الفاظ سے شاہ صاحب کی تاریخ وفات نکالی تھی۔

تحقیق میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں دیا جاسکتا ہے کیونکہ آگے آنے والے محقق اپنی دلیلوں سے کوئی نئی بات پیدا کرسکتے ہیں۔ تحقیق کا کام بہت باریک بینی کا ہے۔ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے ہمیں تلاش میں سرگرداں رہنا پڑتا ہے، ڈھونڈ کر ایسی مثالیں اور دلیلیں لانی پڑتی ہیں تاکہ وہ بات صحیح ثابت ہوسکے جس پر ہم تحقیق کررہے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان باتوں کا بہت خیال رکھا ہے۔ وہ قاری کو مطمئن کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ اس مثنوی کے سلسلے میں انھوں نے سات ایسی دلیلیں پیش کی ہیں کہ یقین کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ حالانکہ شروع کی دلیلیں قیاس پر مبنی ہیں۔ مگر سمجھ میں آتی ہیں۔ مثلاً شروع میں انھوں نے یہ کہا ہے کہ فتح نامہ میں شاعر آخر میں دعا دے کر مثنوی ختم کرتا ہے اور مثنوی کے آخر میں ہی عام طور پر شاعر اپنا تخلص لاتا ہے۔ نسخہ اول میں ایسے اشعار نہیں ہیں لیکن نسخہ ثانی میں ایسے اشعار پائے جاتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ مثنوی کے آخر میں تخلص اور دعائیہ اشعار آتے ہیں اس لئے یہ اشعار الحاقی نہ ہوکر شوقی کے ہی ہوسکتے ہیں۔ بعد میں آنے والے دلائل ٹھوس ہیں اس

میں با قاعدہ شاعر کے اشعار کو سامنے رکھ کر مثالیں دی گئیں ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا یہ مصرعہ کئی جگہ پر استعمال ہوا ہے۔

''سدا جیو راجے جنم راج کر''

ان کی دونوں مثنویوں میں اس مصرع کا استعمال ہوا ہے اسی سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مثنویاں انکی ہی لکھی ہیوئی ہیں اور یہ مصرع دونوں نسخوں میں پایا جاتا ہے۔ محقق نے دوسری تاریخوں سے اسکی صداقت کا اندازہ لگایا ہے۔ انھوں نے تاریخ فرشتہ کا حوالہ دیا ہے۔ جس میں جنگ تالیکوٹ کا ذکر کیا گیا ہے۔

''میزبانی نامہ'' حسن شوقؔی کی دوسری اعلیٰ مرتبہ کی مثنوی ہے ادبی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو پہلی مثنوی کے مقابلے میں اسلوب سخن اس میں زیادہ نکھرا ہوا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی فن آخر میں ہی نکھرتا ہے یہ مثنوی شاعر نے اپنی عمر کے آخر میں لکھی تھی اس لئے انکا انداز اس میں زیادہ منجھا ہوا ہے اس میں سلطان محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ھ - ۱۰۶۸ھ) کی شادی کا بیان بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس مثنوی سے اس زمانے کے رسم و رواج اور معاشرتی حالات کا پتہ چلتا ہے۔ پڑھتے وقت ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہم بھی اس شادی میں شریک ہیں اس میں قدیم زبان کے استعمال کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی الفاظ کا استعمال زیادہ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے میزبانی نامہ میں مولوی عبدالحق کے ساتھ ڈاکٹر زور نصیرالدین ہاشمی اور حسینی شاہد کی رائے ماننے سے انکار کیا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ سلطان محمد کی شادی وزیر اعظم کی صاحبزادی کے ساتھ ہوئی تھی، جبکہ ڈاکٹر جالبی کا کہنا ہے کہ نواب مظفر خاں کی بیٹی کے ساتھ ہوئی تھی۔ اپنی بات کی تصدیق کے لئے انھوں نے جو بیان کے طور پر تحریر کیا ہے وہ اتنا ٹھوس ہے کہ اس پر یقین نہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

میزبانی نامہ میں خود ایک جگہ لکھا ہوا ہے کہ۔

''در بیان مہمانی کردن سلطان محمد عادل شاہ راو دادن جہیز دختر نواب مظفر خاں[1]

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محقق کا بیان سو فیصد صحیح ہے۔ اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ آگے چل کر حسن شوقؔی کی غزل گوئی کا تجزیہ کیا گیا ہے غزل کے بارے میں ان کا تصور کیا تھا

---

[1] دیوان حسن شوقی، ڈاکٹر جمیل جالبی ص ۳۰

کس رنگ اور کس اسلوب کو انھوں نے اپنایا تھا اور کس روایت پر انھوں نے غزلوں کو تعمیر کیا تھا۔ ان کے یہاں عشقیہ جذبات کا زبردست اظہار ملتا ہے۔ وہ صرف عورتوں سے باتیں کرنے اور ان کے حسن و جمال کی تعریف کرنے ہی کو غزل سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں عشق حقیقی کا گذر نہیں ہے۔ انکی غزل میں عشق مجازی مختلف رنگوں میں نظر آتا ہے۔ فارسی رنگ بھی بہت نمایاں ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے انکی غزلوں کو نظر میں رکھ کر اور ایک ایک شعر کو پڑھ کر جائزہ لیا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے۔

''اس کے ہاں غزل کے خیال اسلوب۔ لہجہ اور طرز ادا پر فارسی غزل کا اثر نمایاں ہے شوقی نہ صرف اس اثر کا اعتراف کرتا ہے بلکہ ان شاعروں کا ذکر بھی کرتا ہے جن سے وہ متاثر ہوا ہے۔''[1]

جب عاشقاں کی صف میں شوقی غزل پڑھے تو کوئی خسروی، ہلالی، کوئی انوری کہتے ہیں۔

عشق مجازی پر لکھتا ہے۔

اگر عشق حقیقی میں نہیں صادق ہوا شوقی ولے مقصود خود حاصل کیا ہے عشق بازی میں

شوقی کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے محقق نے اس زمانے کے چند اور شعراء کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ یہ بڑی قابل تحسین بات ہے۔ اس طرح گم نام شاعر منظر عام پر آ گئے ان میں محمود، فیروز، اشرف، تائب، رحمی، قریشی اور یوسف کے نام نمایاں ہیں۔ شوقی نے اپنے اشعار میں خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس نے ان شعراء کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ انکے مزاج کو اپنایا ہے۔ ان ہی کے رنگ میں بہت سی غزلیں کہی ہیں۔ ان کی زمین میں شاعری کی ہے ردیف وقافیہ میں بھی کافی مماثلث ہے۔ اس سے لگتا ہے کہ شوقی ان شاعروں سے متاثر تھے اور آگے آنے والے شعراء شوقی سے متاثر ہوئے، ۔ اس طرح یہ سلسلہ ولی تک پہونچا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تحقیق کے ذریعے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ نصرتی کے زمانے سے جو شاعری کی روایت چلی تھی اور جو ولی کے زمانے میں آکر پروان چڑھی اس میں کیا کوئی تال میل ہے یا نہیں اور اگر ہے تو یہ سلسلہ کس طرح قائم ہوا۔ اور وہ کون ہے جس نے اس درمیانی رشتے کو ٹوٹنے سے بچایا۔

---

[1] دیوان حسن شوقی، ڈاکٹر جمیل جالبی ص ۳۰

''دیوان حسن شوقؔی'' میں انھوں نے مثالیں دے کر اپنی بات کو ثابت کر دیا ہے کہ شوقؔی نے ایک درمیانی پل کا کام کیا ہے، انکا انداز سخن اتنا پر کشش تھا کہ آگے آنے والے شاعر اس کو اپناتے رہے۔ انکی زمین میں غزلیں کہیں اور انکے ملتے جلتے ردیف وقوافی غزلوں میں استعمال کئے جسکی وجہ سے اس روایت کا سلسلہ قائم رہا یہ ربط اگر درمیان میں ٹوٹ جاتا تو وؔلی تک اس کا پہنچنا ناممکن ہوتا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے قدیم بیاضوں کو تلاش کیا ور اشعار سے مثال دے کر بہت واضح انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے مثلاً شوقی کا یہ شعر:

تجہ نین کے انجن ہوز اہدان دوانے کئی گوڑ کوئی بنگالہ، کوئی سامری کئے ہیں

اب عادل شاہ ثانی شاہی (۱۰۶۷ھ۔۱۰۸۳ھ) کی غزل کا یہ شعر:

مج نین کے نگر میں لالن وطن کیئے جب تب انجمن کے لوگاں خلوت اسے کتے ہیں

اس طرح ہمیں پتہ چلتا ہے کہ شوقؔی کا کس کس شاعر نے اثر لیا اور انکی روایت کو آگے بڑھانے میں مدد کی۔ انکی عظمت کو انکے اپنے زمانے میں بھی سراہا گیا اور آج اتنے برسوں بعد بھی دنیائے ادب انکو ایک اچھا شاعر تسلیم کرتا ہے اسکی مثال ہمارے سامنے ہے کہ شاعری کی دنیا کے عظیم شاعر وؔلی دکنی نے شوقی کی شاعری کو سراہا بلکہ انکی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ وؔلی کی شاعری میں شوقی کا اثر کافی حد تک پایا جاتا ہے۔ وؔلی خود بھی اپنی شاعری کا مقابلہ ان سے کرتے ہیں اور اپنے آپ کو شوقؔی کا مقلد مانتے ہیں۔ انکے خیالات کا اظہار اس شعر سے ہوتا ہے۔

برجا ہے اگر جگ میں ولی پھر کے دجے بار رکھ شوق میرے شعر کا شوقی حسن آ دلے

اس وقت ہندوستان میں بہت سی زبانوں کے اثرات آپس میں گھل مل رہے تھے۔ ایک دوسرے کا اثر قبول کرر ہے تھے۔ کیونکہ دکن میں مختلف علاقوں کے لوگ آ کر بس رہے تھے اور ساتھ ساتھ رہنے کی وجہ سے انکی زبان پر بھی اثر پڑا شاعر اور ادیبوں نے بھی اس مشترک زبان کو اپنایا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے شوقؔی کی زبان سے خاصی اہم بحث کی ہے اور اسکی چند خصوصیات بھی بیان کی ہیں۔ یہ تقریباً بارہ (۱۲) قسم کی ہیں مثلاً واو عطف ہندی عربی اور فارسی الفاظ کے درمیان کثرت سے استعمال کیا ہے جیسے صوفے و منڈوئے۔ فارسی اور ہندی الفاظ کے درمیان اضافت کا استعمال کیا ہے جیسے آپ بھنور کہیں حرف اضافت کے بجائے 'ے' کا استعمال کیا ہے، منائے عظیم

(منارِ عظیم) 'ھ' اور 'ی' کا استعمال نہیں ملتا کسی جگہ واو معروف کی جگہ پیش لگایا ہے کہیں ڈھنڈنا اور کہیں پیش کی جگہ واو لکھا ہے جیسے اوس (اُس) اوجالے (اُجالے) وغیرہ۔

شعر کی ضرورت کے لئے متحرک الفاظ کو ساکن اور ساکن کو متحرک مانا ہے ''اَوَل (اَوّل) عَرَ بی (عَرَ بی)۔ اسی طرح ناموں کو بھی بدل دیا ہے جیسے ذوالقرن (ذوالقرنین) عماد یا (عماد شاہ)

قافیے کا معاملہ یہ ہے، کہ زیادہ تر صحت کے ساتھ ہیں لیکن کہیں کہیں اس سے ہٹ کر بھی ہے۔ بات کا قافیہ ذکوٰۃ اندرسبا (سبھا) کا قافیہ زیبا لکھا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے بیاضوں کا تعارف بھی کرایا ہے۔ اس میں ان دو بیاضوں کو سامنے رکھا جن میں فتح نامہ اور میز بانی نامہ لکھا ہے انھوں نے پہلے بیاض (۱) مخزونہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے بارے میں بتایا ہے کہ اس میں کیا لکھا ہے اس میں حسن شوقی کے علاوہ دوسرے شاعروں کی مثنویاں بھی ملی ہیں۔

بیاض (۲) مخزونہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔ اس بیاض میں صرف فتح نامہ نظام شاہ کی پوری تفصیل ہے اس میں مختلف لوگوں کے نام فارسی مکتوبات ہیں اس میں کچھ فارسی کے مرثیے بھی ہیں اور ایک فارسی کی مثنوی بھی ہے۔ اس سے ہمیں دوسرے شاعروں کے بارے میں بھی معلوم ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد املا کے بارے میں لکھا ہے۔ انھوں نے کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔ جس سے پڑھ نے میں آسانی ہوسکے۔

انھوں نے چند الفاظ کو بدلا ہے۔ ایک تو 'ہ' اور 'ھ' کو بدل دیا ہے۔ دوسرے وہ الفاظ بدلے ہیں جو انکے خیال میں اسوقت بھی صحیح نہیں مانے جاتے ہونگے۔ جیسے غوص اعظیم اور حجرت وغیرہ۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ الفاظ اس وقت صحیح نہیں مانے جاتے ہونگے۔ جب کہ اس زمانہ میں بیشتر الفاظ آج کے حساب سے غلط تھے تو ان میں ایسی کیا خاص بات ہوگئی کہ یہ الفاظ غلط نہیں ہوسکتے۔ میرے خیال میں یہ الفاظ اس وقت اسی طرح لکھے جاتے ہونگے۔ جیسے شوقی نے لکھے ہیں۔ ڈاکٹر جالبی نے صرف قیاساً ایسا لکھ دیا ہے۔ انھوں نے کہیں کوئی مثال نہیں

پیش کی ہے۔

میری نظر میں یہاں وحید قریشی صاحب کی رائے زیادہ مناسب ہے جوانھوں نے اپنے مضمون میں پیش کی ہے۔

''میرے نزدیک اسے ایک فطری لسانی عمل قرار دینا مناسب ہوگا۔''[۱]

اس کا ثبوت یہ پیش کیا کہ تیرہویں صدی تک کے قلمی نسخوں میں املا میں بھی یہی صورت کارفرما ہے کیونکہ شوقی ایک ادب کے آدمی تھے ایسی غلطی آخر وہ کیوں کرتے اگر انھوں نے جانتے بوجھتے ایسا کیا ہے تو یہ بات سمجھ نہیں آتی کیونکہ ایسا کرنے سے انکے شعر میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نہ تو بحر میں اور نہ ہی ردیف قافیہ پر اثر پڑتا ہے شاعر نے وہی کیا ہے جو اس زمانے میں رائج تھا۔

''دیوان حسن شوقی'' کے آخر میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے فرہنگ پیش کی ہے۔ جس کو بڑی محنت ولگن سے تیار کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے لئے ہمیں کسی دوسری لغت کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس کو سمجھنے کے لئے کئی سہارا نہیں لینا پڑیگا۔ بڑی آسانی کے ساتھ ہم شوقی کے دیوان کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ کام کسی کار خیر سے کم نہیں۔ وہ داد کے پوری طرح مستحق ہیں۔

---

[۱] ڈاکٹر وحید قریشی، مضمون دیوان حسن شوقی، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ، مؤلف گوہر نوشاہی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ء ص ۲۶۶

دیوانِ نصرتی

ڈاکٹر جمیل جالبی نے دکن کے ادب پر جو تحقیق کی ہے، اس میں دیوانِ حسن شوقی کے بعد دیوانِ نصرتی کا نام آتا ہے۔ اس کی طباعت ۱۹۷۲ء میں ہوئی اور یہ مطبع: قوسین، لاہور سے شائع ہوئی۔ اس اشاعت سے پہلے مجلس ترقی ادب لاہور کے سہ ماہی ''صحیفہ'' اکتوبر ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر جالبی لکھتے ہیں ''تاریخ ادب اردو'' پرتنِ تنہا کام کرتے ہوئے جب میں سینکڑوں بیاضوں اور مخطوطات کے جنگل سے گذرا تو مجھے اکثر ملا نصرتی کا کلام بھی ملتا رہا جسے میں دوسرے شعراء کے نایاب کلام کی طرح جمع کرتا رہا۔ ''تاریخ ادب اردو'' میں نصرتی پر لکھتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ریزہ ریزہ کر کے میرے پاس نصرتی کا اتنا کلام جمع ہوگیا ہے۔ کہ اب نصرتی پر لکھنا اور اس کے بارے میں رائے قائم کرنا آسان ہے۔ نصرتی کا یہی وہ نادر و نایاب کلام ہے جسے ترتیب دے کر اب دیوانِ نصرتی کے نام سے شائع کیا جارہا ہے۔''[1]

''دیوانِ نصرتی'' میں سب سے پہلے مقدمہ ہے۔ ایک مثنوی ''تاریخ اسکندری''، قصائد جس میں ''قصیدہ چرخیہ''، قصیدہ ''گھوڑا مانگنے کی درخواست بادشاہ سے'' اور ایک مختصر سا قصیدہ ہے۔ ۲ مخمس، ایک ہجو، ۲۳ غزلیں، ۲۸ رباعیاں، ۳ قطع، ایک فارسی غزل اور آخر میں فرہنگ ہے۔

نصرتی اپنے دور کا ملک الشعراء تھا۔ یہ بیجاپور کے دربار میں بلند پایہ کا شاعر تھا۔ اور بے مثال استاد۔ دکن کے عظیم شاعروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اس کی دو مثنویاں ''علی نامہ'' اور ''گلشنِ عشق'' منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ ''علی نامہ'' ایک رزمیہ مثنوی ہے، جو فردوسی کے ''شاہ نامہ'' کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ ''گلشنِ عشق'' میں عشقیہ مضمون ہے۔

محمد علی اثر اپنے مضمون ''ڈاکٹر جمیل جالبی اور دکنی ادب کی تحقیق'' میں لکھتے ہیں۔

''گلشنِ عشق'' کو مولوی عبدالحق اور سید محمد نے علی الترتیب ۱۹۵۲ء میں انجمن ترقی اردو کراچی سے اور ۱۹۵۷ء میں سالار جنگ پبلیشنگ کمیٹی حیدر آباد

---

[1] دیوانِ نصرتی ڈاکٹر جمیل جالبی مطبع قوسین لاہور ۱۹۷۲ء ص ۲

نے شائع کیا تھا۔ جب کہ اس کی معرکہ آراء رزمیہ مثنوی ''علی نامہ'' کو عبدالمجید صدیقی نے ۱۹۵۹ء میں مرتب کر کے سالارِ جنگ پبلشنگ کمیٹی حیدر آباد سے شائع کیا۔ نصرتی کے عنوان سے مولوی عبدالحق کی مرتبہ کتاب ۱۹۴۴ء میں دہلی سے منظر عام پر آئی ہے۔'' [۱]

مولوی عبدالحق کی کوشش کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی کی کوشش اور تلاش نے یہ رنگ دیکھایا کہ باقی کلام بھی دنیائے ادب کے سامنے آیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ خیال ہے کہ ''گلشنِ عشق'' سے نصرتی کے آباواجداد کے بارے میں کافی معلومات فراہم ہوتی ہیں ۔ یہ پیشہ ور سپاہی تھے ۔ نصرتی پہلا شخص تھا۔ جس نے اپنے خاندان کے پیشے کو چھوڑ کر شاعری کو اختیار کیا تھا۔ انکے والد نے انکی تعلیم کا بہترین انتظام کیا۔ علی عادل شاہ ثانی بچپن سے ہی ان کو پسند کرتے تھے ۔ جب اس کا دورِ حکومت آیا تو اس نے نصرتی کو اپنے دربار میں بلایا اور ان کو اسی زمانے میں ملک الشعراء کا خطاب بھی ملا۔

''دیوانِ نصرتی'' میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے۔ ''گارساں دتاسی نے ''گلشنِ عشق'' کے ایک قلمی نسخے کی سند پر اسے برہمن بتایا ہے۔ لیکن اس کی تصانیف میں اس سلسلے میں کہیں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ مولوی عبدالحق نے ذاتی طور پر اس کے خاندان کے حالات کی جو تحقیق کی ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ نسلاً بعد نسل مسلمان تھا۔ مثلاً گیسودراز کی مدح میں یہ شعر اسی بات کی تصدیق کرتا ہے۔

بحمد اللہ کرسی بہ کرسی مری ☆ چلی آئی ہے بندگی میں تری۔'' [۲]

ڈاکٹر جالبی نے دیوانِ نصرتی میں ایک مقدمہ پیش کیا ہے۔ جو ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں شاعر کے حالاتِ زندگی بیان کئے گئے ہیں۔ اور کلام پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ملا نصرتی سلطنتِ بیجا پور کے آخری دور کا ملک الشعراء ہے۔ بیجا پور کی سلطنت ۸۹۷ھ سے ۱۰۹۸ھ تک قائم رہی۔ اس زمانے کے بادشاہ علم و ادب کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ نصرتی نے تین بادشاہ محمد عادل شاہ۔ علی عادل شاہ ثانی شاہی اور سکندر عادل شاہ کے دورِ حکومت میں اپنی شاعری کو پروان چڑھایا۔

---

[۱] ڈاکٹر محمد علی اثر مضمون ڈاکٹر جمیل جالبی اور دکنی ادب کی تحقیق مشمولہ ارمغان سہ ماہی کراچی جمیل جالبی نمبر شمارہ ۳ اپریل مئی جون ۹۶ ص ۱۰۹

[۲] دیوان نصرتی ڈاکٹر جمیل جالبی قوسین لاہور ۱۹۷۲ء ص ۳

محمد عادل شاہ کے زمانے میں ''قصیدہ چرخیہ'' لکھا گیا۔ اس میں روانی، شیرینی اور جزبۂ خلوص اس قصیدہ کی خاصیت ہے۔ ڈاکٹر جالبی لکھتے ہیں۔

''اس قصیدے میں بظاہر محمد عادل شاہ کا نام نہیں آیا۔ لیکن نعت رسولؐ کے بعد جس خوبصورتی سے اس نے ''محمد'' عادل شاہ کی طرف اشارہ کر کے مدح کی ہے وہ فنی اعتبار سے ایک لطیف تخلیقی عمل ہے۔''[۱]

اس قصیدہ کی تعریف میں افسر صدیقی امروہوی لکھتے ہیں۔

''نعتیہ قصیدہ کا تعلق حضور سرورِ کائناتؐ کے واقعہ معراج سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ قصیدہ ان تمام محاسن کا حامل ہے۔ جو قصیدہ نگاری کے لوازم میں داخل ہیں۔''[۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے نصرتی کی تخلیقی قوتوں کا حقیقی دور محمد عادل شاہ کے بیٹے علی عادل شاہ ثانی شاہی کے زمانے کا ہے۔ اس وقت سب سے زیادہ غزلیں، قصائد اور رباعیات لکھی گئیں۔ گلشنِ عشق اور ''علی نامہ'' جیسی مشہور مثنویاں اسی زمانے میں لکھیں گئیں۔ نصرتی نے ''تاریخ اسکندری'' سکندر عادل شاہ کے زمانے میں لکھی۔ جو بیجاپور کا آخری باشاہ ہے۔

نصرتی کے نام کے سلسلے میں ڈاکٹر جالبی نے عبدالجبار ملکاپوری کی رائے ظاہر کی ہے ''تذکرہ شعراء دکن'' ص ۱۰۹۰ میں نصرتی کا نام ''محمد نصرت'' لکھا ہے۔

ڈاکٹر جالبی کو یہ نام قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''گلشنِ عشق'' میں نصرتی نے نبی ابن عبدالصمد کی زبان سے چند اشعار کہلوائے ہیں۔ وہاں یہ شعر بھی ملتا ہے:

دکھن میں توں ہے آج نصرت قریں ☆ بلند شعر کے فن میں سحر آفریں

اس شعر سے بھی نصرتی کا نام ''محمد نصرت'' ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔''[۳]

نصرتی کے نام کے بارے میں شمس اللہ قادری نے ''اردوئے قدیم'' میں لکھا ہے۔

''نصرتی کا نام ''شیخ نصرت'' اور وطن بیجاپور ہے۔''[۴]

سید اعجاز حسین ''مختصر تاریخ ادب اردو'' میں لکھتے ہیں۔

۱؎ دیوان نصرتی ڈاکٹر جمیل جالبی مطبع توسین لاہور ۱۹۷۲ء ص ۱ / ۴

۲؎ افسر صدیقی امروہوی مضمون دیوان نصرتی مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ء ص ۲۶۸

۳؎ اردوئے قدیم شمس اللہ قادری مطبع نول کشور واقع لکھنو ۱۹۵۲ء ص ۸۴

''محمد نصرت نام اور نصرتی تخلص تھا۔ اورنگ زیب نے جب بیجاپور فتح کیا تھا۔(۱۰۹۷ھ) تو یہ موجود تھے۔''[۱]

اس حوالے سے دو باتیں سامنے آئیں ایک تو نام اور دوسرے یہ ۱۰۹۷ھ تک زندہ تھے وفات کو لے کر محققین کی رائے میں اختلاف ہے۔ اس پر ڈاکٹر جالبی نے بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''تذکرہ شعرائے دکن'' عبدالجبار ملکا پوری نے نصرتی کا سال وفات ۱۰۹۵ھ لکھا ہے۔ ''اردو مخطوطات، کتب خانہ سالارِ جنگ'' میں نصیرالدین ہاشمی مرحوم نے یہ قطعۂ تاریخِ وفات دیا ہے:

ضربِ شمشیر سوں یو دنیا چھوڑ ☆ جا کے جنت میں خوش ہو رہے
سالِ تاریخ آ ملا یک نے ☆ یو کہی نصرتی شہید ا ہے

''نصرتی شہیدا ہے'' سے ۱۰۸۵ھ برآمد ہوتا ہے۔ ''اردو شہہ پارے'' میں پروفیسر محی الدین زور نے سالِ وفات ۱۰۸۱ھ دیا ہے۔ جو اس لئے صحیح نہیں ہے کہ ''تاریخ اسکندری'' کا سالِ تصنیف، جو اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔

سہس ہور اسی پر جو تھے تین سال ☆ کرے یک میں بر سب زمانے نے حال

۱۰۸۳ھ ہے اور ظاہر ہے کہ ''تاریخ اسکندری'' لکھتے وقت نصرتی یقیناً زندہ تھے۔ اس لئے نصرتی کا سالِ وفات ۱۰۸۵ھ معلوم ہوتا ہے۔''[۲]

جبکہ سید اعجاز حسین ''مختصر تاریخ ادب اردو'' میں نصرتی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''اورنگ زیب نے جب بیجاپور فتح کیا تھا (۱۰۹۷ھ) تو یہ موجود تھے۔''[۳]

تحقیق کا کام ایسا ہے کہ کوئی بھی بات پورے وثوق سے نہیں کہی جا سکتی ڈاکٹر جالبی ۱۰۸۵ھ کو سالِ وفات مانتے ہیں۔ نصرتی کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی موت نہیں مرے تھے بلکہ انھیں شہید کر دیا گیا۔ شاید یہ وہ لوگ تھے جو ان سے حسد کرتے تھے۔ نصرتی کی شاعری اتنی عروج پر پہونچ گئی تھی کہ دوسرے شعراء ان سے جلنے لگے تھے۔ انھوں نے اپنے دور کے شعراء کی ایک ہجو بھی لکھی تھی۔ حسد کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ نجومی نے انکی جان کو خطرہ بتایا تھا۔

ڈاکٹر جالبی نے ملا نصرتی کی تین تصانیف کے بارے میں بتایا ہے۔ ''گلشنِ عشق''

۱،۳ مختصر تاریخ ادب اردو سید اعجاز حسین اردو کتاب گھر دہلی ۶ ص ۲۳ / ۲۳

۲ دیوان نصرتی ڈاکٹر جمیل جالبی قوسین لاہور ۱۹۷۲ء ص ۵-۶

(۱۰۶۸ھ)۔ ''علی نامہ'' (۱۰۷۶ھ) اور ''دیوانِ نصرتی'' جس میں ''تاریخ اسکندری'' یعنی فتح نامۂ بہلول خاں (۱۰۸۳ھ) شامل ہے۔

شمس اللہ قادری نے ''اردوئے قدیم'' میں ''تاریخ اسکندری'' کا ذکر نہ کر کے ''گلدستۂ عشق'' کا نام دیا ہے جبکہ ''علی نامہ'' اور گلشنِ عشق کا ذکر کیا ہے۔انھوں نے لکھا ہے۔

> ''نصرتی کی تصنیفات سے تین مثنویاں ہیں۔ایک قصائد کا مجموعہ اور ایک غزلیات کا دیوان ہے۔مثنویوں کے نام یہ ہیں۔(۱) علی نامہ (۲) گلشنِ عشق (۳) گلدستۂ عشق یہ تینوں کتابیں ٹیپو سلطان کے کتب خانہ میں موجود تھیں۔ پرو فیسر ڈی ٹاسی نے بھی انکا ذکر کیا ہے۔''[۱]

تحقیق میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی نظر سے یہ مثنوی گذری ہو اور وہ ذکر نہ کریں، ایسا ہو نہیں سکتا۔

گلشنِ عشق پہلی تصنیف ہے۔ جو نصرتی نے علی عادل شاہ شاہی کے دور میں لکھی۔ اس میں منوہر اور مدمالتی کی داستانِ عشق بیان کی گئی ہے۔ یہ قصۂ دکن میں کافی مشہور تھا۔ ڈاکٹر جالبی نے لکھا ہے کہ شیخ منجھن نے اسے ہندی میں لکھا تھا۔ جس کا حوالہ فارسی کی کتاب ''قصہ کنور منوہر و مدمالت'' ۱۰۵۹ھ میں آیا ہے۔ ۱۰۶۵ھ میں اسی قصے کو عاقل خاں رازی عالمگیری نے اپنی مثنوی ''مہر و ماہ'' کا موضوع بنایا۔

ڈاکٹر جالبی کو اس بات پر تعجب ہے کہ نصرتی نے نہ تو ''گلشنِ عشق'' کے مأخز کا کہیں ذکر کیا اور نہ ہی بیجا پور میں لکھی جانے والی دوسری مثنویوں کا ذکر کیا ہے۔ صرف گولکنڈا کے ملک الشعراء غواصی کی مثنوی سیف الملوک بدیع الجمال کا تذکرہ کیا ہے۔

ڈاکٹر جالبی کی رائے میں نصرتی نے ''گلشنِ عشق'' میں یہ کوشش کی ہے کہ یہ مثنوی زبان و بیان اور فن کے اعتبار سے اسی معیار کی ہو جس معیار کی فارسی زبان میں مثنویاں ملتی ہیں۔ اس تخلیقی عمل میں اس نے دکنی زبان کی خصوصیات کو فارسی زبان کی خصوصیات سے ملا کر ایک نیا فنی معیار قائم کیا۔ نصرتی نے اپنے اس تخلیقی عمل کو ''شعر تازہ'' کا نام دیا ہے۔

نصرتی ے فارسی روایت کی اس طرح پیروی کی ہے۔ کہ جزئیات نگاری اور فضا پر بھی زور دیا

---

[۱] اردوئے قدیم شمس اللہ قادری نول کشور واقع لکھنؤ ۱۹۲۵ء ص ۸۵

ہے۔ اس معیار کو دیکھ کر ڈاکٹر جالبی نے ''گلشنِ عشق'' کو بیجاپور کی پہلی مثنوی مانا ہے۔ جو گولکنڈا کے اسلوب اور مزاج سے قریب تر ہے۔ نصرتی نے ''گلشنِ عشق'' بنی عبدالصمد کی تحریک پر لکھی تھی۔ یہ علی عادل شاہ کے دور کے علمی شخص تھے۔ ''علی نامہ'' قاضی کریم اللہ اور شاہ نور اللہ کی فرمائش پر لکھا۔ جن کے علم کی روشنی پورے بیجاپور میں پھیلی ہوئی تھی، ''گلشنِ عشق'' میں عشق و بزم کے رنگ دکھائے گئے ہیں۔ اور ''علی نامہ'' میں رزم و مہمات کے نقشے کھینچے ہیں۔ یہ ایک رزمیہ مثنوی ہے اسکی ہیئت بھی ویسی ہی ہے۔ جیسی ''گلشنِ عشق'' اور دوسری بڑی مثنویوں کی ہے شعر ایک ہی بحر اور ایک زمین میں لکھے گئے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''گلشنِ عشق'' کے مقابلے میں ''علی نامہ'' پر تفصیلی بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رزمیہ میں اس دور کی تہذیب، اس کی معاشرت اور کلچر واقعات کا حصّہ بن کر آتے ہیں۔ اس طرح رزمیہ نظم صرف واقعات کا بیان ہی نہیں رہتی بلکہ اس تہذیب کی تاریخ بھی بن جاتی ہے۔ ان کا خیال ہے ''علی نامہ'' پڑھتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعری کا ایک سمندر ہے۔ جو موجیں مار رہا ہے۔ خشک تاریخی واقعات کو جس شاعرانہ حسنِ بیان کے ساتھ نصرتی نے لکھا ہے۔ یہ ایک ایسا کمالِ فن ہے جس تک دوسرا شاعر نہیں پہنچتا۔

دیوانِ نصرتی میں ''تاریخ اسکندری'' بھی شامل ہے۔ یہ نصرتی کے آخری دور کی تصنیف ہے۔

مولوی عبدالحق نے ''نصرتی'' میں ''تاریخ اسکندری'' کا ''گلشنِ عشق'' اور علی نامہ سے موآزنہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''یہاں نصرتی کے کلام میں وہ زور اور شگفتگی نہیں ہے۔ جو اول ذکر دونوں مثنویوں میں ملتا ہے۔''[۱]
>
> ڈاکٹر جالبی اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''وہ بات جو مولوی عبدالحق نے نظر انداز کر دی، یہ ہے کہ ''تاریخ اسکندری'' کا مقابلہ ''علی نامہ'' سے نہیں کیا جا سکتا۔ ''علی نامہ'' علی عادل شاہ کے ہنگامہ پرور دس سالہ دور کی بڑی مہمات کی تاریخ ہے۔ اور ''تاریخ اسکندری'' صرف دو روزہ جنگ کی داستان ہے۔''[۲]

۱؎ نصرتی از عبدالحق ص ۲۲۰

۲؎ دیوان نصرتی ڈاکٹر جمیل جالبی ص ۱۱

شاید اسی لئے ڈاکٹر جالبی نے ''علی نامہ'' پر تفصیلی بحث کی ہے ''گلشنِ عشق'' اور'' تاریخ اسکندری'' پر کم لکھا ہے۔ '' دیوانِ نصرتی'' میں مثنوی کے بعد قصائد آتے ہیں۔ سب سے پہلے ''قصید چرخیہ'' ہے۔اس میں الفاظ اور اصطلاحات چرخ سے متعلق ہیں۔تخیل اور معنی آفرینی ہے۔ اسی میں ۱۳۳ اشعار ہیں۔اس کے بعد قصیدہ ''ایک گھوڑا مانگنے کی درخواست'' اور ایک مختصر قصیدہ بھی شامل ہے۔نصؔرتی کی غزلوں میں وہی موضوع ہے، جو دکنی غزل کی روایت ہے۔ انھوں نے بھی عورت کو موضوع بنایا۔ عاشقانہ جذبات کا اظہار کیا ہے۔ان کی رباعیوں میں سے کچھ ناصحانہ وعاشقانہ ہیں اور کچھ حمد ونعت میں ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ رباعیوں کی زبان غزلوں کی زبان کے مقابلے میں صاف ہے۔اور اس جدید اسلوب سے قریب تر ہے۔ جو آیندہ دور میں ولی کی شاعری میں ابھرتا ہے۔

ڈاکٹر جالبی کی نصؔرتی کے بارے میں یہ رائے ہے کہ بحیثیت شاعر نصؔرتی قدیم اردو کے عظیم ترین شاعروں میں سے ایک ہے۔جس نے بزمیہ اور رزمیہ دونوں قسم کی طویل مثنویاں لکھ کر اپنی شاعرانہ عظمت کا لوہا منوایا ہے۔قصیدے میں اس کا نام سوؔدا اور ذوؔق کے ساتھ لیا جانا چاہئے۔

ڈاکٹر جالبی آگے لکھتے ہیں یہاں یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ جب فنی اور شاعرانہ اعتبار سے وہ اتنا عظیم شاعر ہے۔تو آخر اب تک اردو ادب کی تاریخ میں اس کو وہ مقام کیوں حاصل نہ ہوسکا۔ جو اسکے بعد کے شعراء میں ولی دکنی کو میسّر آیا۔اس کی وجہ نصؔرتی کی شاعری میں اظہار و بیان کی روایت ہے۔جس میں نصؔرتی نے اپنے کمال، شاعر کو پیش کیا اور جو مغلوں کے فتح دکن کے بعد ادب کے معیاری اسلوب کی حیثیت سے متروک ہوگئی۔

ڈاکٹر جالبی نے ''دیوان نصؔرتی'' میں ایک فارسی غزل پیش کی ہے جس پر شک ہے کہ وہ نصؔرتی کی نہیں ہے۔افسر صدیقی نے اس سلسلے میں یہ رائے دی ہے۔

> ''ڈاکٹر صاحب نے اس فارسی غزل کو نصؔرتی کی ملکیت ثابت کرنے کے لئے جو دلائل دیئے ہیں۔ وہ اگر چہ اپنی جگہ درست اور قابلِ تسلیم ہیں لیکن اس سلسلے میں ظہوری، ملک قمی، حیدر ذہنی وغیرہ فارسی گویانِ ایران کی بیجاپور میں موجودگی اور والیانِ بیجاپور فیروزی و یوسف وغیرہ کی فارسی شاعری کے علاوہ خود

نصرتی کے کلام سے بھی مدد لی جاتی تو دعوے میں زیادہ جان پڑتی۔ ''تاریخ اسکندری'' میں اس کی فارسی گوئی کا ایک نمونہ اس بیت کی صورت میں موجود ہے

اگر تیغِ عالم بجنبید ز جائے۔ نہ بزرگے گر نخواہد خدائے''[1]

ڈاکٹر جالبی نے ''دیوانِ نصرتی'' میں ایک تفصیلی فرہنگ پیش کی ہے۔ جس کے ذریعے نصرتی کے کلام کو بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

آخر میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ڈاکٹر جالبی نے ایک ملک الشعراء کو حیاتِ جاودانی عطا کی ہے۔ اگر وہ مرتب نہ کرتے تو دنیائے ادب میں ملا نصرتی کو شاید ہی کوئی جان پاتا۔

---

[1] افسر صدیقی امروہوی مضمون دیوان نصرتی مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ موئف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ء ص ۲۶۹

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے بارے میں یہ خیال عام ہے کہ سب سے پہلے ادریسی صاحب کواس کاعلم ہوا وہ کتابوں کے تاجر تھے۔انھوں نے مثنوی کا مخطوطہ معروف محقق مولانا نصیرالدین ہاشمی صاحب کو دکھایا۔مولانا نے سرسری جائزہ لے کرایک مختصر مضمون رسالہ ''معارف'' میں شائع کروایا۔ یہ رسالہ اعظم گڑھ سے نکلتا تھا یہ مضمون اکتوبر ۱۹۳۲ء میں ''بہمنی عہد حکومت کا ایک دکنی شاعر کے عنوان سے شائع ہوا۔ ہاشمی صاحب نے اس مثنوی کو کدم راؤ پدم راؤ کے نام سے موسوم کیا ہے۔

جب یہ مثنوی بابائے اردو مولوی عبدالحق تک پہونچی تو اس کی اہمیت میں اضافہ تو ضرور ہوا لیکن اس میں چار چاند نہ لگ سکے اسکی وجہ مولوی صاحب کی عدیم الفرصتی تھی وہ چاہ کر بھی توجہ نہ دے سکے انکی بعض تحریروں میں اسکا ذکر ملتا ہے۔انکی خواہش تھی کہ دوسرے اہل علم اس مثنوی کو مرتب کریں۔لیکن یہ کام آسان نہیں تھا کیونکہ اسکی زبان میں اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔اور عربی فارسی الفاظ کا تلفظ بھی مانوس نہیں ہے۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کو مرتب کرنا بہت مشکل تھا ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس مشکل کو آسان کر دیکھایا۔وہ بذاتِ خود قدیم اردو سے واقف تھے۔انھوں نے دکنی اور گجراتی ادب پر بھی کافی کام کیا ہے۔اسی لئے مثنوی کو مرتب کرنا انکے لئے آسان ہوگیا قدیم اردو ادب کو جاننے کے لئے عربی فارسی اور ہندی زبان اور ان زبانوں کی روایات کو جاننا ضروری ہے تب ہی ہم اردو ادب کو واضح طور پر سمجھ سکیں گے۔ڈاکٹر جالبی کی علمیت اور واقفیت کی بدولت یہ مثنوی گم نامی کے اندھیروں سے باہر نکل آئی۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا مصنف فخرالدین ہے۔جو نظامؔی تخلص رکھتا ہے۔س کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہوسکا ہے کہ دکن کے بہمنی بادشاہ احمد شاہ ولی کے زمانے کا شاعر تھا یہ زمانہ ۸۲۵ھ سے ۸۳۹ھ تک ہے مثنوی کی ابتداء میں احمد شاہ ولؔی کی تعریف میں اشعار ملتے ہیں۔جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نظامؔی احمد شاہ ولی کے عہد کا شاعر رہا ہوگا۔

اسکی کہانی بہت سادہ ہے۔ مرکزی کردار کدم راؤ پدم راؤ ہیں کدم راؤ راجہ ہے اور ایک انسان ہے۔ پدم راؤ وزیر ہے جو ناگ کی شکل میں ہے۔ اس میں دیومالائی قصوں کی بھرمار ہے۔ اس مثنوی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس سے بہمنی عہد کی زبان کا پتہ چلتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زبان پر کونسی دوسری زبان کا اثر پڑا۔ بقول جمیل جالبی

''اس مثنوی میں بیک وقت کھڑی۔ پنجابی، راجستھانی، برجی، گجراتی، سندھی، سرائیکی اور مرہٹی کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔''[۱]

۔۔۔دوسری بات جس پر جمیل جالبی نے توجہ دلائی ہے وہ یہ ہے۔

''اس میں روزمرہ اور محاورے کی ایسی رچاوٹ ہے کہ اسے دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ یہ مثنوی اس زبان کا پہلا نمونہ نہیں ہے بلکہ اس کے قدیم تر نمونے بھی ہونگے۔''[۲]

اس مثنوی کے ذریعہ ہم اردو زبان کو بڑی حد تک سمجھ سکتے ہیں ابتداء میں اردو کن کن مرحلوں سے گذری۔ کیسے اور کیونکر دوسری زبانوں کا اثر لیا اور کس طرح ترقی کرتی ہوئی اپنی منزل تک پہونچی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے جدید اصولوں کو سامنے رکھ کر مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' مرتب کی ہے ہر صفحے پر آمنے سامنے متن لکھا ہے۔ ایک طرف قدیم مخطوطہ ہے اور دوسری طرف جدید رسم الخط میں وہی عبارت لکھی گئی ہے۔ سب سے پہلے مفصل مقدمہ ہے اور مثنوی کے زمانہ تصنیف، حالات مصنف، موضوع مثنوی، املا اور لسانی خصوصیات پر بحث کی ہے۔ آخر میں ایک فرہنگ پیش کی ہے جس میں دکنی الفاظ کے معانی دئے گئے ہیں، دو ضمیمے بھی ہیں ایک میں سلاطین بہمنی کا تعارف اور دوسرے میں ان شخصیات کا مختصر تعارف ہے، جس کا ذکر مثنوی میں آیا ہے ڈاکٹر جمیل جالبی نے سات برس کا عرصہ اس پر صرف کیا ہے تب کہیں جاکر یہ نایاب مخطوطہ ہم تک پہونچا ہے۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا صرف ایک ہی نسخہ حاصل ہوسکا ہے جو انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کے کتب خانہ خاص میں محفوظ ہے۔ کچھ صفحات بھی غائب ہیں۔ کاتب کے متعلق بھی کچھ نہیں لکھا ہوا ہے، جس کی وجہ سے مثنوی کے بارے میں پوری معلومات نہیں ہوسکی ہے۔ یہ مخطوطہ ۱۹۶۷ء میں جمیل جالبی کو دستیاب ہوا اور اس کو سمجھنے اور اس کی نقل تیار کرنے میں کافی وقت صرف ہوا۔ انھوں نے مقدمے میں یہ ذکر کیا کہ تیسری نقل سے وہ مطمئن ہوئے اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ یہ مثنوی کس زمانے میں تصنیف کی گئی اور کون بادشاہ

---

[۱] [۲] مثنوی کدم راؤ پدم راؤ مرتبہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۳ء ص ۳۶ / ۳۶

اس وقت دکن میں حکومت کر رہا تھا ۔ بہت اختصار کے ساتھ دکن کی بادشاہت، سیاست اور بغاوت کا نقشہ کھینچا گیا ہے، کب علاءالدین خلجی نے دکن پر حکومت کی ۔ کس طرح ترک یہاں آ کر آباد ہوئے اور یہ علاقہ انکا وطن بن گیا ۔ خلجیوں کے زوال کے بعد تغلقوں کا دور آیا لیکن محمد تغلق کی سختیوں سے تنگ آ کر یہاں بغاوت پھیل گئی ۔ اس کے بعد علاء الدین بہمنی تخت نشین ہوا ۔ مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' میں اس بادشاہ کی مدح میں کچھ اشعار ملتے ہیں جس سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مثنوی علاء الدین بہمنی کے زمانے میں لکھی گئی ہوگی ۔ مدحیہ اشعار درج ذیل ہیں ۔

''شہنشہ بڑا شاہ احمد کنوار
پرت پال سنسار کرتار ادھار
دھنیں تاج کا کون راجا بھنگ
کنور شاہ لا شاہ احمد بجنگ
لقب شہ علی آل بہمن و لی
و لی تھی بہت بدھ تد آ گلی
جہانگیر توں شاہ گڑ وا کہیر
سمندر منو کت سمند ر سریر''[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس مثنوی کے سلسلے میں مختلف محققین کی رائے پیش کی ہے ۔ نصیرالدین ہاشمی کے حوالے سے انھوں نے لکھا ہے ۔

''ان اشعار سے نصیرالدین ہاشمی مرحوم نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ''علاء الدین بہمنی کا انتقال ہو چکا تھا اور اشعار ماقبل کے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ احمد شہزادہ تھا ۔''[۲]

حالانکہ ان اشعار سے ہاشمی صاحب نے یہ نتیجہ نہیں نکالا ہے ۔ وہ ''دکن میں اردو'' میں لکھتے ہیں کہ ''مثنوی میں اشعار ذیل موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بہمنی زمانہ میں لکھی گئی ہے ۔

شہنشہ بڑا شاہ احمد کنور — پر یتال سنیسار کرتا ادھار
دھنیں تاج کا کون راجا بھنگ — کنور شاہ کا شاہ احمد بجنگ
لقب شہ علی آل بہمن ولی — ولی تھے بہت بدہ ندا کلی [۳]

۱، ۲۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ مرتبہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۳ء ص ۱۳ ، ۱۳
۳۔ دکن میں اردو، نصیرالدین ہاشمی، ص ۳۹

آ گے لکھتے ہیں ''مثنوی میں مختلف عنوانات ہیں ایک عنوان حسب ذیل ہے۔

''مدح سلطان علاء الدین بہمنی نور اللہ مرقدہ'' اس سے واضح ہے کہ علاء الدین بہمنی کا انتقال ہو چکا تھا اور اشعار ماقبل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ احمد شہزادہ تھا۔''[۱]

۔۔۔پھر اس کے بعد نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''اب اس امر کی تحقیق کرنی ہے کہ مثنوی کس سنہ میں لکھی گئی۔ اس کے متعلق ہم کو مثنوی سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی علاء الدین بہمنی کے انتقال کے بعد لکھی گئی ہے۔ اور اس کا ولی عہد احمد تھا۔ خاندان بہمنی کے سلسلے سے واضح ہوتا ہے کہ سوائے گیارھویں حکمران علاء الدین ہمایوں شاہ کے کوئی اور ایسا حکمران نہیں ہوا جس کا لقب علاء الدین ہوا اور احمد شاہ اس کے ولی عہد کا نام ہو۔ یہ احمد شاہ ۸۶۵ھ سے ۸۶۷ھ تک حکمران رہا ہے اس لئے اس مثنوی کی تصنیف بھی اسی زمانے میں قرار دینی چاہئے۔''[۲]

حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب نے ''اردوئے قدیم'' میں سلطنت بہمنیہ کے بادشاہوں کے سن پیدائش اور سن وفات کے ساتھ جو فہرست پیش کی ہے وہ ہاشمی صاحب کے بیان کی تائید کرتی ہے۔

''سلطنت بہمنیہ

۷۴۸ھ تا ۹۳۲ھ

۱۱۔ علاء الدین ہمایوں شاہ ۸۶۲ھ تا ۸۶۵ھ

۱۲۔ احمد شاہ ثالث۔۔(نظام شاہ) ۸۶۵ھ تا ۸۶۷ھ''[۳]

پروفیسر ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے ''مختصر تاریخ ادب اردو'' میں مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے بارے میں بہت اختصار کے ساتھ لکھا ہے۔

''اسی دور کا ایک اور مشہور شاعر نظامی بھی ہے جو سلطان احمد شاہ ثالث بہمنی کے زمانے میں سلطان کا درباری شاعر تھا۔ اس کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ اس کی یادگار ہے۔''[۴]

---

[۱] [۲] دکن میں اردو، نصیر الدین ہاشمی، ص ۳۹ ـ ۴۰

[۳] اردوئے قدیم، شمس اللہ قادری مطبع نول کشور واقع لکھنؤ ص ۳۴

[۴] مختصر تاریخ ادب اردو، سید اعجاز حسین، اردو کتاب گھر دہلی۔ ۶ ص ۴۱

پروفیسر سید اعجاز حسین جیسے مورخ اور شمس اللہ قادری اور نصیر الدین ہاشمی جیسے بڑے محقق پر یقین نہ کرنا بڑا مشکل ہے لیکن ادب میں تحقیق مسلسل جاری رہتی ہے اس لئے کسی محقق پر پوری طرح یقین نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی کوئی خاص دلیل نہیں دی۔ صرف اشعار سے اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے اس مخطوطہ میں درمیان سے کچھ اشعار غائب ہیں۔ آخر کے صفحات بھی غائب ہیں ایسی صورت میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ صرف اندازے ہی لگا لیے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی سکّوں کی بنیاد پر تاریخ فرشتہ کو رد نہیں کرنا چاہتے۔ انکے خیال میں اشعار میں دو احمد بیان ہوئے ہیں۔ ایک وہ احمد شاہ جسے بڑا شہنشہ ظاہر کیا گیا ہے اور دوسرا وہ احمد جسے بادشاہ کا کنور ظاہر کیا گیا ہے جس کا لقب احمد ولی بہمنی بتایا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''تذکرہ سلاطین دکن'' کو سامنے رکھ کر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ احمد شاہ ولی بہمنی احمد خاں کا بیٹا ہے اور علاء الدین حسن بہمنی بانئ سلطنت کا پوتا ہے اس لئے یہ مثنوی ۸۲۵ھ سے ۸۲۹ھ کے درمیان لکھی گئی ہے کیونکہ تاریخی نقطہ نظر سے احمد شاہ ولی البہمنی نے ۸۲۵ھ سے ۸۳۹ھ تک حکومت کی ہے ۔ اس بحث کے بعد مثنوی کا نام اور مصنف کے نام و حالات کے بارے میں بیان کیا گیا ہے مثنوی کا اصل نام تو معلوم نہیں ہوسکا کیونکہ مثنوی کے ابتدائی اور آخری صفحات غائب ہیں صرف چند اشعار سے نام اور تخلص کا پتہ چلتا ہے۔ شعر میں انھوں نے اپنا نام ''فخر دین'' اور تخلص ''نظامی' 'استعمال کیا ہے مثلاً

''سنوئے فخر دیں توں بسر آنکھیا   محمد نبی خاتم انبیا

نظامی کہنہار جس یار ہولے   سنہنار سن نغز گفتار ہوئے''[۱]

مولوی عبدالحق نے مخطوطہ پر مصنف کا نام فخر الدین لکھا ہے ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ جب خود مصنف نے اپنا نام فخر دین لکھا ہے تو فخر الدین لکھنا صحیح نہیں ہے انھوں نے لکھا ہے کہ پنجاب کے قدیم شعراء بھی اپنا نام اسی طرح لکھا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر پرت نامہ (قبل ۹۷۳ھ) کے مصنف فیروز کا نام بھی قطب دین تھا جیسا کہ اس نے ایک شعر میں ظاہر کیا ہے

''مجے ناوں ہے قطب دیں قادری   تخلص سو فیروز ہے بیدری''

ڈاکٹر جمیل جالبی کی اس بات سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ جب خود مصنف نے اپنا نام فخر دیں

---

[۱] مثنوی کدم راؤ پدم راؤ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۳ء ص ۱۷

لکھا تو کسی کو کوئی اختیار نہیں پہو نچتا ہے کہ اس میں تبدیلی کی جائے کیونکہ ہندوستان میں ہر علاقہ کی زبان اور لہجہ مختلف ہے۔ اس لئے اپنی مرضی سے کسی کا نام تبدیل کرنا بہتر نہیں ہوگا۔ نظامیؔ کی زندگی کے بارے میں بھی معلومات فراہم نہیں ہوسکیں ہیں محض قیاس کی بنیاد پر کچھ کہنا بہتر نہیں ہوگا مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ احمد شاہ ولی البہمنی کے زمانے میں بیدر کا شاعر تھا۔ اس بات کو بھی شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ نظامی دربار سے منسلک تھا یا نہیں لیکن دربار سے وابستگی ممکن ہوسکتی ہے۔ کیونکہ جس بادشاہ کے بارے میں مثنوی تحریر کی جاری ہے اس سے کوئی قریبی تعلق ضرور ہوگا ورنہ اتنی طویل کیونکر لکھی جاتی۔ مثنوی میں ۱۰۳۲ اشعار ہیں اور اس سے آگے آنے والا شعر نامکمل ہے جو اشعار اس کے بعد آئے ہیں وہ ضائع ہو گئے مثنوی کا اختتام کتنے اشعار پر ہوا تھا یہ اندازہ لگانا مشکل ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی یہ قابل تعریف بات ہے کہ انھوں نے مثنوی کا خلاصہ بھی پیش کیا ہے اسکی ہیئت اور وزن بھی بیان کئے ہیں اس کا وزن، فعولن فعولن فعلون فعل ہے آخری رکن کہیں کہیں فعل کی جگہ فعلول ہوگیا ہے یہ تبدیلی قانون اور اوزان وبحور کی مناسبت سے کی گئی ہے۔ ''کدم راؤ پدم راؤ'' مثنوی کے قاعدہ پر پوری اترتی ہے۔ اس میں پہلے حمد ہے پھر نعت رسول اور اس کے بعد بانئ سلطنت بہمنی کی مدح آتی ہے۔ مدح کے بعد کئی صفحات گم ہیں جسکی وجہ سے قصہ فوراً شروع ہو جاتا ہے۔ قصہ کے درمیان میں سے بھی صفحات غائب ہیں۔ اس لئے قصہ کا تسلسل بار بار ٹوٹ جاتا ہے۔

انھوں نے اس میں کچھ مماثلث بھی پیش کی ہیں زمانہ قدیم میں ایسے قصوں میں دلچسپی لی جاتی تھی جن میں سحر اور جادوگری بیان کی جاتی تھی نظامیؔ نے اپنی مثنوی میں اسی طرح کے ملتے جلتے قصے بیان کئے ہیں۔ یہ مثنوی الف لیلہ کے قصوں سے مشابہت رکھتی ہے۔ وحید قریشی صاحب اپنے مضمون مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' میں لکھا ہے۔

> ''کتاب کا بنیادی حصہ مثنوی کے متن پر مشتمل ہے جس میں اس روایت کی پابندی کی گئی ہے جس کے سرخیل حافظ محمود شیرانی اور آخری اہم رکن ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان ہیں۔ گویا مرتب نے متن کی اس ٹیکنیک کو اختیار نہیں کیا جو دکنیات کے لئے ڈاکٹر زور اور ان کے ساتھیوں نے اختیار کی تھی اور جس میں صرف سیاق

عبارت تک اپنے آپ کو محدود رکھا جاتا تھا اور اٹکل سے لفظوں کی شناخت ہوتی تھی
۔ انھوں نے قلمی نسخے کے اندازِ کتابت اور املائی خصوصیات کو سباق عبارت کے
ساتھ ملاکر کر دیکھا ہے اور اپنی مساعی کو امکانی حد تک آگے لے گئے ہیں۔ اس کی
پہچان یہ ہے کہ انھوں نے اپنے طریق کو ایک ایک شعر پر منطبق کیا ہے۔'' [1]

انھوں نے قلمی نسخے کے ایک ایک شعر پر غور کیا ہوگا اس پر اتفاق نہیں کیا جا سکتا ہے اس کتاب میں آگے ڈاکٹر جمیل جالبی نے کچھ الفاظ کی فہرست پیش کی ہے۔ جس میں مخطوطہ اور متن دونوں کو ملا دیا گیا ہے پہلے مخطوطہ کا املا لکھا ہے اور اس کے سامنے متن کا املا لکھا ہے۔ انھوں نے چند اشعار کی مثالیں دے کر بتایا ہے ایک لفظ کو مختلف انداز سے لکھا ہے ۳۸۸ شعر میں مصرع اس طرح لکھا ہے۔

''کہ جی جا جانے آپے کسی پنک پاس''

اس میں ایک جاز یا وہ لکھا ہے ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے متن میں مصرع یوں لکھا ہے۔

''کہ جے جائے پیسے کسی پنکھ پاس''

کمال کی بات یہ ہے ۳۸۸ شعر میں یہ مصرع غائب ہے۔ بلکہ پوری کتاب میں یہ مصرع ندارد ایسے ایسے میں یہ یقین نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اصل مخطوطے میں ایک ایک شعر پر غور کیا ہوگا دوسری چیز یہ سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ جب انھوں نے عبدالحق صاحب پر نام بدلنے پر اعتراض کیا تو خود انھوں نے شعر میں تبدیلی کس وجہ سے کی۔ انھوں نے مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے کاتب کے بارے میں کچھ نہیں لکھا کیونکہ ترقیمہ موجود نہیں ہے انجمن ترقی اردو میں ایک نسخہ ''سیف الملوک بدیع الجمال'' کا ملا ہے جو اسی کاتب کے قلم سے تحریر کیا ہوا ہے۔ ترقیمہ تو اس میں بھی نہیں ہے۔ کتابت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کاتب نے املا اور رسم الخط الگ ڈھنگ سے لکھا ہے۔ کہیں ایک حرف کو مختلف طریقے سے لکھا ہے۔ جو آوازیں عربی فارسی کے علاوہ صرف اردو زبان سے مخصوص ہیں ان کے لئے کوئی اصول نہیں بنائے گئے ہیں۔ ان آوازوں کے اظہار کے لئے اپنی مخصوص علامتیں پیش کی ہیں۔ ان علامتوں کو کہیں تو ظاہر کیا ہے اور کہیں پڑھنے والے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ جس سے الجھن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اعراب کا استعمال بہت زیادہ ہے جزم کے لئے 'ہ' کا نشان لگایا گیا ہے قدیم مخطوطات میں اکثر 'ٹ' 'ٹ' کی شکل میں لکھا جاتا ہے کدم راؤ پدم راؤ میں

[1] وحید قریشی، مضمون کدم راؤ پدم راؤ، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ موئف گوہر نوشاہی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ۱۹۹۳ء ص ۲۵۴ ۔ ۲۵۵

بھی اسی طرح کے اصول اپنائے گئے ہیں مثلاً ''ناگپنی'' (ناگنی) وغیرہ۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کتاب میں مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' سے پہلے کی تحریروں کا جائزہ بھی لیا ہے۔ اس میں سید محمد اکبر حسینی کا ایک مختصر رسالہ خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی معراج العاشقین، شیخ باجن کی ''جکریاں''، امیر خسرو کی خالق باری دوہے، کہہ مکرنیاں اور پہلیاں بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بابا فرید گنج شکر کا کلام اور مسعود سعد سلمان کے دیوان ہندی کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد علی اثر اپنے ایک مضمون ''ڈاکٹر جمیل جالبی اور دکنی ادب کی تحقیق'' میں لکھتے ہیں۔

> ''کدم راؤ پدم راؤ'' کو اردو زبان و ادب کی تاریخ میں اس اعتبار سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ یہ اردو زبان و ادب کا پہلا ادبی نمونہ ہے اس سے قبل جو تحریریں دستیاب ہوئی ہیں وہ سب کی سب مذہبی نوعیت کی ہیں۔''[1]

یہی وجہ ہے کہ اردو زبان و ادب میں اس مثنوی کی تاریخی اعتبار سے کافی اہمیت ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے کتاب کے آخر میں بہمنی سلطنت کے بادشاہوں کا تعارف پیش کیا ہے اور انکی شخصیات پر تبصرہ بھی کیا ہے حضورؐ اور چاروں خلیفہ کی شخصیات کا ذکر بھی کیا ہے۔ آخر میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کو مرتب کر کے ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک غیر معمولی تحقیقی کارنامہ انجام دیا ہے۔

---

[1] ارمغان سہ ماہی کراچی جمیل جالبی نمبر، شمارہ ۳ (اپریل مئی جون ۹۶ء) ص ۱۱۱

قدیم اردو کی لغت

ڈاکٹر جمیل جالبی کو قدیم اردو سے بہت لگاؤ ہے۔ انھوں نے اسکا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ جس کی وجہ سے اردو ادب بہت مستفید ہوا۔ ایک ضمنی لیکن بڑا فائدہ یہ ہوا کہ قدیم اردو کی لغت ہمارے سامنے آئی۔

قدیم اردو کی لغت میں اشفاق احمد صاحب نے تعارف پیش کیا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحریر کردہ پیش لفظ ہے۔ آخر میں الفاظ و معنی شامل ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔ ''اس لغت کی داستان یہ ہے کہ ''تاریخ ادب اردو'' پر کام کرتے ہوئے مجھے سینکڑوں مخطوطات اور بیاضوں کے صحراؤں سے گزرنا پڑا۔ دورانِ مطالعہ اکثر ایسے لفظوں سے واسطہ پڑا جو میرے لئے اجنبی تھے۔ میں ان لفظوں کو ایک کاپی میں لکھ لیتا اور پھر سیاق وسباق کے حوالے، مختلف لغات کی مدد اور اہلِ علم سے گفتگو کرنے کے بعد جب ان لفظوں کے معنی معین ہو جاتے تو ان کے سامنے لکھ دیتا کچھ عرصے بعد میں نے یہ کیا کہ ہر وہ لفظ جو قدیم ادب میں استعمال ہوا۔ ایسے معنی اور حوالے کے ساتھ ایک کارڈ پر لکھ کر رکھ لیتا۔ یہ کام ۱۹۶۱ء میں شروع ہوا اور ۱۹۷۱ء میں ختم ہوا۔ جب کام ختم ہوا تو تقریباً اٹھارہ ہزار الفاظ کا ذخیرہ میرے پاس تھا۔ اس ذخیرے کو دیکھ کر میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ان الفاظ کو مرتب کر دیا جائے تو یہ لغت ان لوگوں کے لیے یقیناً مفید ثابت ہوگی جو قدیم اردو کی مطبوعہ کتب، مخطوطات اور قلمی بیاضوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی کی لغت نویسی پر اشفاق احمد صاحب نے جو تعارف لکھا ہے وہ اس طرح ہے

''قدیم اردو کی یہ لغت ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور مقرروں کے علاوہ زبان کے ماہروں، لسانیات کے استادوں، قواعد دانوں اور علم الانسان کے عالموں

۱؎ قدیم اردو کی لغت، ڈاکٹر جمیل جالبی، اردو سائنس بورڈ لاہور ۱۹۸۸ء ص ۷

کے سامنے فکری، تہذیبی اور لسانی سطح پر بہت سے نئے راستے کھولے گی اور پاکستان کے حوالے سے ایک مثبت رُخ متعین کرنے میں مدد دے گی۔[۱]

اس لغت کے سلسلے میں ڈاکٹر محمد علی اثر کا خیال ہے۔

''قدیم اردو کی لغت'' میں دسویں، گیارہویں اور بارہویں صدی ہجری کے ربع دوم تک کے قدیم اردو مخطوطات اور مطبوعہ کتابوں کے مشکل الفاظ وتراکیب کے معنی اور ان کے مترادفات درج کئے گئے ہیں۔ جالبی صاحب نے قدیم زبان وادب کے محققوں اور طالب علموں کی سہولت کی خاطر یہ مفید کام کیا کہ ایک ہی لفظ کی مختلف املائی شکلیں مصدر، حاصل مصدر، امر، ماضی مطلق مرکبات مشتقات کی بیشتر شکلیں شامل کردیں۔''[۲]

''قدیم اردو کی لغت کے بارے میں مشفق خواجہ صاحب لکھتے ہیں

''ممکن ہے اس لغت میں بعض باتیں ایسی نظر آئیں جو لغت نگاری کی عام روایت کے خلاف ہیں۔ مثلاً کہیں واحد کو لغت بنایا ہے اور کہیں جمع کو، اور کہیں دونوں ہی کو الگ الگ لغت مان کر معنی لکھ دیے گئے ہیں۔ یہ سب باتیں اس لغت کی اہمیت وافادیت کو کم نہیں کرتیں۔ کسی موضوع پر پہلی مرتبہ کام کرنے والے بعد میں کام کرنے والوں کو راستہ دکھاتے ہیں۔ ایک چراغ روشن کرتے ہیں تاکہ دوسرے اپنے چراغوں کو روشن کرسکیں۔ جالبی صاحب کا یہ کام اپنے موضوع پر بڑی حد تک پہلا کام ہے۔''[۳]

مشفق خواجہ صاحب نے لغت پر جو اعتراض کیا ہے۔ اس پر خود ہی صفائی بھی پیش کردی ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ آپ جب کوئی کام پہلی بار کرتے ہیں۔ تو اس میں کوئی نہ کوئی کمی ضرور ہوتی ہے۔ کیونکہ تجربہ کی کمی ہوتی ہے۔ خود ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

''اس لغت کو مرتب کرتے وقت میں نے حسب ضرورت مصدر حاصلِ مصدر، امر، ماضی مطلق، مرکبات ومشتقات کی بیشتر شکلیں شامل کردی ہیں تاکہ

---

۱ قدیم اردو کی لغت، ڈاکٹر جمیل جالبی، اردو سائنس بورڈ لاہور ۱۹۸۸ء ص ۳

۲ ڈاکٹر محمد علی اثر، مضمون ڈاکٹر جمیل جالبی اور دکنی ادب کی تحقیق مشمولہ ارمغان سہ ماہی جمیل جالبی نمبر شمارہ ۳ (اپریل۔ مئی جون ۹۶) ص ۱۱۳

۳ مشفق خواجہ، مضمون قدیم اردو کی لغت مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ، مؤلف گوہر نوشاہی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۹۳ء، ۴۲۳۔ ۴۲۴

قدیم ادب کا مطالعہ کرنے والے کو مصدر کی بدلی ہوئی شکل پہچاننے میں دقت نہ ہو۔ ساتھ ساتھ اگر ایک ہی لفظ مختلف املائی شکلوں میں ملا۔ تو اس کی یہ شکلیں بھی شامل کر دی ہیں تاکہ پڑھنے والے کو کسی غلط فہمی یا الجھن کا شکار نہ ہونا پڑے۔'' [۱]

مثال کے طور پر ہم چند الفاظ کے معنی پیش کر رہے ہیں جو اس طرح دیئے گئے ہیں۔

الف ممدودہ

"آبدی : ابد تک، تا ابد

آبولے : چپ، خاموش

آبھار : احسان، ذمہ داری

آبھاس : سایہ، روشن ہونا، سما جانا، تمہید، خلاصہ، جھلک

آبھاش : گفتگو، دیباچہ، بات چیت

آبھال : بادل

آبھیر : گوالا، اہیر

آپار : بے شمار، بے حساب، بے حد، بھت

آپارا : بلند، اوپر

آپ بَل : اپنی قوت سے، اپنی قوت

آپ بھاوتی : خود پسند

آپت : آفت

آپرانا : اوپر آنا، نکل آنا

آپروپ : نایاب، نادر، بدشکل، بے ڈول

آپ روپ : اپنی شکل، اپنا ظہور، نور الہد

آپسیں : آپ کو

آپنا :
آپنے : اپنا، اپنے

آپنین : اپنے

آپی : خود، آپ ہی

آپے : آپ

آپچ : آپ ہی

آپیں : آپ ہی آپ

آتش ڈوبنا : آگ بجھنا

آتم : روح، نفسِ ناطقہ، قالب، ذات

آتما : وہ ذاتِ نوری جو کُل میں محیط ہو،

آتمہ : خُدا

آتن :
آتین : تخلیق، پیدائش، خلقت

آتھنہ : بے وجہ

آتی کال : آنے والا کل۔ زمانہ، مستقبل'' [۲]

---

[۱]، [۲] قدیم اردو کی لغت ڈاکٹر جمیل جالبی، اردو سائنس بورڈ، لاہور ۱۹۸۸ء ص ۸ / ۹

آپس میں: اپنے آپ   آٹ   :   آٹھ، مشکل

ڈاکٹر جمیل جالبی نے دو لغت اور مرتب کیئے ہیں۔ ایک ''قومی انگریزی اور اردو لغت ہے''۔ دوسری لغت ''فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ'' اسکی دو جلدیں ہیں۔

ڈاکٹر عطش دُرانی لکھتے ہیں کہ ''ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''قومی انگریزی اردو لغت'' کا آغاز جولائی ۱۹۸۸ء میں کیا اور ۱۹۹۲ء کے اوائل میں یہ لغت بڑے سائز کے ۲۳۷۲ صفحات میں طبع ہوکر سامنے آ گیا۔ اس قلیل عرصے میں اتنا بڑا منصوبہ حسنِ تدبیر اور بہتر تنظیم ہی کی بدولت ممکن ہو سکتا تھا۔ اس تمام عرصہ میں ڈاکٹر صاحب دن رات اس کام میں مصروف رہے''۔[1]

ڈاکٹر جمیل جالبی ''قومی انگریزی اردو لغت'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

''ہماری یہ ''قومی انگریزی اردو لغت'' نہ صرف عہد حاضر کی جدید ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرتی ہے بلکہ سائنس و تکنیکی ذخیرۂ الفاظ کا بھی وسیع تر احاطہ کرتی ہے۔ اس میں قدیم کے ساتھ ساتھ جدید ترین معنی بھی شامل کئے گئے ہیں۔ البتہ وہ الفاظ چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ جو انگریزی زبان میں ۱۷۵۵ء سے پہلے متروک ہو چکے تھے۔ یہ لغت صرف کسی ایک پیشے یا علم سے وابستہ لوگوں کے لیے نہیں ہے بلکہ ہر علم، ہر پیشے اور ہر اس شخص کی ضرورت پوری کرنے کے لیے تیار کی گئی ہے جو کسی بھی جدید یا جدید ترین علم یا فن پر اردو زبان میں کام کرنا چاہتا ہے۔''[2]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے پیش لفظ میں مختصر الفاظ میں چند ضروری باتیں لغت کی مناسبت سے پیش کی ہیں۔ جس سے لغت کو سمجھنے میں پریشانی نہیں ہوگی۔ ہم چند الفاظ و معنی یہاں پیش کر رہے ہیں۔

۱۔ اناج کی ایک بیماری جس میں بیج کے گچھوں کی پھپھوندی لگ جاتی ہے۔ تاج پھپھوندی   covered smut

---

۱۔ ڈاکٹر عطش درانی مضمون قومی انگریزی اردو لغت کی تدوین اور ڈاکٹر جمیل جالبی، مشمولہ ڈاکٹر جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ۲۰۰۶، ص ۴۳۹

۲۔ قومی انگریزی اردو لغت، ڈاکٹر جمیل جالبی والیوم ۱ (A-M) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ۶-۱۹۹۳ء ص ۶

۲۔ چار پہیوں کی چھت دار گاڑی جس کی چھت لکڑی کی موڑ کر لگائی ہوئی محرابی بلیوں پر کرمچ کا کپڑا ڈال کر بنائی جاتی تھی ایسی گاڑیوں میں ہی ۱۹ ویں صدی میں امریکا کے ابتدائی مہم جو آباد کاروں نے مغرب کی طرف سفر کیا تھا، بند گاڑی	Covered Wagon
۳۔ غلاف ۔کوئی چیز جو کسی چیز کو چھپانے، آڑ دینے یا گرمی پہنچانے کے لیے اس کے اوپر ڈال دی جائے یا گرد لپیٹی جائے ۔ ملفوف کرنے یا چھپاز کا عمل ، پوشش ، اوڑھنا ، چادر ، پلنگ پوش ، دلائی ، دوہر ، رضائی ۔	Covering
۴۔ پلنگ پوش ، چادر ، بالا پوش ، رضائی ، لحاف گدڑی ، خول ، غلاف	Coveriet
۵۔ اضافی ادائیگی ، نائٹ کلب یا رستوران میں تفریح یا تواضع کے لیے مقررہ اضافی ادائیگی	Cover Charge
۶۔ (کرکٹ ،لیکروس جو شمالی امریکا کا ہاکی کے مانند کھیل ہے) وہ کھلاڑی جو پائنٹ پر کھڑے یا پائنٹ کھلانے والے کھلاڑی کی حمایت یا سپرداری کے لیے کھڑا ہو ۔ فیلڈر جو پائنٹ کے پیچھے کھڑا ہو	Cover Point
۷۔ دیانت داری سے نیکی سے ، عادلانہ ، منصفانہ طور پر	Righteously,Adv.
۸۔ پارسا ، صالح ، متقی ، دیانتدار ، نیک اخلاقیات کے اصولوں پر چلنے والا ، انصاف کو پسند کرنے والا ، منصف مزاج ، عادل ، راست باز	Righteous,a
۹۔ انسان کا دایاں ہاتھ ، ادب وعزت کی جگہ یا مقام	Right hand,n
۱۰۔ درستی ، عدل انصاف کا عمل یا رویہ ، مناسبت ، جواز	Rightfullness,n

مندجہ بالا الفاظ ڈاکٹر جمیل جالبی کی ’’قومی انگریزی اردو لغت‘‘ سے لیے گئے ہیں جو صفحہ نمبر ۴۷۳ اور ۱۷۰۴ پر موجود ہیں[۱]

’’فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ‘‘ کے بارے میں سیّد یعقوب میراں مجتہدی لکھتے ہیں۔

’’سقوط حیدر آباد دکن کے بعد جب جامعہ عثمانیہ میں اردو ذریعہ تعلیم ختم کر دیا

---

[۱] قومی انگریزی اردو لغت، ڈاکٹر جمیل جالبی والیوم ۱ (A-M) ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی۔ ۱۹۹۳ء ص ۴۷۳ ۔ ۱۷۰۴

گیا تو یہ سارا علمی سرمایہ نہ صرف منتشر ہو گیا بلکہ بہت کچھ نذرِ آتش بھی ہو گیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اصطلاحات کے اس منتشر علمی سرمایہ کے ایک معتد بہ حصّے کو یکجا و مرتب کر کے محفوظ کرنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے۔ انھوں نے ان اصطلاحات کو جامعہ عثمانیہ کی مطبوعہ کتابوں سے، جو پاکستانی کتب خانوں میں بکھری پڑی تھیں، چن چن کر یکجا کیا۔ اور ان کی ترتیب و تہذیب کی اور فروری ۱۹۹۱ء میں انھیں ''فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ'' کی شکل میں شائع کیا۔ جو ان کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔''[۱]

۱؎ سید یعقوب میراں مجتہدی، مضمون فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مولف گوہر نوشاہی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۹۳ء ص ۴۶۵

بزمِ خوش نفَساں

بزمِ خوش نفَساں شاہد احمد دہلوی کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے ترتیب دے کر ''بزم خوش نفَساں'' کا نام دیا ہے۔ یہ مضامین مختلف رسالوں میں بکھرے پڑے تھے۔ جن کو کتاب کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ ان مضامین میں دلّی کی اعلیٰ شخصیتوں کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ یہ لوگ اردو ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے عادات واطوار رنگ ڈھنگ بہت خوبصورت انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ ان شخصیتوں کے ساتھ شاہد احمد دہلوی کی یادیں وابستہ تھیں، جن کو ڈاکٹر جمیل جالبی کی فرمائش پر شخصی خاکوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ بقول ڈاکٹر جالبی

''یہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے کہ میں نے شاہد احمد دہلوی کی زبانی ان یادوں کی دل چسپ کہانیاں سن کر کہا کہ ''اگر وہ انھیں لکھ دیں تو یہ سب محفوظ ہو کر ہمارے ادب، ہمارے ماضی، ہماری تاریخ اور اس دور کی روح کی ترجمان بن جائیں گی۔ اس زمانے میں یادوں کا اظہار اُن کا روزمرہ بن گیا تھا۔ وہ گھنٹوں بیتے دنوں کی یادوں کو تازہ کرتے رہتے۔ اور میں ان سے کہتا۔ ''شاہد بھائی! یہ سب کچھ لکھ دیجئے۔'' اس بات کو کئی مہینے گزر گئے۔ دسمبر ۱۹۵۱ء میں انھوں نے ان یادوں کو سمیٹنے کے لیے قلم اٹھایا اور انکا پہلا مضمون ''خریطۂ خیال'' کے نام سے ماہنامہ ''ساقی'' کراچی کے جنوری وفروری ۱۹۵۲ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ جس میں دلّی کی چند قابلِ ذکر شخصیتوں کا دل چسپ انداز میں اس طور پر ذکر کیا گیا تھا۔ کہ گزرے ہوئے دنوں کی یادوں بھری تصویریں نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ اس مضمون کو نہ صرف میں نے بلکہ بے شمار پڑھنے والوں نے پسند کیا اور شاہد صاحب کو دل کھول کر داد دی''[1]

''بزم خوش نفَساں'' میں سب سے پہلے ڈاکٹر جمیل جالبی کے تین مضمون ہیں۔

۱۔ اس کتاب کے بارے میں ۲۔ شاہد احمد دہلوی ۳۔ صاحب طرز ادیب

اس کے علاوہ شاہد احمد دہلوی کے مضامین شامل ہیں۔ جن کی فہرست اس طرح ہیں۔ مولوی

---

[1] بزم خوش نفساں، ڈاکٹر جمیل جالبی، مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۸۵ ص ۷

عبدالحق، مولانا عبدالسلام نیازی، شوکت تھانوی، مولانا نیاز فتحپوری، فیض احمد فیض، مولانا صلاح الدین احمد، علامہ راشدالخیری، قاری سرفراز حسین، آغا شاعر قزلباش، کرشن چندر، حفیظ جالندھری، ڈپٹی صاحب (انتصار حسین)، نفاست حسین، دے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں، میر باقر علی داستان گو، میر جالب دہلوی، شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن، خواجہ ناصر نذیر فراق، نواب سائل دہلوی، مولوی احتشام الدین، مرزا چپاتی، نواب تاباں، ملّا واحدی، پنڈت امر ناتھ ساحر، خلیقی دہلوی، مرزا حیرت دہلوی، نہال سیوہاروی۔ آخر میں شاہد احمد دہلوی۔ کوائف وتصانیف شامل ہے۔

''خریطۂ خیال'' کے بعد دو مضامین کے مجموعے سامنے آئے۔ گنجینۂ گوہر'' اور ''اجڑا دیار''۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

> ''یہ وہ زمانہ ہے کہ میں اور شاہد بھائی ہر بات، ہر مشورے میں ایک دوسرے کے شریک تھے۔ اور جہاں جاتے ساتھ جاتے تھے۔ اُسی زمانے میں مینے شاہد بھائی سے کہا کہ یہ چھوٹے چھوٹے خاکے ہیں اگر ان شخصیتوں کے پورے خدوخال اُجاگر کیے جائیں اور ہر ایک کے بارے میں الگ الگ مضمون یا خاکے لکھے جائیں تو یہ بڑا کام ہوگا۔ یہ سب خاکے ۱۹۶۲ء میں مکتبۂ نیا دور سے ''گنجینۂ گوہر'' کے نام سے شائع ہوئے۔'' [۱]

شاہد احمد دہلوی کا ۱۹۶۷ء میں انتقال ہوگیا۔ ''گنجینۂ گوہر'' میں جو مضامین شائع ہوئے اس کے بعد اشاعت کا سلسلہ رُک گیا۔ ۱۹۶۲ء سے لے کر ۱۹۶۷ء تک جو مضامین لکھے گئے وہ رسالوں میں تو چھپتے رہے لیکن انھیں ترتیب دینے کا کام کسی نے نہیں کیا۔ شاہد احمد دہلوی سے ڈاکٹر جمیل جالبی کا تعلق اتنا گہرا ہو چکا تھا کہ ان مضامین کو ترتیب دینے کا خیال انھیں ہی آسکتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''شاہد احمد دہلوی کی وفات کے بعد میں نے ''ساقی'' کا ''شاہد احمد دہلوی نمبر'' مرتب کیا تو ارادہ تھا کہ باقی خاکے بھی مرتب کر کے شائع کرادونگا۔ ۱۹۶۲ء سے میں ''تاریخ ادبِ اردو'' لکھنے میں خود اتنا مصروف ہوا کہ کوئی اور کام کرنے کی نوبت ہی نہ آئی، لیکن یہ خیال مجھے ہمیشہ پریشان کرتا رہا کہ شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کو جلد شائع ہونا چاہئے۔ پچھلے سال مجھے ذرا سی فرصت ملی تو میں نے وہ

---

[۱] بزم خوش نفساں، ڈاکٹر جمیل جالبی، مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۸۵ ص ۸

تمام رسالے نکالے جن میں یہ خاکے شائع ہوئے تھے۔ ان خاکوں کو جمع کیا، انھیں پڑھا اور تصحیح کی۔ جن کے اصل مسودے میرے پاس تھے ان سے مقابلہ کیا۔ اور یہ کتاب کم وبیش مرتب کر دی۔ ابھی یہ کام یوں ہی پڑا رہتا اگر برادرم مشفق خواجہ صاحب اس مجموعے کو جلد شائع کرنے کا تقاضہ نہ کرتے میں نے لگ کر اس کام کو پورا کیا اور اسے زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی کوشش کی۔ وہ شخصیتیں جن کے بارے میں شاہد احمد دہلوی نے دو تین بار لکھا۔ ان کے سب واقعات کو، اس شخصیت کے تحت، ایک جگہ کر دیا ہے۔ جن شخصیتون پر انھوں نے اختصار سے لکھا لیکن بعد مین ان پر تفصیل سے پورا مضمون لکھا، اس کتاب میں یہ پورا مضمون لے لیا ہے اور مختصر مضمون کو اس لئے چھوڑ دیا ہے کہ پورے مضمون میں سب باتیں آ گئی ہیں، اس طرح اس کتاب میں ۱۳ پورے خاکے اور ۱۳ مختصر خاکے یعنی کل ۲۶ خاکے شامل ہیں۔''[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے شاہد احمد دہلوی سے پہلی ملاقات کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بڑا پرلطف ہے۔

''جب میں اس دکان میں داخل ہوا تو وہاں ایک نئے صاحب کو بیٹھے دیکھا ڈھیلی ڈھالی گہرے کتھئی رنگ کی شیروانی، کھلتا ہوا سیاہ رنگ، پھیلی ہوئی کھڑی ناک، مسکراتے ہوئے سنجیدہ ہونٹ، منہ میں بیڑی، آنکھوں پر موٹے فریم کا چشمہ، ڈاڑھی مونچھ صاف، سر پر جناح کیپ، چہرے پر ایک وقار اور سنجیدگی۔ کوئی بات کرتا تو مسکرا کر خاکسارانہ انداز میں مختصر سا جواب دیتے اور خاموش ہو جاتے۔ کوئی کچھ اور کہتا تو زور سے ہنس کر ذرا سی دیر میں پھر سنجیدہ ہو جاتے۔ وہ کتابوں کی دکان تھی۔ بہت سے خریدار آ جا رہے تھے۔ آنے والوں میں سے اکثر اُن صاحب سے سلام دُعا کرتے۔ احترام سے ہاتھ ملاتے۔ خیر صلاّ خیر عافیت پوچھتے۔ کچھ دیر ٹھہرتے اور چلے جاتے۔ یہ دیکھ کر میں نے سوچا کہ آخر یہ صاحب ہیں کون؟ میں نے برابر کھڑے ایک صاحب سے پوچھا جو ان سے بات چیت کر کے ابھی فارغ ہوئے تھے انھوں نے ایک دفعہ مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر جلدی سے

---

[۱] بزم خوش نفساں، ڈاکٹر جمیل جالبی، مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۸۵ ص ۹

بولے۔ ''شاہد احمد دہلوی'' یہ نام سنتے ہی میرے جسم میں ایک لہر دوڑ گئی۔ شاہد صاحب اس زمانہ میں ایک عزیز کے ساتھ مارٹن روڈ پر رہتے تھے۔ ایک دن میں ملنے کے ارادے سے چلا۔ شاہد صاحب ململ کرتا پہنے، تہبند باندھے پلنگ پر بیڑی پی رہے تھے میں نے کہا شاہد صاحب میں آپ سے ملنے آیا ہوں مسکرا کر میرا خیر مقدم کیا۔ آیئے یہیں بیٹھ جایئے۔''[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے شاہد احمد دہلوی کے مضامین کے ساتھ ساتھ انکی زندگی کی کتاب کے کئی اوراق بھی کھول دیئے ہیں۔ جن کو پڑھ کر انکی شخصیت کو پہچاننے میں آسانی ہوتی ہے۔

۱؎ بزم خوش نفساں، ڈاکٹر جمیل جالبی، مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۸۵ ص ۱۱۔۱۲

ن۔م۔راشد ایک مطالعہ

ڈاکٹر جمیل جالبی نے چند کتابیں ایسی پیش کی ہیں جن سے مرے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کو نئی زندگی ملی ہے۔ان شعرا میں ن۔م۔راشد کا بھی نام آتا ہے۔ یہ تقسیم سے پہلے کے شاعر ہیں ان کا نام جدید شاعری کے بانیوں میں آتا ہے۔راشد کی شاعری کی ابتداء ۱۹۳۲ء کے آس پاس ہوئی۔

ن۔م۔راشد ایک مطالعہ میں پیش لفظ کے بعد حالات وکوائف بیان کئے گئے ہیں۔جس میں ان کا نام نذر محمدؐ راشد ہے۔قلمی نام ن۔م۔ راشد، تاریخ پیدائش ۹رنومبر ۱۹۱۰ء، مقام پیدائش گوجرانولہ (پاکستان) مذہب اسلام اور تعلیم بی.اے.فارسی میں آنرز، ایم.اے.معاشیات سے کیا ہے۔ اس میں مطبوعہ تصانیف، تراجم، غیر مطبوعہ تصانیف، زیرِ ترتیب تصنیفات، انتظامی امور کا تجربہ، ادارت و صحافت کا تجربہ، تدریسی تجربہ، دیگر سرگرمیاں، بیرونی سفر اور وفات ۹ر اکتوبر ۱۹۷۵ء بمقام لندن شامل ہیں۔کوائف کے بعد شخصیت پر تین مضمون ہیں۔ ساقی فاروقی کا حسن کوزہ گر، آغا عبدالحمید کا راشد چند خط، چند یادیں، غلام عباس کا راشد، چند یادیں۔

''مطالعہ فن'' میں ۱۳ر مضامین دیئے گئے ہیں جن سے اُن کے فکر و فن پر روشنی پڑتی ہے۔

ا۔ راشد کا ذہنی ارتقاء۔ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی، ن۔م۔ راشد۔ ابتدائی دورِ شاعری ۔ فیض احمد فیض، شاعروں کا شاعر۔ ڈاکٹر آفتاب احمد، ن۔م۔ راشد :نئی نظم اور پورا آدمی ۔ سلیم احمد، ن۔م۔راشد۔ عزیز احمد، ن۔م۔راشد کی شاعری۔ وارث علوی، ن۔م۔راشد ڈاکٹر وزیر آغا، راشد کی شاعری کا کیریکٹر۔ممتاز حسین، ن۔م۔راشد، انسان اور خدا۔ عالم خوندمیری، راشد کی تین نظمیں، تجزیاتی مطالعہ ۔ میراجی، راشد کی ایک نظم، ایک تجزیہ۔ محمد حسن عسکری، ن۔م۔راشد پر۔علی جواد زیدی، راشد کی چند نظموں کی ابتدائی صورتیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی۔

''خطوط'' کی فہرست میں بنام آغا عبدالحمید، بنام ضیا جالندھری، بنام ڈاکٹر سیّد عبداللہ، بنام امین حزیں، بنام ڈاکٹر جمیل جالبی شامل ہیں۔

''نقطۂ نظر'' میں ن۔م۔راشد اور ساقی فاروقی کا جدید شعری رویے، ن۔م۔راشد کا۔ہیت کی تلاش، ن۔م۔راشد کا نظم اور غزل ہے۔آخر میں ''دس نظمیں'' ہیں جو کسی مجموعے میں شامل نہیں

ہیں۔ساقی فاروقی نے ''حسن کوزہ گر'' میں انکے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی ہے اور سب سے اہم واقعہ انکی وفات کا بیان کیا گیا ہے بہت ہی عجیب وغریب انداز سے انکی موت ہوئی اپنے سالے کی موت کا پرسہ دینے گئے تھے۔ ساس سے انکے بارے میں سنتے سنتے ہارٹ فیل ہوگیا۔

ن۔م۔راشد شاعری کے ساتھ ساتھ تنقید نگاری بھی کرتے تھے۔ بقول غلام عباس ''راشد تنقید کی بھی بے پایاں صلاحیت رکھتے تھے۔انھوں نے یورپ کے اعلیٰ پایہ کے نقادوں کو بہت غور سے پڑھا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ''اردو ادب پر غالب کا اثر۔''''ظفر علی خاں کی شاعری''''انارکلی''،''اختر شیرانی کے ساتھ لمحے'' کے عنوانوں سے جو مقالات لکھے تھے ان میں تنقید کا بہت اونچا معیار پیش کیا گیا تھا۔''[۱]

''راشد کا ذہنی ارتقاء'' میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں کہ ''ماورا'' سے لے کر ''ایران میں اجنبی'' تک اور اس کے بعد ''لا۔انسان'' کی نظموں کو غور سے پڑھا جائے تو راشد کی شاعری کا جو کردار تشکیل پاتا ہے اس کا تعلق ہم اس روایت سے باآسانی جوڑ سکتے ہیں جسے ہم دانشوری کی روایت کہتے ہیں۔''[۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی پیش لفظ میں لکھتے ہیں ''ن۔م۔راشد کی بنیادی حیثیت ایک ایسے اہم شاعر کی ہے جس نے نہ صرف اپنے دور کی روح کی سچی ترجمانی کی ہے بلکہ نئی نسل میں نیا شعور پیدا کر کے، تخلیقی سطح پر نئے رویّوں کو متعین کرنے کا کام بھی کیا ہے آزاد نظم کو عام کرنے میں انکا نام سرفہرست آتا ہے۔ن۔م۔راشد نے روایت سے انحراف کیا ہے لیکن ساتھ ساتھ انحراف کو روایت سے ملایا بھی ہے یہی ان کے فن کی انفرادیت ہے۔''[۳]

انکی شاعری کے سلسلے میں شہناز کوثر کا خیال کچھ اس طرح ہے۔

''راشد کے ہاں بھی نظریات کا ارتقاء ہے۔ہیئت اور مواد کے نئے تجربات موجود ہیں۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۷۱ء تک ان کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو اس میں ایک مسلسل تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔شاعر اپنے عہد کے ساتھ بدلتا جا رہا ہے۔نئی

۱؎ ۲؎ ۳؎ ن۔م۔راشد ایک مطالعہ ڈاکٹر جمیل جالبی مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۸۶ء ص ۶/۶۵/۵۶

شاعری نئے نفسی ماحول کی پیداوار ہے۔راشد نے نفسی ماحول کی تشریح کرتے ہوئے خارجی ماحول کو مکمل طور پر بدلا ہوا بتایا ہے۔راشد کی ساری شاعری حال کے مسائل سے جنم لیتی ہے اور زندہ مسائل سے تعلق رکھتی ہے۔اسی تصادم اور کش مکش سے راشد کا نیا نفسی ماحول جنم لے رہا ہے۔''[۱]

عزیز احمد ''راشد کی شاعری'' میں لکھتے ہیں،''ن۔م۔راشد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نظمِ آزاد کو اردو میں مستقل کیا۔ یہ تحریک فرانسیسی رمزیت کے ابہام اور سہل پسندی کا ردِّعمل تھی۔لیکن اس کی نظم آزاد فرانس ہی کے اثر، یعنی فرانسیسی اور بالخصوص لافورگ کی نظم آزاد کی مرہونِ منّت ہے۔ راشد صاحب نے اس طرز کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔اس میں شک نہیں کہ وہ اس نظم آزاد کو قافیے اور ردیف سے بالکل بے نیاز نہیں کر سکے۔[۲]

فرانسیسی اثر کے بارے میں شہناز کوثر کا خیال ہے کہ ''میرا جی کے بعد اردو کے دوسرے شاعر ن۔م۔راشد ہیں۔ جنھوں نے فرانسیسی شعرا کا اثر قبول کیا، خاص طور پر میلارمے کا اثر۔ن۔م۔راشد تقسیم سے پہلے ابھرنے والے ممتاز شاعروں میں سے ہیں۔''[۳]

ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ ''ن۔م۔راشد ایک باشعور فنکار تھے۔اپنے خیالات اور محسوسات کو موزوں ترین لفظوں میں اپنے قارئین تک پہنچانے کے لئے اپنی نظموں میں محنت و کاوش کے ساتھ تبدیلیاں کرتے رہتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ایک طرف انکا فن آخر وقت تک آگے بڑھتا رہا اور دوسری طرف ان کی نظمیں ابلاغ، ساخت اور اظہار کے اعتبار سے بہتر ہوتی چلی گئیں۔''[۴]

اس کتاب کے ''نقطۂ نظر'' والے حصّے میں ن۔م۔راشد کا مضمون ہے۔''ہیت کی تلاش'' اس میں راشد نے ی بتایا ہے کہ انسان اپنی زندگی میں کوئی بھی نیا تجربہ کرتے ہوئے ڈرتا ہے۔ پرانی روایتوں سے آنکھ چُرانا بہت مشکل کام ہے۔ جبکہ ترقی کرنے کے لئے جدوجہد اور نئے تجربے کرنا بھی بہت ضروری ہے۔یہ بات بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے کہ اگر آپ نئی راہ اپناتے ہیں تو دنیا والے آپ پر انگلی اٹھائیگے۔

---

۱ ۔ ۳ شہناز کوثر مضمون فرنسیسی شعراء کا اثر میراجی اور ن۔م۔راشد پر مشمولہ قومی زبان کراچی دسمبر ۲۰۰۰ جلد ۷۲ شمارہ ۱۲ ص ۴۴،۴۳

۲ ۔ ۴ ن۔م۔راشد ایک مطالعہ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۸۶ء ص ۲۲۰،۱۳۵

بقول ن۔م۔راشد'' نئے ادب کی تحریک اور طرزِ نگارش کے تجربات کا ایک طرح سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ دونوں ادب کے چہرے سے تصنع کا پردہ ہٹانا چاہتی ہیں۔شعر کو شخصی ملکیت کے درجے سے بلند کر کے عالمگیر اور آفاقی بنانا چاہتی ہیں۔شاعری کو افراد کے شخصی تجربات کے بجائے تمام انسانوں کی بنیادی ضروریات کے اظہار کا ذریعہ بنانا چاہتی ہیں۔''[۱]

آخر میں جو دس نظمیں شامل کی گئیں ہیں انکے عنوان ''تصوف''، ''پرانی سے نئی پود تک''،''میں''، ''مسز سالا مانکا''،''اے وطن اے جان''،''اک زمزمے کا ہاتھ''،''آگ اور حِنا''،''برزخ''، ''بے چارگی'' اور ''رات عفریت سہی'' ہیں۔ یہ نظمیں کسی مجموعے میں شائع نہیں ہوئی ہیں۔ مجھے اس کی ''اے وطن اے جان'' پسند آئی۔

اے وطن اے جان　　　　تیری انگبیں بھی اور خاکستر بھی میں

اس کتاب سے ن۔م۔راشد کی شخصیت کھل کر سامنے آتی ہے اور ان کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

---

[۱] ن۔م۔راشد ایک مطالعہ مرتبہ جمیل جالبی مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۸۶ء ص ۳۵۰

کلّیاتِ میراجی

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''کلّیات میراجی'' میں میراجی کا کلام جمع کر کے اسے شائع کرایا ہے۔ اس میں الطاف گوہر نے پیش لفظ لکھا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر جالبی کا لکھا ہوا مقدمہ اور کوائفِ میراجی ہے۔

میراجی کا اصل نام محمد ثنا اللہ ثانی ڈار ہے۔ تخلّص پہلے ''ساحری'' پھر ''میراجی''، ہزلیہ شاعری میں تخلّص لندھور آیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے علاوہ بھی میراجی پر چند لوگوں نے قلم اُٹھایا ہے۔ لیکن جس انداز سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے انکی شاعری کے ہر پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ وہ اہم ہے۔ ؟ کلّیاتِ میراجی ۱۰۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ انکے کلام کو ترتیب دینے کی اصل وجہ یہ تھی کہ میراجی نئے امکانات کے شاعر ہیں۔ اور یہ امکانات ان کی ساری شاعری کا مطالعہ کر کے ہی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ نئی نسل کو انکے کلام سے واقف کرانا بھی ضروری تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے

> ''میراجی کے دوست احباب نے ان کے حُلیے اور خارجی روپ بہروپ کے انوکھے قصے اور دلچسپ واقعات اس کثرت سے سنائے ہیں۔ سننے سنانے والے کو لطف تو بڑا آیا لیکن ان جزئیات کے دھویں میں ان کی شاعری چھپ گئی۔ یہ کلیات اس دھویں کو کم کرنے اور میراجی کی شاعری کو دوبارہ سامنے لانے کی ایک کوشش ہے۔''[۱]

> الطاف گوہر لکھتے ہیں کہ ''کوئی درویش تھا جو بال بڑھائے، ہاتھوں میں گولے اور گلے میں مالا سجائے سچ کی تلاش میں اس نگری میں آنکلا۔ اور جب اس نے دیکھا کہ یہاں تو جھوٹ ہر لحہ جواں رہتا ہے تو وہ جہاں سے آیا تھا وہیں پلٹ گیا۔ لیکن اس مختصر سے عرصے میں اس کی ذات ہر ملنے والے کی زندگی پر اپنا عکس چھوڑ گئی۔''[۲]

میراجی ایک باغی شاعر تھے۔ وہ ہندوستان کی مٹی کو بہت پیار کرتے تھے۔ میراجی نے اردو شاعری کی عمومی روایت کو پسند نہیں کیا۔ انھوں نے اردو شاعری کی ہیئت، پیکر، علامت، شعری تجربات

۱۔ کلیات میراجی ڈاکٹر جمیل جالبی، اردو مرکز لندن ۱۹۸۸ء ص ۲۷

۲۔ الطاف گوہر مضمون میراجی صاحب مشمولہ کلیات میراجی، مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی اردو مرکز لندن ۱۹۸۸ء ص ۲۶

اور طرزِ احساس کو بدلنے کی بھر پور کوشش کی ہے۔ حقیقت کو تصوّر سے اور تصوّر کو حقیقت سے بڑی خوبصورتی سے جوڑ دیا۔ اور شاعری کو قدیم رسموں سے نکال کر جدیدیت میں داخل کر دیا۔

میراجی کے ساتھ یہ زیادتی ہوئی کہ انکا کلام خاصی مدت گزرنے کے بعد منظرِ عام پر آیا کلّیاتِ میراجی کی اشاعت سے میراجی کو نئی زندگی ملی۔ بقول ڈاکٹر رشید امجد

> ''کلّیاتِ میراجی'' کی اشاعت سے پہلے میراجی کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے تھے انکا نام یہ ہیں: میراجی نظمیں (۱۹۴۴ء)، میراجی کے گیت (۱۹۴۳ء)، گیت ہی گیت (۱۹۴۴ء) تین رنگ (۱۹۶۸ء) اور پابند نظمیں (۱۹۶۸ء)۔ عام رائے تھی کہ ان کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام اختر الایمان کے پاس محفوظ ہے۔ جمیل جالبی نے ''کلّیاتِ میراجی'' میں نہ صرف ان کے مطبوعہ کلام کو شامل کیا بلکہ اختر الایمان اور میراجی کے دوسرے دوستوں سے بھی جو کچھ دستیاب ہو سکا اسے بھی ایک جگہ جمع کر دیا۔''[۱]
>
> اس بات کا اعتراف خود ڈاکٹر جمیل جالبی نے کیا ہے۔ ''اس کلّیات میں میراجی کا وہ سارا کلام شامل ہے جو کتابی صورت میں اب تک شائع ہو چکا ہے اور وہ سارا کلام بھی جو غیر مطبوعہ اور جناب اختر الایمان کے پاس تھا۔ اس میں ''حلقۂ چشمِ سیہ'' نامی بیاض کا کلام بھی شامل ہے۔ جو وحید قریشی کے پاس ہے۔ وہ کلام بھی شامل ہے۔ جو مختلف رسائل و جرائد کے صفحات پر بکھرا ہوا تھا۔ کلّیاتِ میراجی میں شامل ہے۔''[۲]

کوائفِ میراجی میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے انکی تصانیف، تنقید اور تراجم بھی پیش کئے ہیں۔ تصانیف: شاعری میں میراجی کے گیت، میراجی کی نظمیں، گیت ہی گیت، پابند نظمیں اور تین رنگ شامل ہیں۔ تنقید میں مشرق و مغرب کے نغمے: (تنقید و تراجمِ شاعری)، اس نظم میں، تراجم: نگار خانہ (سنکرت شاعر دامودر گپت کی کتاب ''نٹنی مَتَم کا نثری ترجمہ)، خیمے کے آس پاس، (عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ) اس کے علاوہ میراجی کی دو نظمیں ''رسیلے جرائم کی خوشبو'' اور ''جوانی کے گھاؤ'' بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''کلّیاتِ میراجی'' مرتّب کر کے اردو شاعری کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ اردو نظموں کو ایک نیا انداز عطا کیا اور ایک کھوئی ہوئی شخصیت کو پھر سے زندہ کر دیا۔

۱؎ ڈاکٹر رشید امجد مضمون میراجی پر دو اہم کتابیں، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ء ص ۲۳۰

۲؎ کلّیات میراجی، ڈاکٹر جمیل جالبی، اردو مرکز لندن ۱۹۸۸ء ص ۲۹

میرا جی - ایک مطالعہ

ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب ''میرا جی ایک مطالعہ'' میرا جی کی پراسرار شخصیت کو سمجھنے کے لئے بہت اہم ہے۔اس کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلومات آسانی سے فراہم ہوگئیں کہ ثناءاللہ کس طرح اور کیوں میرا جی بن گئے۔انکی مختصر زندگی میں ایک دو لمحے ایسے بھی آئے کہ جب وہ ثناءاللہ کی شکل میں واپس آئے لیکن جلدی ہی میرا جی کا روپ ان پر حاوی آ گیا اور آخری سانسوں تک وہ میرا جی کے روپ میں نظر آئے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ادبی دنیا کے مضمون نگاروں کے مختلف مضامین ''میرا جی ایک مطالعہ'' میں پیش کئے ہیں۔اس میں ہر ایک شخص نے میرا جی کے شخصیت پر اپنے خیال کا اظہار کیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ میرا جی کے ساتھ گذارا ہے۔انکو بہت قریب سے دیکھا اور جانا ہے۔

ابتدائی صفحات میں اس کتاب کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ''کوائفِ میرا جی'' پیش کیا گیا ہے۔ پھر ایک طویل مقدمہ ہے اس میں میرا جی کی پوری زندگی اور انکی جدید اور انوکھی شاعری کا احاطہ کیا ہے۔''اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے حصہ اول میں چھ عنوانات کے تحت مختلف طرز کے مضامین پیش کئے گئے ہیں۔ جو اس طرح ہیں میرا جی کی شخصیت، فن، مطالعۂ شاعری، گیت، نثر و تنقید اور متفرق مطالعے۔ان عنوانات پر تیس مضامین تحریر کئے گئے ہیں۔ حصہ دوم میں میرا جی کی تحریریں اور انکے کچھ خطوط شامل ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے مقدمے میں لکھا ہے کہ میرا جی کا اصل نام محمد ثناءاللہ ثانی ڈار تھا وہ ۲۵ مئی ۱۹۱۲ء کو لاہور میں پیدا ہوئے پہلے تخلص ''ساحری'' تھا پھر میرا جی تخلص رکھ لیا وہ میرا سین نامی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گئے تھے۔اس کی مناسبت سے میرا جی بن گئے۔ان کا حلیہ بھی بہت عجیب و غریب تھا۔لمبے لمبے بال بڑی بڑی مونچھیں گلے میں ایک مالا پھٹے پرانے کپڑے بیاصنوں کا پلندہ بغل میں دبا رہتا تھا شراب نوشی بہت زیادہ کرتے تھے۔

اس کے بعد منٹو کے مضمون ''تین گولے'' اور الطاف گوہر کی پہلی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ان مضامین سے میرا جی کی شخصیت کھل کر سامنے آ گئی ہے ڈاکٹر جمیل جالبی انکی تخلیق کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''انھوں نے اپنی زندگی کے چراغ کی بتّی کو دونوں سروں سے یقیناً جلایا اور

صرف ۲/۱ ۳۷ سال کی عمر میں ۳ نومبر ۱۹۴۹ء کو مر گئے۔ اس مختصر سی عمر میں میرا جی نے اتنا لکھا کہ آج صرف ان کی کلیاتِ شاعری ہی ۱۰۸۰ صفحات پر مشتمل ہے اور حال ہی میں اردو مرکز لندن سے شائع ہوئی ہے ان کی تصانیف میں جہاں مشرق و مغرب کے نغمے (۱۹۵۸ء) اس نظم میں (۱۹۴۴ء) نگار خانہ (۱۹۵۰ء) خیمے کے آس پاس (۱۹۶۴ء) شامل ہیں وہاں میرا جی کے گیت (۱۹۴۳ء) میرا جی کی نظمیں (۱۹۴۴ء) گیت ہی گیت (۱۹۴۴ء) پابند نظمیں (۱۹۶۸ء) اور تین رنگ (۱۹۶۸ء) شاعری کے وہ مجموعے ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو نئے امکانات سے روشناس کرایا اور اسے اس راستے پر ڈال دیا جس پر آج وہ گامزن ہے۔"[1]

موت نے انھیں جینے کی بہت کم مہلت دی لیکن مختصر سی مدت میں انکے قلم نے وہ خدمات انجام دیں جو کوئی طویل عمر گذار کر بھی نہیں دے سکتا تھا۔ وہ ادب میں شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی اتنا کام کر گئے ہیں کہ رہتی دنیا تک انھیں یاد کیا جائے گا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی میرا جی کے اندر بودلیئر کی شبیہ محسوس کرتے ہیں۔ جس طرح بودلیئر نے شروع میں اپنی ذات کے لئے شاعری کی ہے اسی طرح میرا جی نے بھی ابتدا میں پنے لئے شاعری کی ہے۔ بودلیئر نے بطور احتجاج اپنا سر منڈوا دیا تھا میرا جی نے بھی ایک نئے سال پر اپنا سر منڈوا دیا۔ بودلیئر نے اپنی ماں کو لکھا کہ کبھی کبھی تین دن تک بستر پر لیٹا رہتا ہوں نہ کھانے کو ہوتا ہے نہ پینے کو ہوتا ہے میرا جی نے ایک خط میں اپنے دوست کو لکھا کہ تین دن بھوکا رہنے سے طبیعت صاف ہوگئی ان مثالوں سے ڈاکٹر جمیل جالبی یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ میرا جی نے جو یہ اپنا حلیہ بنایا تھا وہ دوسرے لوگوں سے متاثر ہوکر بنایا تھا یہ انکی ذاتی تخلیق نہیں تھی انھوں بودلیئر کے علاوہ ایڈگر ایلین پو، لارنس، میلارمے اور چنڈی داس وغیرہ کا بڑا گہرائی سے مطالعہ کیا انکی حرکات وسکنات سے متاثر ہوکر ایسا انوکھا روپ اختیار کیا کہ دیکھنے والے حیرت میں پڑ جائیں۔ لیکن میرے خیال میں انھوں نے یہ ہیئت کسی سے متاثر ہوکر نہیں اختیار کی تھی بلکہ وہ خود کمپلکس کا شکار تھے محرومی اور تنہائی نے انکی یہ حالت بنائی تھی اختر الایمان نے اپنے مضمون "میرا جی کے آخری لمحے" میں لکھا ہے کہ میرا جی نے ایک بار ان سے کہا

"اختر دیکھو، یہ لوگ مجھ میں سے میرے Complexes کو نکالنا چاہتے

---

[1] میرا جی ایک مطالعہ ڈاکٹر جمیل جالبی ص ۳۴

ہیں مگر میں ایسا نہیں ہونے دو نگا یہ نکل گئے تو میں کیسے لکھونگا کیا لکھونگا Complexes ہی تو میری تحریریں ہیں۔'' [۱]

یہ ہوسکتا ہے کہ وہ دوسروں کی توجہ کے متلاشی ہونگے تب ہی ایسی حرکتیں کرتے ہونگے وہ اپنے قریبی رشتہ داروں سے دور ہوگئے تھے۔ انھیں احساس تنہائی ستاتی ہوگی تب ہی انھوں نے یہ روپ اختیار کیا ہوگا۔ میرے خیال میں میراجی نے بودلیئر وغیرہ میں اپنا عکس تلاش کرلیا تھا اور وہ تصویر دھیرے دھیرے ابھر کر سامنے آ گئی۔ مگر کمال کی بات یہ ہے کہ میراجی نے ایڈگر پو اور بودلیئر کی انھیں باتوں پر مذمت کی جن پر وہ خود عمل پیرا تھے۔ انکی زندگی دو حصّوں میں بٹی ہوئی ہے۔ نثر میں وہ جن باتوں پر تنقید کررہے ہیں شاعری میں وہ خود اسی شکل میں نظر آتے ہیں۔ اعجاز احمد اپنے مضمون ''میراجی۔ ذات کا افسانہ'' میں لکھتے ہیں۔

''اس کی نثر کی اخلاقیات موجودہ معاشرے کی اخلاقیات ہے اور قدم قدم پر خود اس کی زندگی اور شاعری کی نفی کرتی ہے میراجی تمام عمر دو حصّوں میں بٹا رہا اور ایسی دوہری اخلاقیات برتتا رہا جس کی ایک شق کا دوسری شق سے علاقہ نہ تھا'' آگے لکھتے ہیں ''نظموں سے لگتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں وہی اخلاقی رویے روا رکھے جو شاعری میں برتتے ہیں مگر نثر پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ دل کا چور مرا نہیں اور میراجی کو مجبور کرتا رہا کہ دنیا کو اور اپنے آپ کو ایسی نظر سے دیکھے جس سے انکار اس کی شاعری میں پنہاں ہے اس نے اپنا تجربہ آخر کار معاشرے کی رہتی قدروں کے تحت کیا جن سے وہ بغاوت کرنا چاہتا تھا اپنے اندر اخلاقی جنس زوال کی علامتیں پائیں اور اپنے آپ سے نفرت برتی جس کا اظہار ایک طرف تو خود ایذائی کی خواہشوں میں ہوتا اور دوسری طرف ایسے شاعروں پر قلم اٹھایا جن میں وہ خود اپنا عکس دیکھتا تھا۔'' [۲]

مندرجہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک اذیت پسند انسان تھے اور احساسِ محرومی انکے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ انھیں اپنی خامیوں کا بھی احساس تھا لیکن وہ دوسروں کو متوجہ کرنے کے لئے ایسی ہیئت اختیار کرتے تھے ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ خیال صحیح ہے۔ کہ میراجی ایسی نوجوان نسل سے تعلق رکھتے تھے جب نوجوانوں کو افلاس مایوسی، بے روزگاری اور بے یقینی نے گھیر لیا تھا۔ ایسے حالات میں مستقبل کے بارے میں کون سوچ سکتا ہے میراجی نے خود کہا ہے کہ مستقبل سے میرا تعلق بے نام سا ہے

۱، ۲ میراجی ایک مطالعہ ڈاکٹر جمیل جالبی ص ۱۷۳ / ۲۰۰

حقیقت بھی یہی ہے کہ اس وقت نوجوان نسل جن حالات کا شکار تھی اس میں حال کا تو پتہ نہیں تھا تو مستقبل کے بارے میں کیا سوچا جاسکتا تھا اگر اس نظریے سے انھیں دیکھا جائے تو وہ اپنی جگہ ٹھیک تھے۔ جس روپ میں انھوں نے خود کو ڈھالا اور جو روپ انھوں نے اختیار کیا وہ ان جیسا محرومی کا شکار نوجوان ہی کر سکتا تھا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے مقدمے میں انکے کئی خطوط کے حوالے دیئے ہیں اور اس پر تبصرہ کیا ہے۔ ان خطوط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جو بھی کر رہے تھے وہ انجانے میں نہیں کر رہے تھے۔ وہ اپنی حرکات کو بخوبی سمجھتے تھے۔ وہ معاشرہ کی خرابیوں سے بدظن تھے اور اسی لیے وہ بغاوت پر آمادہ ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے لئے کبھی کچھ نہیں سوچا بلکہ نوجوان نسل کے لئے وہ بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔

میراجی نے اپنے علمی سفر میں راستہ تبدیل کر لیا تھا۔ انھوں نے شاعری کے تمام قائدے قانون توڑ ڈالے، بحر اور وزن سے اپنی شاعری کو آزاد کر دیا نئے نئے موضوعات اور نئی علامات ولفظیات کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ ایک نیا بندر ابن آباد کیا جس کی ہر شے نئی تھی انکی شاعری میں ابہام کا رنگ بہت گہرا تھا۔ اس ابہام کی اصل وجہ جنس ہے جسکا عمل دخل انکی شاعری میں بہت ہے۔ جنسیات کے بغیر انکی شاعری مکمل نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک ایسے نقشے کا ذکر کیا ہے جسکی نقل انھیں بیدار بخت سے حاصل ہوئی۔ اس میں میراجی اپنے نئے مجموعے مرتب کرنے پر غور کر رہے ہیں میراجی اپنی زندگی کے آخری سفر میں تنہائی سے ترکِ تعلق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں شاید وہ اپنے حالات سے تنگ آچکے تھے اس مقدمے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے انکی نظم ''ایک نظم'' کا ذکر کیا ہے جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ لوگوں سے گھل مل کر رہنا چاہتے تھے نظم کا پہلا بند یہ ہے۔

اے پیارے لوگو　　تم دور کیوں ہو؟
کچھ پاس آؤ　　آؤ کہ پل میں
یہ سب ستارے　　تاریکیوں کے
اس پار ہونگے

وہ اپنی نظم کے ذریعہ لوگوں کو اپنے قریب بلانا چاہتے ہیں۔ شاید اپنی زندگی کی تنہائی اور تصوراتی زندگی سے پریشان ہوگئے تھے وہ اپنی سوچ بدلنا چاہتے تھے لیکن زندگی بے وفا ہوگئی۔

میرا جی کا شمار عام انسانوں میں نہیں ہوتا تھا۔ انکے بارے میں کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا وہ کب کس روپ میں سامنے آئینگے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا ایک طرف انکے گلے میں مالائیں پڑی ہیں اور بال لمبے ہیں۔ دوسری طرف وہ قران شریف سنتے نظر آتے ہیں۔ جگہ جگہ اوم لکھتے ہیں۔ اور اپنے دستخط کرتے ہیں۔ انکے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ شراب بہت زیادہ پیتے تھے جب انکی تنخواہ ملتی تھی تو وہ شراب نوشی اور قرض خواہوں کی نذر ہو جاتی۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ گھر آنے سے پہلے شراب پیتے اور باقی پیسے راستے ہی میں بکھیر آتے تھے۔ کیونکہ انھیں آنے والے کل کی کوئی فکر نہیں تھی۔ انکی زندگی میں ماضی اور حال کی اہمیت تھی مستقبل کو وہ بے معنی سمجھتے تھے اس بات کو وہ خود اپنے مضمون ''اپنی نظموں کے بارے میں'' لکھتے ہیں

> ''مستقبل سے میرا بے نام سا تعلق ہے میں صرف دو زمانوں کا انسان ہوں ماضی اور حال یہی دو دائرے مجھے ہر وقت گھیرے رہتے ہیں اور میری عملی زندگی بھی انھیں کی پابند ہے مگر اکثر انسان ماضی حال اور مستقبل تینوں زمانوں کے تھپیڑوں پر بہتے ہیں پھر اکثریت کے لئے اگر میری باتیں اجنبیت لئے ہوئے ہوں تو اس میں تعجب ہی کیا ہے میں اگر چاہوں کہ نظمیں لکھنے کے بجائے آسانی اور آسائش کی زندگی بسر کروں گھر بار بسالوں، بیوی مہیا کرلوں بچے پیدا کروں تو مجھے وقت کے دو گھیروں سے نکلنا پڑے گا''[۱]

جمیل جالبی نے ''میرا جی ایک مطالعہ'' میں جن مضامین کا انتخاب کیا ہے، وہ قابل قدر ہیں۔ ان کے ذریعے میرا جی پر چڑھی ہوئی اسراریت کی تہیں ہٹتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور ان تہوں میں جھانکنے سے میرا جی کی شخصیت کے کچھ پہلو سامنے آتے ہیں لیکن ایک اہم مضمون ''ردّی کے بھاؤ'' جو اخلاق صاحب کا تحریر کردہ ہے ڈاکٹر جمیل جالبی نے کسی وجہ سے اس کتاب میں شامل نہیں کیا ہے جبکہ یہ مضمون انکو سمجھنے کے لئے بہت اہم ہے اس میں میرا جی کی زندگی میں ہوئے بڑے حادثے درج ہیں جن پر میرا جی ساری زندگی آنسو بہاتے رہے۔ انکے بھائی نے انکا بہت سا غیر مطبوعہ کلام ردّی کے بھاؤ بیچ دیا تھا جس کو یاد کر کے میرا جی اکثر روتے تھے جبکہ یہ ظلم وہ خود اپنے ساتھ کئی بار کر چکے تھے۔ اخلاق احمد نے اپنے مضمون میں لکھا ہے۔

> ''میرا جی کا وہ غیر مطبوعہ کلام جو میرے پاس سے دلّی میں غدر ۴۷ء کی بھینٹ چڑھا اور جس کا کفارہ میں تا زیست ادا نہیں کرسکتا''[۲]

---

۱ میرا جی ایک مطالعہ ڈاکٹر جمیل جالبی ص ۴۷۵ ۔ ۴۷۶

۲ اخلاق احمد مضمون ردی کے بھاؤ مشمولہ نقوش ص ۹۱

اخلاق احمد کی نظر میں یہ کلام زیادہ قیمتی تھا اس کلام سے جو انکے بھائی نے بیچا تھا میرا جی کے ساتھ یہ ظلم کئی بار ہوا۔

انکے عشق کے بارے میں بھی طرح طرح کے قصے مشہور ہیں لوگوں نے جس طرح انھیں سمجھا اسی طرح سے انکے قصے بیان کئے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ دور سے ہی عشق کرنے میں یقین رکھتے تھے انکا عشق تصوّر تک ہی محدود تھا کئی عورتیں انکی زندگی میں آئیں مگر میرا سین انکے دل و دماغ پر مستقل حاوی رہی یہ انکالا فانی عشق تھا کہ انھوں نے اپنا نام بھی محبوب کے نام پر رکھ لیا۔ میرا جی کی نظموں میں مکمل عورت کی تصویر نہیں ہے بلکہ ایک دھندلی سی شبیہ نظر آتی ہے۔ وہ اپنے محبوب کو نظر اٹھا کر دیکھنا بھی نہیں چاہتے اور نہ ہی ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ اعجاز احمد نے اپنے مضمون ''میرا جی۔ ذات کا افسانہ'' میں لکھا ہے۔

> ''میرا جی کے ہاں تو شرکت کی قدر ہے ہی نہیں جنسی رویّے میں بھی اسی قدر جتنی ذہن اور جذبے کے رویّہ میں وہ نظم کا عنوان ہی دکھتا ہے ''ایک تھی عورت'' جیسے بچّوں کی کہانیاں شروع ہوتی ہیں جیسے ایک تھا بادشاہ''[۱]

انکی نظموں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عورت کو کبھی ماں کے روپ میں اور کبھی بچی کے روپ میں دیکھتے ہیں میرا جی نے اردو شاعری کی روایت میں عورت کے تصوّر کو شامل کر دیا جن پہلوؤں کو اردو شاعری غیر معیاری سمجھتی تھی ان کو میرا جی نے اپنایا اور اپنی شاعری کے ذریعے سے انھیں عام کیا اس کے لئے انھوں نے ہندی اور فرانس کی شاعری کی روایتوں کا سہارا لیا میرا جی کی شاعری پر مختلف اعتراضات اٹھائے گئے۔ کسی نقاد نے انکی شاعری کو ابہام سے بھری ہوئی بتایا۔ کسی نے میرا جی کو مریضانہ داخلیت کا شکار بتایا۔ کوئی کہتا ہے کہ انکی شاعری میں جنس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

میرا جی کی شاعری کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ انکے گھریلو حالات اور انکی ذاتی زندگی سے واقفیت حاصل کی جائے کیونکہ کسی بھی انسان پر اسکی اپنی نجی زندگی کا بہت اثر پڑتا ہے۔ انکی شاعری کے ابہام کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی کیفیات پر اپنی گرفت مضبوط کرنا چاہتے ہیں جو انسان کے لاشعور میں سو رہی ہیں وہ کیفیات جو صرف تصوّر میں ہیں جن کی کوئی شکل نہیں ہے۔ ان کو لفظوں میں ڈھالنا بہت مشکل کام ہے اس وقت ابہام کی ضرورت پیش آتی میرا جی کا نظریہ یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ شاعر جو کچھ لکھے وہ سب کی سمجھ میں آئے اس کے اپنے تصورات ہیں وہ اس کو جس طرح چاہے بیان کر سکتا ہے میرا جی ڈی •

---

[۱] میرا جی ایک مطالعہ مؤلف ڈاکٹر جمیل جالبی ص ۲۰۵

ایچ • لارنس کے اس خیال سے متفق ہیں کہ میں ادب اپنے لئے لکھتا ہوں جب میرا جی چاہتا ہے میں لکھتا ہوں جب جی نہیں چاہتا نہیں لکھتا وہ اپنے مضمون ''اپنی نظموں کے بارے میں'' میں لکھتے ہیں

> ''اکثریت کی نظمیں الگ ہیں میری نظمیں الگ ہیں اور چونکہ زندگی کا اصول ہے کہ دنیا کی ہر بات ہر شخص کے لئے نہیں ہوتی اس لئے یوں سمجھئے کہ میری نظمیں صرف ان ہی لوگوں کے لئے ہیں جو انھیں سمجھنے کے اہل ہوں یا سمجھنا چاہتے ہوں۔'' ۱

میرا جی سے نقادوں کو یہی شکایت رہی کہ انکی شاعری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس میں کوئی معنی و مقصد نظر نہیں آتا۔ اسکی وجہ یہ بھی رہی کہ ان پر تنقید تو کی گئی لیکن ان کو سمجھنے کی کسی نے کوشش نہیں کی اس سلسلے میں محترمہ شہناز کوثر کے خیال سے اتفاق کیا جا سکتا ہے انھوں نے قومی زبان میں ایک مضمون ''فرانسیسی شعرا کا اثر میرا جی اور ن۔م۔راشد پر'' کے نام سے لکھا ہے۔

> بقول انکے ''اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہر دور کی شاعری کو سمجھنے اور اس پر تنقید کرنے کے اصول اسی دور کی شاعری سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر میر تقی میر کے عہد کے تنقیدی نظام کو ہم آج کی جدید شاعری پر استعمال کرنا چاہیں تو ہمیں ناکامی ہوگی'' ۲

یہ حقیقت ہے کہ اگر کسی شاعر کو سمجھنا ہے تو اسی شاعر کے زمانے کی شاعری کے اصولوں کو سمجھنا ہوگا اور یہ بھی جاننا ہوگا کہ اس زمانے کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کیسے تھے۔ کیونکہ شاعر کے ذہن پر اسکے زمانے کا بہت اثر ہوتا ہے وہ جو لکھتا ہے اپنے قرب و جوار سے محسوس کر کے لکھتا ہے میرا جی بھی جب لکھ رہے تھے اس وقت کئی تحریکیں سر اٹھا رہی تھیں ترقی پسند تحریک، جدیدیت کی تحریک اور مغربی تعلیم و تہذیب کا بھی اثر تھا۔

---

۱ میرا جی ایک مطالعہ ڈاکٹر جمیل جالبی ص ۴۷۶

۲ شہناز کوثر مضمون فرانسیسی شعرا کا اثر میرا جی اور ن۔م راشد پر، مشمولہ ماہنامہ قومی زبان کراچی ۲۰۰۰ء جلد ۷۲ شمارہ ۱۲ ص ۳۹

باب سوم

(تنقیدی کارنامے)

پاکستانی کلچر

ڈاکٹر جمیل جالبی وہ پہلے شخص ہیں۔ جنھوں نے پاکستانی کلچر کے موضوع پر نہایت سنجیدگی کے ساتھ اور جامعیت سے بھرپور بحث کی ہے۔ ورنہ ان سے پہلے کچھ ادیبوں نے اس پر ہلکے پھلکے مضامین لکھے ہیں۔ پاکستان ایک نیا ملک بن کر ابھرا تھا۔ اس کو اپنی پہچان کے لئے ایک کلچر کی بے حد ضرورت تھی۔

بقول احمد ہمدانی ''کلچر کے بارے میں غور و فکر کے سلسلے میں ہمارے یہاں سر سیّد احمد خان کو بلا شبہ اولیت کی فضیلت حاصل ہے۔ لیکن ان کے بعد جن دوسرے دانشوروں نے اس موضوع پر مزید غور و فکر کیا ان میں جمیل جالبی نہایت ممتاز و منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔'' [۱]

''پاکستانی کلچر'' ۱۹۶۴ء میں لکھی گئی۔ پاکستان میں کلچر پر جو بحث شروع ہوئی وہ اس کتاب کے سامنے آنے کے بعد ہوئی۔ کیونکہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''پاکستانی کلچر'' میں ملک میں ہونے والی نا انصافیوں کو اور غریب طبقے کے مسائل کو سامنے رکھا ہے۔ وہ مختلف علاقے کے لوگوں کو ایک قوم کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ آج بھی پاکستان میں جاگیردارانہ نظام ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بہت بے چین ہیں۔ انکا خیال ہے۔

''یہ کتاب لکھ کر میں نے اپنے اس کرب کا اظہار کیا ہے جو گزشتہ پانچ، چھ سال سے مجھے بے چین کئے ہوئے تھا۔ اگر اس کرب کو آپ تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا ہوں تو ممکن ہے اس کتاب کو پڑھ کر آپ بھی میری طرح بے چین ہو جائیں۔ اس کتاب کو لکھنے سے پہلے اور پھر لکھتے وقت میں نے بہت دُکھ اُٹھائے ہیں۔ ایک تو موضوع ایسا کہ نہ اس کی کوئی روایت میرے سامنے تھی۔ اس اعتبار سے اس موضوع پر اردو میں یہ پہلی مستقل کتاب ہے۔'' [۲]

ان کے اس خیال سے یونس احمد بھی متفق ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

---

[۱] ارمغان سہ ماہی کراچی، جمیل جالبی نمبر شمارہ ۳ (اپریل مئی جون ۹۶ء) ص ۱۲۳

[۲] پاکستانی کلچر ڈاکٹر جمیل جالبی مشتاق بک ڈپو کراچی ۱۹۶۴ء ص ۹

''پاکستانی کلچر' شاید ان کی پہلی بھر پور تصنیف ہے جس میں ان کے انقلابی نظریات ومیلانات انتہائی حقیقت پسندانہ انداز میں سامنے آتے ہیں۔ اس تصنیف میں نہ صرف پاکستانی کلچر کے بارے میں دوٹوک آراء سامنے آتی ہیں۔ بلکہ انھوں نے ہماری دانش اور عقل وخرد کو آزمانے کے لئے بہت سے سوالات بھی اٹھائے ہیں۔'' [۱]

''پاکستانی کلچر'' میں سب سے پہلے مقدمہ ہے۔ اس کے بعد نو مضامین شامل ہیں۔

(۱) آزادی، تہذیبی مسائل اور تضاد (۲) کلچر کیا ہے؟ (۳) قومی یک جہتی کے مسائل
(۴) مذہب اور کلچر ۱ (۵) مذہب اور کلچر ۲ (۶) مادی ترقی اور کلچر کا ارتقاء
(۷) مشترک کلچر، مشترک زبان (۸) ذہنی آزادی اور تہذیبی عوامل (۹) نئے شعور کا مسئلہ

۱۹۸۴ء میں ''پاکستانی کلچر'' کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو انگریزی میں ترجمہ اس لئے کیا گیا ہوگا کہ جو لوگ اردو زبان سے واقف نہیں ہیں وہ بھی کلچر کے مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے پہلے مضمون ''آزادی، تہذیبی مسائل اور تضاد'' میں لکھا ہے۔

''آزادی کے بعد ہم سب نے محسوس کیا کہ ہمارے پاس کوئی تہذیبی سرمایہ ایسا نہیں ہے۔ جس سے ہم اس چیلینج کو قبول کر سکیں جو آزادی اپنے ساتھ لائی ہے۔ آزادی سے پہلے ہمارے سارے جذبات 'اجتماعی' تھے۔ آزادی کے بعد 'اجتماعی' جذبات کا رنگ اڑنے لگا۔ اور معاشرے کی ہر سطح پر یہ احساس شدت کے ساتھ ابھرنے لگا کہ آخر وہ کون سے عناصر ہیں جن کے ذریعہ ہم یک جہتی اور حقیقی اتحاد حاصل کر کے ایک قوم بن سکتے ہیں۔ ۴۷ء تہذیبی اعتبار سے ایک ایسے واضح خط کی حیثیت رکھتا ہے جہاں سے ہمیں اپنے مسائل و افکار پر پھر سے سوچنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔'' [۲]

دوسرا مضمون ''کلچر کیا ہے'' کے نام سے ہے۔ اس میں ڈاکٹر جمیل جالبی کلچر کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اب کلچر کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ کلچر اس کل کا نام ہے جس میں

---

[۱] ارمغان سہ ماہی کراچی، جمیل جالبی نمبر شمارہ ۳ (اپریل مئی جون ۹۶ء) ص ۸۳

[۲] پاکستانی کلچر ڈاکٹر جمیل جالبی مشتاق بک ڈپو کراچی ۱۹۶۴ء ص ۱۷-۱۸

مذہب وعقائد علوم اور اخلاقیات، معاملات اور معاشرت، فنون و ہنر، رسم و راج، افعال ارادی اور قانون، صرف اوقات اور وہ ساری عادتیں شامل ہیں۔ جن کا انسان معاشرے کے ایک رکن کی حیثیت سے اکتساب کرتا ہے۔ جن کے برتنے سے معاشرے کے متضاد ومختلف افراد طبقوں میں اشتراک ومماثلت، وحدت اور یک جہتی پیدا ہو جاتی ہے۔'' [۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے کلچر کی جو تعریف پیش کی ہے اس سلسلے میں جو دوسرے ادیبوں نے اپنی رائے دی ہے ان میں ایک نام شان الحق حقی کا بھی ہے۔ وہ اپنے مضمون ''پاکستانی کلچر ایک زاویہ'' میں لکھتے ہیں۔

''جالبی صاحب نے کلچر کا لفظ بڑے مخلوط معنی میں استعمال کیا ہے اور یہ خلط مبحث کسی حد تک اس تبصرے میں بھی در آیا ہے۔ لیکن کلچر کا اصل تعلق ان اعلیٰ تریں تخلیقات سے ہے۔ جو کوئی معاشرہ دنیا کو دے سکے۔ اور جنہیں دنیا اپنا سکے۔ معاشرے کی وہ روایات جنہیں جالبی صاحب نے تہذیب کا جغرافیہ کہا ہے، تہذیب کی زیریں سطح سے تعلق رکھتی ہیں۔ انھیں کلچر کہے یا تمدن یا تہذیب، یا معاشرت۔ یہ اپنی حفاظت خود کر سکتی ہیں۔'' [۲]

شان الحق حقی کی اس بات سے اتفاق کیا جا سکتا ہے مگر کسی بھی قوم کا کلچر اُس وقت تک محفوظ نہیں رہ سکتا جب تک کہ قوم اس کی خود حفاظت نہ کرے۔

اگلا مضمون ''قومی یک جہتی کے مسائل'' ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے۔

''قومی کلچر کے بغیر نہ ہم قوم کہلائے جانے کے مستحق ہیں اور نہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں تخلیقی قوتوں کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اب یہاں ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے پاکستانی کوئی قوم نہیں تھی ہمیں اسے ایک قوم بنانا تھا۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے پاکستان کوئی ملک نہیں تھا۔ ہمیں اسے ایک ملک بنانا تھا۔ ہمارا مسئلہ صرف یہ ہے کہ قومی سطح پر پاکستانی کلچر ابھی بے نام ہے ہمیں اسے نام دینا ہے۔'' [۳]

---

۱ ، ۳ پاکستانی کلچر، ڈاکٹر جمیل جالبی، مشتاق بک ڈپو کراچی ۱۹۶۴ء ص ۳۹ ، ۱۷

۲ شان الحق حقی مضمون پاکستانی کلچر ایک زاویہ، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ موئف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۹۳ء ص ۳۸۶

یونس احمد ڈاکٹر جمیل جالبی کے خیال سے متفق ہیں۔انکا خیال ہے۔

''قومی یک جہتی کے سوال نے ہمارے ذہنوں کو ہمیشہ سوچنے پر مجبور کیا ہے۔مشرقی پاکستان کے جدا ہونے سے پہلے قومی یک جہتی کا ایک الگ محکمہ کام کرتا رہا تھا۔ہم نے آپس میں شیر وشکر ہونے کی مسلسل کوششیں کیں۔لیکن صد افسوس کہ ہماری کوشش رائیگاں گئیں۔اس کی سب سے بڑی وجہ ہماری کوششوں میں خلوص ومحبت کا فقدان تھا۔آج بھی ہماری قومی یک جہتی کو سنگین خطرات نے گھیرا ہوا ہے۔''[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی ''مذہب اور کلچر ا'' میں لکھتے ہیں۔

''آج جو ہم اس مسئلے پر غور کر رہے ہیں کہ اسلام کی رسی مضبوطی سے پکڑے ہوئے کیسے ترقی کر سکتے ہیں۔تو اس کے معنی یہی ہیں کہ ہمارے اندر کچھ ایسی بنیادی تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور ہو رہی ہیں جو ہم سے چند بنیادی فیصلوں کی طالب ہیں اور یہ بنیادی فیصلے دراصل سطحی حیثیت نہیں رکھتے۔جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم وہ نہیں جو ہمارے کلچر نے ہمیں بنایا ہے۔تو اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ ہم اس کلچر کے تصور حقیقت یا نظام خیال کی شکل پر پیدا ہوئے ہیں۔اگر ہمیں خود کو بدلنے کی ضرورت ہے۔اور تشکیل کے معنی ہی یہ ہیں۔کہ کسی کلچر کے تصور حقیقت کی قلب ماہیت کی جائے تا کہ اس کی شکل پر انسان پیدا کئے جا سکیں تو اس کے معنی بھی یہ ہونگے کہ ہمیں اپنے نظام خیال پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔[۲]

''مذہب اور کلچر ۲'' میں انھوں نے لکھا ہے۔

''اس بات کے اعادہ کی شاید ضرورت نہیں ہے۔کہ ظاہری نعمتوں سے پورے طور پر بہرہ ور ہونا مسلمان کی حیثیت سے ہمارا مذہبی فریضہ ہے۔ظاہری نعمتوں میں زمین کے اندر جو کچھ ہے اسے انسانوں کے فائدہ کے لئے باہر نکالیں۔ایسے علوم اور ایسے آلات کو ترقی دیں جو ان دفینوں کو باہر لانے میں مدد کر سکیں۔آسمانوں میں جو کچھ ہے اسے اپنے تصرف میں لانے کی جدوجہد کریں اس لئے کہ

---

۱ ارمغان سہ ماہی کراچی، جمیل جالبی نمبر شمارہ ۳ (اپریل مئی جون ۹۶ء) ص ۸۵۔۸۶

۲ پاکستانی کلچر، ڈاکٹر جمیل جالبی ،مشتاق بک ڈپو کراچی ۱۹۶۴ء ص ۱۳۳

یہ حکم خداوندی ہے۔ گزشتہ سو سال کی تحریکوں سے اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ہم زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے، مادی ترقی کرنے اور عقلی علوم حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اگر اس خواہش کو شعور کی سطح پر اپنے نظامِ خیال میں داخل کر لیں تو ہم اپنے مقدر سے بلند اٹھنے کی صلاحیت کا اظہار کر سکتے ہیں۔'' [۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی ''مادی ترقی اور کلچر کا ارتقا'' میں لکھتے ہیں۔

''کلچر کی ترقی کے لئے یہ چیز بنیادی حیثیت رکھتی ہے کہ پہلے انسانی معاشرے کو حیوانی سطح سے بلند کیا جائے۔ حیوانی سطح سے بلند کرنے کے لئے توانائی کو مسخر کر کے آلات کے ذریعے تصرف میں لانے اور پھیلانے کی ضرورت ہے اس کے بغیر ایک قدم کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔'' [۲]

''مشترک کلچر، مشترک زبان'' میں لکھا ہے کہ ''زبان کلچر کی ایک اہم ترین علامت ہے جیسا کلچر ہوگا ویسی ہی زبان ہوگی۔ جیسی زبان ہوگی ویسا ہی کلچر ہوگا۔ زندہ زبان معاشرتی تقاضوں سے وجود میں آتی ہے۔ اور خیال و احساس کے ایک ایسے نظام کو جنم دیتی ہے۔ جس کے ذریعے زبان کا تعلق معاشرے کے مختلف طبقوں سے یکساں ہو جاتا ہے۔'' [۳]

اصغر بٹ نے بھی پاکستان کے کلچر کو بہتر بنانے کے لئے اپنی رائے پیش کی ہے۔ ان کا خیال ہے

''مذہب کے بعد تہذیبی ورثے میں بے حد اہم مقام 'زبان' کا ہے۔ اس میں مضبوطی ایک زبان کے ہونے سے پیدا کی جا سکتی ہے اور کمزوری ایک سے زیادہ زبانیں رائج کرنے سے زبانوں کے سلسلے میں، پاکستان کی صورتِ حال زیادہ امید افزا نہیں ہے اور پھر رہ کیا گیا! مادی ترقی اس کے لیے دوڑ دھوپ تو بہت ہو رہی ہے اور اس کے ذریعے بقول جالبی کے ایک طرح کی توانائی بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔'' [۴]

مضمون ''ذہنی آزادی اور تہذیبی عوامل'' میں ڈاکٹر جالبی کا کہنا ہے۔

''ذہنی آزادی کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ فرد کے اندر خوف کو اس طور پر جڑ

۱، ۲، ۳۔ پاکستانی کلچر، ڈاکٹر جمیل جالبی، مشتاق بک ڈپو کراچی ۱۹۶۴ء ص ۱۸۸۔۱۸۹ / ۱۹۳ / ۲۱۳۔ ۲۱۴

۴۔ اصغر بٹ مضمون پاکستانی کلچر کے مسائل مشمولہ، ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ء ص ۳۹۳

پکڑنے نہ دے کہ وہ زندگی کی ہر سطح پر صرف سمجھوتہ کرنے پر قانع ہو جائے اور اس کی اپنی سچائی اور تجربہ اس کے لیئے کوئی معنی نہ رکھے۔ آزادی اظہار کا احساس ہی فرد کے لئے کافی ہے کہ وہ اپنے فرائض ذمہ داری سے انجام دے سکے۔ آزادی اظہار کا احساس دراصل حقوق کے تحفظ کا احساس ہے۔'' [۱]

آخری مضمون ''نئے شعور کا مسئلہ'' ہے۔ اس میں ڈاکٹر جالبی نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

''میں نے خیال اور مسائل کے اس جنگل میں تنہا سیر کی ہے اور اس سیر کے وہ اثرات جو میری روح پر مرتب ہوئے ہیں اور وہ روح جو میں نے اس جنگل میں دیکھی ہے آپ کے سامنے پیش کردی ہے۔ اگر اس روح کے مطالعے سے آپ کے اندر قومی سطح پر فکری مسائل کے اس جنگل کا شعور پیدا ہو گیا اور آپ سوچنے کی طرف مائل ہو گئے تو ہم دیکھیں گے کہ سارا جنگل انگڑائی لے کر بیدار ہو جائے گا۔'' [۲]

شان الحق حقی کا خیال ہے ''جالبی صاحب نے کلچر کی تعریف سے لے کر مذہب اور کلچر کے تعلق اور پاکستان کے مخصوص قومی مسائل سے کھل کر بحث کی ہے۔ مشترک معاشرے اور مشترک زبان کے مسئلے کو بھی چھیڑا ہے۔ مادی ترقی اور کلچر کے تعلق کو بھی واضح کیا ہے اور کلچر کی تعمیر کے لیئے آزادی فکر کی اہمیت کو بھی جتایا ہے۔'' [۳]

حقی صاحب کے اس خیال میں ہمیں ''پاکستانی کلچر'' کا پورا نچوڑ سامنے آجاتا ہے۔

---

[۱]، [۲] پاکستانی کلچر، ڈاکٹر جمیل جالبی، مشتاق بک ڈپو کراچی ۱۹۶۴ء ص ۲۲۴ / ۲۴۴

[۳] شان الحق، مضمون پاکستانی کلچر ایک زاویہ، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۶۔۱۹۹۳ء ص ۳۸۲

تنقید اور تجربہ

ڈاکٹر جمیل جالبی ایک نقاد کی حیثیت سے بھی ہمارے سامنے آئے ہیں۔تنقید پر انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔انکی کتاب ''تنقید اور تجربہ'' تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔اس میں ربط و تسلسل کے ساتھ مضامین پیش کئے گئے ہیں۔''تنقید اور تجربہ'' کے مضامیں کئی حصّوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ایک حصّہ ان مضامین پر مشتمل ہے۔جس میں ادبی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔دوسرے حصّے میں عملی تنقید ہے۔تیسرے حصّے میں ایسے مضامین ہیں جن میں مغربی ادیبوں کے بارے میں مختصر تعارف ہے۔

پہلا مضمون ''ادب یا مابعد الا ادب'' ہے۔اس میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ ادب مر رہا ہے۔ وہ بے جان ہوتا جا رہا ہے۔اسکی وجہ آج کے دور کی تخلیقی سرگرمیاں ہیں۔جس میں جان پھونکنے کی ضرورت ہے۔تہذیبی اداروں کو ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔اصل میں زندگی کے تقاضے بدل رہے ہیں۔اسکے ساتھ تہذیب بھی بدل رہی ہے کیونکہ مغربی تہذیب ہمیں اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔دوسرا مضمون ''نیا ادب اور تہذیبی اکائی'' ہے اس میں ادیبوں کی سنجیدگی پر لکھتے ہیں جو بڑی حد تک ختم ہوگئی ہے اور ادیب اپنی شہرت کے لئے عجیب وغریب صورت میں سامنے آرہے ہیں انھیں ادب کی معیار کی پروانہیں ہے صرف اپنی شہرت چاہتے ہیں۔عوام کی توجہ چاہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ سنجیدہ ادیب ادب کی موت کا اعلان کر رہے ہیں۔ادب کا زوال معاشرہ کے زوال کے ساتھ ہوتا ہے ڈاکٹر جمیل جالبی کے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ مؔیر وسوداؔ کا معاشرہ بھی زوال پذیر تھا۔مگر ادب پر تو اس کا اثر نہیں پڑا۔وہ لکھتے ہیں۔

> ''مؔیر وسوداؔ کے دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف فتنے چاروں طرف سر اٹھا رہے ہیں
> لیکن انکا اثر کلچر کی بنیادوں اور تہذیبی اداروں کو شدت کے ساتھ متاثر نہیں کر رہا ہے۔''[۱]

ڈاکٹر جالبی کا خیال ہے کہ اس طرح کے حالات پر افسوس کرنے کے بجائے ہمیں ان مسائل پر غور کرنا چاہئے اور انکا نئے سرے سے جائزہ لینا چاہئے۔ان مسٔلوں کا حل نکالنے کی کوشش کرنی چاہئے۔اگلے مضمون ''ادیب اور سیاست'' میں وہ لکھتے ہیں۔کہ ایک ادیب کو سیاست میں کس حد تک شامل ہونا چاہئے۔ انکے نزدیک ادیب کو سیاست میں نہ تو پوری طرح شامل ہونا چاہئے اور نہ بالکل کنارہ کشی کرنی چاہئے۔بلکہ ادیب کو چاہئے کہ وہ قومی اور عالمی مسائل پر نظر رکھے۔اپنے احساسات وجذبات کو ذریعہ بنا کر ہر بار ایک نئی

۱؎ تنقید اور تجربہ،ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی۔۱۹۸۹ء ص ۳۹

قوت نیا لہجہ الفاظ، استعارے اور امیجیز حاصل کرتا ہے، کسی جماعت کا با قاعدہ رکن نہ بنے۔

اپنے نقطہ نظر کو ثابت کرنے کہ لئے اپنے فن کا استعمال کرے۔ مضمون ''ادیب کی سماجی ذمہ داری'' میں ڈاکٹر جالبی نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اپنی جگہ صحیح ہے۔ ادیب کا کام صداقت تلاش کرنا ہے۔ جو محسوس کرے اس کو دنیا کے سامنے ظاہر کرے۔ سماج میں جو اچھائی برائی ہے اس کو اپنے فن کے ذریعے سب کے سامنے لائے اور اپنے فن کا وفادار رہے، ''ادیب اور حب الوطنی'' میں وہ لکھتے ہیں کہ ہر ادیب اپنے ملک سے محبت کرتا ہے۔ اس کے مزاج میں تو ہمیشہ اس کا ملک اس کے لوگ اور ان کی اتھاہ محبت کا جزبہ غیر شعوری طور پر موجود رہتا ہے۔ وہ جس معاشرے میں رہتا ہے وہیں سے اپنی تخلیق کی بنیاد رکھتا ہے۔ وہ اس درخت کی جڑوں کو کھوکھلا نہیں کر سکتا جس پر اس کا آشیانہ ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ادب اور ادیب کے بعد مضمون لکھا ہے ''شعور کی عینک'' اس میں انھوں نے آدم اور ابلیس کا قصہ بیان کیا ہے کہ کس طرح خدا نے آدم کو بنایا اور ابلیس نے کس طرح ورغلایا اس کا یہ اثر ہوا کہ جن باتوں سے آدم بے خبر تھے اسکا شعور انکے اندر بیدار ہو گیا۔ حالانکہ اس کا انکو بڑا نقصان اٹھانا پڑا جنت سے نکالے گئے۔

ڈاکٹر جالبی نے مضمون ''نذیر احمد اور ہمارے تہذیبی رشتے'' میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے نذیر احمد نے اپنی قوم کی بہتری کے لئے کیا کیا۔ اپنی تخلیق کے ذریعہ مسلمانوں کو انگریزی تہذیب سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ ہمیں اپنے کلچر اور اپنی تہذیب کو بھولنا نہیں چاہئے۔ ڈاکٹر جالبی سر سید کی انگریزی تعلیم سے جو رغبت ہے اس سے مطمئن نہیں ہیں۔ اپنے مضمون میں انھوں نے سر سید کے مقابلے میں اکبر الہ آبادی اور نذیر احمد کو زیادہ بہتر بتایا ہے جب کی میری نظر میں سر سید نے انگریزی تعلیم کو اس وجہ سے اہمیت دی تھی کہ وہ مسلمانوں کو ترقی کی راہ پر لے جانا چاہتے تھے۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے مذہب یا اپنے کلچر سے دور ہو جائیں بلکہ انگریزی جاننا اس لئے ضروری سمجھتے تھے کہ زندگی میں آگے بڑھنے کے لئے ہر چیز کی معلومات ضروری ہے۔ جس طرح انگریزوں نے ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے انگریزوں ہندی اردو فارسی سب زبانوں سے واقفیت کرائی تھی۔ اسی لئے فورٹ ولیم کالج کا قیام ہوا۔

اگلا مضمون ہے ''اردو ادب کا ایک سال'' یہ کافی طویل مضمون ہے۔ اس میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے خیالات کو میر تقی میر کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ میؔر کے خیال میں آج کے ادیب سچ نہیں بولتے اور

مصلحت سے کام لیتے ہیں۔ ان آزاد بندوں کو کیا ہوگیا۔ اب یہ خود سے بھی سچ نہیں بولتے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے۔

''یہ احساس ہم سب کو ہے کہ معاشرہ اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے۔ ادیب کے پاس بھی احساس کی کوئی نئی لیک، طرز فکر کا کوئی نیا انداز ایسا نہیں ہے۔ جس پر اچھے اور سچے ادب کی بنیاد رکھی جا سکے۔ اسی لئے اس دور میں یہی غنیمت ہے کہ ادیبوں کے اندر ایک اضطراب، ایک بے چینی، کچھ کرنے کی خواہش نظر آتی ہے۔'' [۱]

مضمون ''ترجمے کے مسائل'' میں وہ لکھتے ہیں۔ عام طور پر اچھے ترجمے کی پہچان یہ سمجھی جاتی ہے کہ اس میں روانی ہو زبان سلیس ہو اور مضمون میں وضاحت ہو۔ جبکہ ایسا نہیں ہے انھوں نے تین طرح کے ترجمے بتائے ہیں۔ ایک تو اصل متن کا صرف لفظی ترجمہ کر دیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مفہوم لے کر آزادی کے ساتھ اپنی زبان کے انداز بیان کی مدد سے ترجمہ کر دیا جائے اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ترجمہ اس طور پر کیا جائے کہ اس میں مصنف کے لہجے کی کھنک اور آہنگ باقی رہے۔ اپنی زبان کا انداز بھی قائم رہے اور اصل متن کے مطابق بھی ہو۔ یہ طریقہ سب سے مشکل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جالبی کے خیال میں اچھا ترجمہ وہ ہے جس میں مترجم اپنی شخصیت اور مزاج کو کھو کر دوسرے کی شخصیت اور مزاج میں انھیں تلاش کرلے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''ایک نسل کا المیہ'' میں اس زمانے کا ذکر کیا ہے۔ جب ہندوستان کو انگریز چھوڑ کر جا رہے تھے اس وقت بٹوارے کے حالات پیدا کئے گئے تھے۔ عام انسان پریشان تھا۔ ساتھ ساتھ ادیب بھی پریشان تھے۔ ادیب کے لئے موضوع تلاش کرنا مشکل ہوگیا تھا۔ فسادات موضوع بن گئے تھے۔ اس لئے ادیب اور شاعروں نے قدیم ادب کی طرف لوٹنا پسند کیا۔ غزل دوبارہ سے مقبول ہوئی اور قصہ کہانی اور داستانیں لکھی جانے لگیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''شیفتہ کا مطالعہ'' مضمون میں شیفتہ کی شاعری پر کافی تفصیلی بحث کی ہے۔ درمیان میں انکے اشعار بھی شامل کئے ہیں۔ ڈاکٹر جالبی کے خیال میں شیفتہ کا جو منفرد انداز ہے۔ وہ یہ کہ انھوں نے اردو شاعری میں ان تمام آوازوں کو اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی ہے جو انیسویں صدی کی شاعری میں مقبول سمجھی جاتی تھیں۔ ڈاکٹر جالبی لکھتے ہیں۔

''شیفتہ نے ان تمام اساتذہ کے رنگوں کو مقبول ترین بنانے اور ان کے انداز کی

---

[۱] تنقید اور تجربہ، ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی۔ ۱۹۸۹ء ص ۹۹

تقلید کو عام کرنے کی خدمت انجام دی۔ اس سے شیفتہ کی ذات تو ضرور متاثر ہوئی لیکن اردو شاعری کو نکھرنے، ابھرنے، پھیلنے، بڑھنے پھلنے اور مقبول ہونے میں بڑی مدد ملی شیفتہ کی اس خدمت کو اردو غزل کی تاریخ مشکل ہی سے فراموش کر سکتی ہے۔"[۱]

شیفتہ کی شاعری میں جو کمی ہے وہ انکے جذبے کا پھیکا پن ہے۔ انکے اشعار معنی کے اعتبار سے بہت اچھوتے ہیں۔ بیان میں شگفتگی ہے۔ انداز سبک ہے مگر جذبے میں آنچ نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے وہ غالب مومنؔ اور حالیؔ کے ہم پلہ نہ آسکے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے شیفتہ کے بعد دردؔ کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ اس مضمون کو "آدھا شاعر" نام دیا ہے۔ دردؔ کا زمانہ بڑا پر آشوب تھا۔ ہر طرف انتشار تھا۔ ملک میں خانہ جنگی تھی۔ اس دور کے شعراء اور حکماء پیچیدگیوں میں پھنسے ہوئے تھے اردو شاعری بھی ان حالات سے متاثر ہو رہی تھی۔ شاعر کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک تو ان ہنگاموں سے بچ کر گوشہ عافیت اختیار کرلے یا پھر ان ہنگاموں کا حصّہ بن کر دوسروں کو جلی کٹی سنائے جو سوداؔ نے کیا انھوں نے ہجو نگاری اختیار کی اور درد نے تصوف کا راستہ اختیار کیا۔ انکی زندگی تصوف کی مثالی زندگی تھی۔ انھوں نے اپنے کلام کا انتخاب کیا تو اس میں وہ اشعار خارج کردئے جن میں مجازی رنگ شامل تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بڑی تعداد میں مجازی رنگ کے اشعار پیش کئے ہیں۔ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ کم ہے اور مجاز کا رنگ غالب ہے۔ دردؔ کی شاعری میں یہ چیز اچھی ہے کہ دنیا سے دل لگانے کا درس دیتے ہیں وہ دوسرے صوفیوں کی طرح نہیں ہیں۔ اردو شاعری میں وہ پہلے صوفی شاعر ہیں جن کے یہاں زندگی کے آثار بھرپور طریقے سے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

"اس تمام بحث سے میرا مطلب صرف یہ ہے کہ دردؔ کی شاعری کو اب تک صرف اسی رنگ اور زاویے سے دیکھا اور سمجھا گیا ہے جس روایتی انداز سے وہ ایک صدی سے زیادہ دردؔ کی اپنی نجی زندگی کے زیر اثر دیکھی اور سمجھی جاتی رہی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مدرسوں اور کالجوں کے انتخاب میں جو غزلیں نظر آتی ہیں وہ سب معرفت کے رنگ کی منتخب کی جاتی ہیں۔ اب ضرورت اس مرکی ہے کہ اردو شاعری کو ایک بار پھر جدید نقطے نگاہ، جدید تقاضوں اور محرکات کے پیش نظر دیکھا اور سمجھا جائے تا کہ یہ شاعر نصاب اور مجلسی ضرورتوں سے باہر آکر دنیائے جدید تر حقائق کی روشنی میں بھی پرکھے جاسکیں۔"[۲]

---

۱ ۲ تنقید اور تجربہ، ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی۔ ۱۹۸۹ء ص ۱۲۵ / ۱۵۴

درؔد کے معرفت کے اشعار میں وہ بات نہیں ہے جو دوسرے رنگ میں حرارت نظر آتی ہے۔غرض یہ کہ انھوں نے اردو غزل کو زندگی کا احترام، اس کی اہمیت اور شعور عطا کیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے مضمون بہادر شاہ ظفر میں لکھتے ہیں۔ظفرؔ کی شاعری کو ذوق کی استادی نے ختم کردیا ورنہ وہ بڑے شاعر ہوتے۔ان کی شاعری میں ایسی تپش اور کرب ہے جو ظفر کی ذات سے مخصوص ہو کر ان کا رنگ سخن متعین کرتا ہے۔بہادر شاہ ظفر مغلیہ سلطنت کی گرتی ہوئی دیوار کے آخری ستون تھے۔وہ اپنے حالات کا شکار ہوگئے۔اگر یہ کرب انکی شخصیت میں پوری طرح ضم ہو جاتا تو اردو شاعری کو ایک نیا آہنگ اور نئی آواز سنائی دیتی۔ڈاکٹر جالبی کو ظفر اور مصحفی کی شاعری میں مماثلت نظر آتی ہے۔مزاج کے اعتبار سے دونوں میں بہت قربت ہے۔ظفر کے خلوص نے انکی شاعری میں تنوع پیدا کردیا ہے۔ظفر کے یہاں اردو زبان بول چال کی زبان سے بے حد قریب آگئی ہے۔انھوں نے سنگلاخ زمینوں کو پانی کردیا۔بے معنی ردیفوں کو معنی عطا کئے زبان میں فارسی وعربی بندشوں اور تراکیب کو کم سے کم کیا اور خالص اردو کو رواج دیا۔ ظفرؔ کی خاصیت ہے کہ عام بول چال کی زبان سے قریب لانے کی کوشش کی ہے۔

اگلا مضمون ''فراق کی رباعیاں'' ہے۔ڈاکٹر جالبی کا خیال ہے کہ فراق کی رباعیوں میں نیا انداز نئے تیور اور نئی قدریں ملتی ہیں۔انکے ہاں عشق کا واضح تصور ہے۔ڈاکٹر جالبی نے انکی رباعیوں کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔پہلا دور ۱۹۲۹ء سے شروع ہوا ہے۔اور دوسرا دور ۱۹۴۵ء سے شروع ہوا ہے پہلے دور میں ۶۸ رباعیاں لکھی گئی ہیں ان پر آسی غازی پور اور انیس اور حالی کا اثر نمایاں ہے۔دکھے دلوں کی کہانی سنائی گئی ہے۔عربی وفارسی کا اثر بھی نظر آتا ہے۔

دوسرا دور سولہ برس بعد شروع ہوا ہے۔دونوں ادوار میں بہت زیادہ فرق نظر آتا ہے۔اس دور میں چارسو کے قریب رباعیاں لکھیں ہیں۔ان رباعیوں کے خیالات میں گہرائی اور فکر میں سچائی ہے۔ہندی الفاظ کا استعمال ہے۔خوبصورت تشبیہات ہیں۔فراق کے یہاں جمالیاتی شاعری ہے۔انھوں نے اپنی رباعیوں میں ایک نیا کلچر سمونے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے مضمون ''مجاز کی شاعری'' میں زمانے کے حالات پر کافی تفصیلی بحث کی ہے۔ اس زمانے میں ملک میں کافی انتشار پھیلا ہوا تھا۔آزادی کے بعد ہر طرف ہندو مسلمان خون کی ہولی کھیل رہے تھے۔اس زمانے کا شاعر بے حد پریشان تھا۔مجاز بھی شروع میں انقلابی شاعر بنے۔حالانکہ وہ بنیادی

طور پر رومانی شاعر تھے۔غنائیت انکی شاعری کی ایسی خاصیت ہے۔ جوانکے احساس، انکے لہجے اور اظہار کو اپنے دوسرے ہم عصر شعراء سے ممتاز کر دیتا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے میرا جی کو سمجھنے کے لئے جو مضمون لکھا ہے اس میں ''میرا جی'' کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔کافی تفصیلی مضمون لکھا ہے۔انکے خیال میں

''میرا جی نے یہ حلیہ اس لئے بنایا تھا کہ وہ افسانہ بن کر مشہور ہونا چاہتے تھے۔
یہ ساری غلاظت اپنے اوپر اس لئے ڈال رکھی تھی کہ دنیا کے دل میں رحم و ہمدردی کے
جذبات پیدا کرنے میں کامیاب ہوسکیں۔''[۱]

ڈاکٹر جالبی نے جگہ جگہ مضامین اور نظموں کا حوالہ دے کر میرا جی کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میرا جی نے مختلف شعراء پر لکھا ہے۔اور انکی خصوصیات واضح کیں ہیں وہ خود انکی ذات میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''حاجی بغلول'' کے نام سے جو مضمون لکھا ہے اس میں ناول اور ناول نگاری پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کے ساتھ ساتھ ناول نگاری نے بھی قدم جمالئے۔''حاجی بغلول'' دوسرے ناولوں کی طرح تکنیک اور خارجی ڈھانچے کے اعتبار سے ایک سرگزشت ہے۔منشی سجاد حسین فطرتا مزاح نگار تھے۔انھوں نے یہ کردار خالص مزاح پیدا کرنے کے لئے تخلیق کیا تھا۔ڈاکٹر جالبی کا خیال ہے۔

''حاجی بغلول'' کے رویے میں ہمیں سارے معاشرہ کے خلاف جہاد کا احساس
ہوتا ہے۔ایسا معاشرہ جہاں دوست بے مروت اور بے وفا ہیں۔ جہاں انسان سے
انسان کا رشتہ کمزور ہے۔''[۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''مہدی افادی کا ادبی مقام'' مضمون لکھ کر ان کی ادبی حیثیت پر تفصیلی بحث کی ہے۔مہدی افادی کا ادب دو کتابوں پر مشتمل ہے۔ایک کتاب میں انکے مضامین ہیں اور دوسری میں ان کے خطوط شامل ہیں ڈاکٹر جمیل جالبی نے انکے مضامین کو تین ادوار میں منقسم کیا ہے پہلا دور ۱۷۹۰ء سے ۱۹۰۰ء تک ہے۔اس زمانے میں اسلوب میں پھیکا پن ہے۔دوسرا دور ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۹ء تک ہے اس وقت دماغ میں شعور کی گہرائی ہے۔تیسرا دور ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۹ء تک ہے اسی دور میں انکی نثر میں گہرائی پختگی، شوخی، ذکاوت وذہانت تبصرہ نگاری کے بہترین نمونے ملتے ہیں، مہدی افادی کی نثر کی نمایاں خصوصیت انشا پردازی شوخی وطباعی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے مضمون ''حسن عسکری کے افسانے'' میں حسن عسکری کے علاوہ اور

۱، ۲ تنقید اور تجربہ، ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی۔۱۹۸۹ء ص ۲۰۷ / ۲۴۷

دوسرے افسانہ نگاروں پر بھی بحث کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حسن عسکری کے افسانے نظریاتی، جذباتی عقیدتمندی کا شکار رہے ہیں حسن عسکری بہت سوچ سمجھ کر افسانے لکھتے ہیں ان کے افسانوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ ''وہ ادب کو سستی چیز نہیں سمجھتے'' کردار نگاری حسن عسکری کے افسانوں کی خصوصیت ہے۔ کردار میں بہت تنوع تو نہیں مگر عسکری نے اپنے کرداروں کا مختلف ماحول اور مختلف زاویوں سے تجزیہ کیا ہے۔ انکے اسلوب میں حقیقت نگاری اشاریت اور تخیل سب کچھ ملا جلا نظر آتا ہے۔

اب جو مضمون ہے وہ ''ٹی، ایس، ایلیٹ'' ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ٹی ایس ایلیٹ پر خاصی بحث کی ہے۔ انھوں نے ایلیٹ کی شاعری پر اسکی نثر کو ترجیح دی ہے۔ اس بات کو اپنے مضمون میں جگہ جگہ لکھا ہے۔ انکا خیال ہے۔

> ''ہر زندہ نسل، اپنی تنقید، اپنے معیار اور پیمانے خود بناتی ہے۔ اسی سے توصیف کے پیمانے بنتے ہیں۔ اور اسی سے گمنام ادیب اور ادبی ادوار دوبارہ اہمیت حاصل کرتے ہیں۔''[۱]

آگے لکھتے ہیں۔

> ''اسی لئے پرانے معیاروں پر ہمیشہ نظر ثانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ تا کہ نئے معیار، جو اس نسل کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرسکیں، تلاش کئے جاسکیں۔ یہ کام اتنا بڑا ہے کہ وہ ادیب یا ادیبوں کی وہ جماعت جو اسے انجام دیتی ہے۔ ادب و تہذیب میں خود تاریخی میں اہمیت اختیار کرلیتی ہے۔ سرسید اور حالی اس لئے بڑے اور اہم کالرج اور میتھیو آرنلڈ اسی لئے تاریخ میں ایک سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ جدید دور میں ایلیٹ کی بھی یہی اہمیت ہے۔''[۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''سارتر، ایک تعارف'' میں ژان پال سارتر کی ادبی زندگی کے بارے میں لکھا ہے۔ یہ ایک فرانسیسی فلسفی، ڈرامہ نگار ناول نویس ہے سارتر نے فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد درس و تدریس کا کام شروع کیا ۳۹ء میں جب دوسری جنگ عظیم ہوئی۔ نازیوں نے فرانس پر حملہ کیا تو سارتر فوج میں شامل ہوگیا۔ آزادی کے لیے مضمون بھی لکھے امریکہ والوں کو اس سے شکایت تھی کیونکہ وہ مارکسزم کا علم بردار ہے۔

---

[۱]، [۲] تنقید اور تجربہ، ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی۔ ۱۹۸۹ء ص ۳۰۲ / ۳۰۳

اگلا مضمون ''سارتر وجودیت اورادب'' ہے ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس میں تفصیلی بحث کی ہے۔ انھوں نے وجودیت کے بارے میں طرح طرح سے مثالیں دے کر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

''ایک جگہ وہ لکھتے ہیں وجودیت کی داخلیت انسان کو اپنی ذات میں محدود نہیں کرتی بلکہ حیات وکائنات کی نئی منزلیں اور وسعتیں سامنے کر دیتی ہیں۔ وہ اپنی آزادی کے تصور میں دوسروں کی آزادی کو نہیں بھولتا اسے یہ بھی خیال رہتا ہے کہ زندگی اس وقت تک کچھ حیثیت نہیں رکھتی جب تک اسے بسر نہ کیا جائے۔ سارتر کا ایک کردار کہتا ہے ''انصاف' خود انسان انسان کا معاملہ ہے۔ اور اسکے سیکھنے کے لئے مجھے کسی خدا کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اور اسی لئے وہ خدا سازی کا کام چھوڑ کر آدمی بننے اور بنانے کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔ انسانی زندگی بسر کرنے اور پورے امکانات پر حادی ہونے کے لئے اس سے بہتر اور کیا راستہ ہوسکتا ہے۔''[1]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''ژاں پال سارتر'' جو مضمون لکھا ہے۔ اس میں بھی سارتر اور وجودیت کا تذکرہ کیا ہے۔ سارتر کا اس فلسفہ سے گہرا رشتہ ہے اس کے ذریعے وہ انسان کو انسان بنانا چاہتا ہے۔

آخری مضمون ''بورس پیسٹرنک بحیثیت شاعر'' ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ بورس پیسٹرنک فن کاروں کی اس جماعت سے تعلق رکھتا ہے جو یہ سوچتے ہیں کہ ایک فن کار کا کام دنیا کو اپنے فن کے آئینے میں دیکھنا ہے۔ انسانی احساسات کا تجربہ کرے اور اپنی ذات کے تعلق سے پیدا ہونے والے احساسات کو پوری شدت کے ساتھ ظاہر کر دے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی

''پیسٹرنک کی نظموں کو جب تک با آواز بلند دو تین بار نہ پڑھا جائے اس کا داخلی حسن لفظوں میں فکر و احساس کا ربط اور شاعری کے عمل و تاثر سے شعری تصاویر کا تعلق واضح نہیں ہوتا۔''[2]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''تنقید اور تجربہ'' میں ادب اور ادیب دونوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ نئے تقاضے بتائے ہیں کہ کس طرح ہمیں اپنے معیار کو قائم رکھنا ہے۔ حالات تو ہر دور میں خراب ہوئے مگر پہلے کے ادیب اور شاعروں نے اپنی قدروں کو قائم رکھا۔ سید مجتبیٰ حسین نے اس کتاب پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے۔

۱، ۲ تنقید اور تجربہ، ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی۔ ۱۹۸۹ء ص ۳۲۹ / ۳۳۵

''جمیل جالبی کے مضامین پڑھ کر ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ لکھنے والا کئی الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ادب اور تہذیب کا ربط کیا ہے۔ ادبی اقدار معاشرتی اقدار کے زیر اثر تربیت پاتی ہیں یا اس کے برعکس ہے۔ ادیب کی سماجی، سیاسی اور ادبی حیثیتوں میں فرق ہے یا یہ ایک سی ہیں، ہمارے گذشتہ دور میں اور موجود دور میں ادبی لحاظ سے اتنی بلندی اور پستی کیوں ہے۔'' [۱]

ان باتوں کا جواب شاید یہ ہے کہ آج مشرق پر مغرب کا اثر بہت زیادہ ہے۔ ہم اپنی قدریں بھول گئے۔ ڈاکٹر انور سدید کا خیال ہے۔

''ان کی تنقیدی کتاب ''تنقید اور تجربہ'' منصفانہ تجزیے اور ہمدردانہ رویئے کی آئینہ دار ہے انھوں نے ادب کی معاشرتی صداقتوں کو جرات مندی سے پیش کیا وہ خوش قسمت ہیں کہ ان پر فی الحال نہ تو کفر کا فتوی لگا ہے اور نہ ان پر مخالف پاکستان ہونے کا الزام لگا ہے۔'' [۲]

[۱] سید مجتبیٰ حسن، مضمون تنقید اور تجربہ، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نا شاہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ۱۹۹۳ص ۲۲۵۔۲۲۶

[۲] ڈاکٹر انور سدید۔ مضمون ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ص ۲۰۲

محمد تقی میرؔ

''بابائے اردو یادگار لیکچر''

''محمد تقی میرؔ'' ایک ایسی کتاب ہے۔ جس میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا وہ لکچر ہے جو جناب اختر حسین صاحب کی صدارت میں ۱۹۸۰ء میں''بابائے اردو یادگار لیکچر'' کے موقع پر پیش کیا گیا ہے۔اس کتاب میں سب سے پہلے ڈاکٹر جمیل جالبی نے میرؔ کی سنِ پیدائش لے کر سے انکی تعلیم، پیشہ، عہدے، انعامات، کوائف اور کتابیں شامل کی ہیں۔اس کے بعد خطبۂ صدر: اختر حسین، صدر انجمن ترقی اردو پاکستان اور بابائے اردو یادگار لیکچر: ڈاکٹر جمیل جالبی اس میں دو لیکچر ہیں پہلا لیکچر محمد تقی میرؔ: حیات، سیرت اور تصانیف اور دوسرا لیکچر محمد تقی میرؔ: مطالعہ شاعری ہے

اختر حسین صاحب خطبہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں

''آج بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کو رحلت کئے انیس سال ہوئے ہیں گزشتہ دو تین سال سے ان کا یوم وفات ماہ رمضان المبارک میں پڑتا رہا اس لئے جلسے کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

جب یہ کمی محسوس ہوئی تو ہم نے جلسے کا یہ بدل نکالا ہے کہ آئندہ سے اس موقع پر ادبی شخصیات کے کاموں پر توسیعی خطبات کا سلسلہ جاری کیا جائے۔ان خطبات کو ہم نے''بابائے اردو یادگار لیکچرز'' کا نام دیا ہے اس پروگرام کے مطابق ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب سے درخواست کی گئی کہ وہ کوئی مناسب موضوع منتخب کر کے اس سلسلہ کا آغاز کردیں۔انھوں نے ہماری تجویز کو مان لیا اور اپنے خطبہ کے لئے''میر تقی میرؔ'' کو منتخب کیا۔''[1]

اس لیکچر پر ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے

''بابائے اردو یادگار لیکچر'' کا آغاز کر کے اور اس سلسلے کا یہ پہلا لیکچر ہے انجمن ترقی اردو پاکستان نے ایک ایسے ماحول میں جہاں سنجیدہ فکری، تخلیقی و ذہنی

---

[1] محمد تقی میر، ڈاکٹر جمیل جالبی، انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی ۱۹۸۱ء ص ۸

سرگرمیاں بجھ گئی ہیں اور اہل علم وادب ناقدری کا شکار ہیں ایک قدم اٹھایا ہے جو مثبت بھی ہے اور مفید بھی۔ آج عام طور پر لوگ نہ کتابوں کی بات کرتے ہیں نہ رسائل پر تبادلہ خیال کرتے ہیں اور جب دو مختلف سمتوں سے آنے جانے والی چیونٹیوں کی طرح ذرا دیر کو ملتے ہیں تو بات اخبار یا ٹیلی وژن کے پروگراموں تک محدود رہتی ہے۔''[۱]

پہلا لیکچر

محمد تقی میر

حیات، سیرت اور تصانیف

ڈاکٹر جمیل جالبی نے سب سے پہلے میر کی زندگی کے حالات بیان کئے ہیں۔ میر کے آباؤ اجداد حجاز سے ہجرت کر کے دکن میں مقیم ہوئے اور پھر ان میں سے کچھ لوگ آکبرآباد آگئے۔ جن میں میر کے دادا بھی تھے انکے دو بیٹے تھے۔ ایک جوانی میں ہی دماغی مرض میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئے۔ دوسرے میر کے والد تھے۔

میر کے سنِ پیدائش کو لے کر مختلف رائے پیش کی گئی ہیں۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی ''محمد تقی میر (۱۱۳۵ھ۔ ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ/۲۳۔۲۲۔۱۷۲۲۔ ۲۰ ستمبر ۱۸۱۰ء) کی ولادت کے بارے میں مختلف رائے ہیں۔ لیکن یہ سب قیاسات دیوانِ چہارم نسخہ محمود آباد کی اس عبارت کے بعد جو خود میر کے بھتیجے محمد محسن کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی ہیں۔، ختم ہو جاتے ہیں۔ اس سنِ پیدائش کی مزید تصدیق اسی دیوانِ چہارم پر لکھی ہوئی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے جو'' سوانح میر تقی میر'' کے زیر عنوان کسی معدوم تذکرے'' نوادرالکملا'' سے نقل کی گئی ہیں اس عبارت کا ابتدائی جملہ یہ ہے۔

''اصلا اکبرآباد کے تھے ۱۱۳۵ کے آخر میں پیدا ہوئے۔''[۲]

میر ایک غریب گھرانے کے تھے۔ والد صاحب بھی درویش طبیعت کے مالک تھے۔ انکے انتقال کے بعد میر تلاش روزگار کے لئے دہلی روانہ ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نادر شاہ کی قتل و غارت گری دہلی کو برباد کر رہی تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی میر کی تعلیم کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

۱۔ محمد تقی میر، ڈاکٹر جمیل جالبی، انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی ۱۹۸۱ء ص ۱۵

۲۔ محمد میر تقی میر، ڈاکٹر جمیل جالبی، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۸۱ء ص ۲۰۔۲۱

''محمد تقی میرؔ نے اپنی تعلیم و تربیت اور خان آرزو سے کسبِ فیض کا ذکر بھی ''ذکر میر'' میں نہیں کیا بلکہ لکھا کہ ''شہر کے دوستوں سے چند کتابیں پڑھیں''۔ آخر جب یہ صورتِ حال تھی تو میر'' نے اپنے تذکرے نکات الشعراء میں آرزو کے بارے یہ عبارت میں کیوں لکھی کہ ''اس فن بے اعتبار کو کہ ہم نے اختیار کیا ہے (آرزو) نے ہی اعتبار دیا ہے۔

ان میں سے ایک ہی بات صحیح ہوسکتی ہے۔ آرزو کا انتقال ۱۱۶۱ھ ر ۱۷۵۶ء میں ہوا نکات الشعراء ۱۱۶۵ھ/۱۷۶۲ء میں مکمل ہوااور ذکر میر کا آغاز ۱۱۸۵ھ/۷۲۔۱۷۷۱ء میں ہوا۔ اس وقت آرزو میرؔ کے کسی بیان کی تردید کرنے کے لئے موجود نہ تھے۔ یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ آرزو جیسے یگانہ روزگار کے پاس نوعمری کے زمانے میں میر تقریباً سات سال رہیں اور آرزو ان کی تعلیم و تربیت نہ کریں۔''[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس بارے میں دوسرے تذکرہ نگاروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن میں قائمؔ ،قدرتؔ اللہ قاسم اور میرؔ حسن شامل ہیں۔

میر کو جنون کا خاندانی مرض تھا۔ انکے چچا بھی اسی مرض میں فوت ہوئے تھے۔ میرؔ کے اندر شعر گوئی کی صلاحیت بچپن سے ہی تھی۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو وہ پیدائشی شاعر تھے۔ جس زمانے میں یہ شاعری کررہے تھے اس وقت مغلیہ سلطنت کا سورج گہنا رہا تھا۔ میرؔ نے اپنی شاعری میں زمانے کے حالات کو پوری طرح سمو دیا تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ میرؔ نے اپنے لکھنو آنے کے سال کہیں نہیں لکھا۔ تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ میرؔ ۳۱ سال لکھنو میں مقیم رہے۔ اور ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں وفات پائی۔

''ڈاکٹر جمیل جالبی کے خیال میں'' اٹھارویں صدی عیسوی کے اس ماحول میں پراگندہ روزی، پراگندہ دل، بے دماغ اور انا پرست میرؔ کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو پس کر

---

[۱] محمد تقی میر، ڈاکٹر جمیل جالبی، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۸۱ء ص ۲۴

رہ جاتا لیکن میؔر نے وقت کی دھڑکن کو اپنے خون میں شامل کر کے اسے اپنی شاعری
کے ساز میں سمو دیا۔ میؔر کی آواز اٹھارویں صدی کے برصغیر کی روح کی آواز ہے۔''[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی اب میؔر کی سیرت بیان کرتے ہیں وہ ایک ایسے انسان تھے، جنھوں نے بچپن سے پریشان کن حالات سے مقابلہ کیا۔ بچپن میں وہ محبتوں کو ترستے رہے۔ جوانی میں تلاش روزگار نے جینے نہ دیا۔ میؔر کے حالاتِ زندگی اور انکی انا پرستی نے انھیں انکی ذات میں قید کر دیا۔ اور اس قید سے وہ باہر آنے کو تیار نہیں تھے۔

بقول ڈاکٹر جمیل جالبی'' ذاتی غم اور زمانے کے غم نے حساس میر کو دریا
دریا رُلایا اور ان کی شاعری کو وہ نشتریت دی جوان کی امتیازی صفت ہے جسے
زری اُجڑ انگر، چراغ مفلس، چراغ گور، ویرانہ، صحرا مرگ وغیرہ اسی کیفیت
کے اشارے ہیں جو بار بار ان کی شاعری میں آتے ہیں۔''[۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کتاب میں میؔر کی جن تصانیف کا ذکر کیا ہے وہ نکات الشعراء، فیض میر، دریائے عشق (نثر فارسی)، ذکر میر، دیوان فارسی، کلیات اردو، دیوانِ اوّل، دیوانِ دوم، دیوانِ سوم، دیوان چہارم، دیوانِ پنجم، دیوانِ ششم، دیوانچہ اور دیوان زادہ شامل ہیں ان سب سے تصانیف کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

دوسرا لیکچر محمد تقی میر

مطالعہ شاعری

اس حصے میں میؔر کی شاعری اشعار کی مثال دے کر باقاعدہ جائزہ لیا گیا ہے۔ میؔر غزل کے شاعر ہیں۔ سب سے زیادہ اسی صنف میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ وہ عوام و خواص کے شاعر ہیں۔ انکے کلام میں ایک انفرادیت ہے جو انھیں سب سے الگ کرتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی خطبے میں کہتے ہیں۔

''میؔر کے کلیات کو پڑھتے وقت ہمیں طرح طرح کی آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے
۔ کبھی وہ ہمیں غم زدہ کر دیتا ہے۔ کبھی وہ ہمارے غموں کا تزکیہ کر دیتا ہے۔ کبھی وہ

۱؎ محمد تقی میر، ڈاکٹر جمیل جالبی، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۸۱ء ص ۳۳
۲؎ محمد تقی میر، ڈاکٹر جمیل جالبی، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۸۱ء ص ۳۵

ایسی سچائی کا شعور دیتا ہے جس سے شاید ہم واقف تو تھے لیکن اس طرح نہیں جس طرح میر نے ہمیں واقف کرایا ہے۔''[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی چند اشعار کی مثال دیتے ہیں۔

''بے خودی لے گئی کہاں ہم کو	دیر سے انتظار ہے اپنا
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے	دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
موت ایک زندگی کا وقفہ ہے	یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

ان اشعار میں معنی کی کئی تہیں چھپی ہوئی ہیں جن کی مختلف انداز سے تشریح کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہاں بھی شعر کا اثر معنی سے پہلے پہنچتا ہے۔''[۲]

میر کی شاعری پر عظیم الحق جنیدی کا خیال ہے۔

''لفظ میر کے ہاتھوں میں پہنچ کر موم ہو جاتے تھے اور وہ انھیں جس طرح چاہتے ڈھال لیتے تھے۔''[۳]

سید اعجاز حسین کا خیال ہے'' حقیقت یہ ہے کہ تغزل جس کامیابی اور جوش اسلوبی سے میر صاحب نے نبھایا ہے وہ ان کے حصہ کی بات ہو گئی ہے'' آگے لکھتے ہیں کہ'' قصیدہ میں میر صاحب سودا سے بہت پیچھے ہیں۔ اس لئے کہ ان پر درد اور یاس کا غلبہ ہے جو قصیدہ کے لئے بڑی حد تک کار آمد نہیں۔''[۴]

لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی کا نظریہ میر کے معاملے میں ذرا الگ ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''میر و سودا دونوں مسلم الثبوت استاد ہیں۔ دونوں نے اردو زبان کی تعمیر میں برابر کا حصہ لیا ہے۔ سودا نے اردو زبان کو مختلف اصناف میں استعمال کر کے اسے وسعت دی ہے۔ لیکن غزل میں جو لطافت و نفاست میر نے حاصل کی وہ سودا کو نصیب نہیں ہوئی۔''[۵]

ہر ادیب کے سوچنے کا نظریہ الگ ہے۔ کچھ باتوں میں متفق بھی نظر آتے ہیں۔ اور سب کی رائے سے اتفاق بھی کرنا پڑتا ہے۔

۱، ۲، ۵ محمد تقی میر، ڈاکٹر جالبی، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۸۱ء ص ۹۰ / ۹۳ / ۱۲۱

۳ اردو ادب کی تاریخ، مرتبہ: عظیم الحق جنیدی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۷ء ص ۸۵

۴ مختصر تاریخ ادب اردو، سید اعجاز حسین، اردو کتاب گھر دلی۔ ۶ ص ۷۷

نئی تنقید

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنا ادبی سفر تنقید سے ہی شروع کیا تھا۔ انھوں نے مشرق اور مغرب کے ادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اس کے بعد تنقید نگاری پر قلم اٹھایا ہے۔

بقول احسن فاروقی ''حقیقت یہ ہے کہ مجھے اردو کا کوئی نقاد دیکھائی نہیں دیتا جو اتنا وسیع علم رکھتا ہو۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کو جمع کر کے مربوط کرنے اور انفرادی نظر کے ساتھ پیش کرنے کا اہل ہو۔'' [۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی تنقید نگاری کو دل سے پسند کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ تنقید پر پورے خلوص کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں۔

بقول جالبی کے'' تنقید میرے لئے وہی حیثیت رکھتی ہے جو شاعر کے لئے شاعری ناول نگار کے لئے ناول اور ڈرامہ نویس کے لئے ڈرامہ رکھتا ہے میں تخلیق اور تنقید کو الگ خانوں میں نہیں رکھتا۔'' [۲]

ڈاکٹر انور سدید ڈاکٹر جالبی کی تنقید پر لکھتے ہیں۔

''ڈاکٹر جمیل جالبی نے تنقید کو اپنے تخلیقی اور فکری عمل کا حصہ بنایا ہے وہ ایسی تنقید کو جو صرف ادب کے دائرے میں گردش کرتی ہے۔ قبول کرنے سے گریزاں ہیں۔ تنقید کا مقصد نئے خیالات کی دریافت اور تجزیہ ہے۔ تنقید اگر اپنا بنیادی کام کرتی ہے تو عظیم ادبی ادوار کے لئے راستہ صاف ہو سکتا ہے۔'' [۳]

ڈاکٹر انور سدید کا خیال بھی صحیح ہے کہ اگر تنقید صرف اپنا بنیادی کام ہی کرلے تو ادب کے لئے راہیں ہموار ہونگیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی 'نئی تنقید' میں ۳۲ مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین میں ہر طرح کا موضوع زیر بحث آیا ہے۔ انھوں نے شروع میں تنقید اور جدیدیت پر لکھا ہے اس کے بعد نثر، شاعری مشرقی ادب، اقبال اور مغربی ادب کو بھی اپنے مضامین میں شامل کیا ہے۔

---

۱ ڈاکٹر احسن فاروقی مضمون جمیل جالبی کی تنقید نگاری، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ، موئف گوہر نوشاہی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی۔ ٦ ۱۹۹۳ء ص ۱۲٦

۲ نئی تنقید، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس ۱۹۸۸ء ص ۱۰

۳ ڈاکٹر انور سدید، مضمون جمیل جالبی کی تنقید نگاری، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ، موئف گوہر نوشاہی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی۔ ٦ ۱۹۹۳ء ص ۲۰۷۔۲۰۸

نئی تنقید کے مضامین اس طرح ہیں۔

نئی تنقید	نئی تنقید کا منصب
تنقیدی اور تحقیقی موضوعات پر لکھنے کے اصول	جدیدیت کیا ہے۔
جدید اردو نثر کا مسئلہ	جدید اردو افسانے کے رجحانات
جدید علامتی افسانہ: ایک منفی رجحان	جدید شاعر
طلسم ہوشربا کے بارے میں چند باتیں	علی عباس حسینی
ایک منفرد افسانہ نگار	شام اودھ: ایک مطالعہ
صاحب طرز ادیب	انار کلی ایک مطالعہ
محمد تقی میر	طرز غالب
راز داں اپنا	مطالعہ اقبال کے نئے گوشے
سلیم احمد کے تخلیقی سفر کے بارے میں	ادب کا سماجی عمل
ادب اور عصر آگہی	مشرق کا المیہ
نئے معنی کی تلاش	قومی تشخص اور ثقافت
اقبال کا تصور ثقافت	پچیس سال کی ذہنی اور ثقافتی تحریکیں
برٹرینڈرسل :سائنس کا پیامبر	ایزراپاؤنڈ: روایت کی تلاش
ایزراپاونڈ: شاعری کا سفر	سنجیدہ فنکار: ایزراپاؤنڈ
آئیرلینڈ کا جدید ادب	

ہم نے چند نہایت اہم مضامین پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ تمام مضامین پر گفتگو کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

پہلا مضمون ''نئی تنقید'' ہے ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ آج کل کے شاعر اور ادیب کا یہ رجحان ہو گیا ہے وہ نقاد سے یہ امید لگاتے ہیں کہ وہ صرف تعریف بیان کرے کوئی خامی نہ نکالے نقاد نے بھی اب یہی طریقہ اختیار کر لیا ہے جسکی وجہ سے تخلیق کا معیار کم ہوتا جا رہا ہے۔

بقول ڈاکٹر جمیل جالبی ''تنقید اور تخلیق کا باہمی رشتہ کٹ جانے سے تخلیقی عمل

تنقیدی شعور سے الگ ہو گیا ہے۔ ہر دور میں ادیب و شاعر اپنے عمل تخلیق کو تنقیدی جوہر سے سنوارتے رہے ہیں۔ اور ہر نقاد اپنے عمل تنقید کو تخلیقی جوہر سے نکھارتا رہا ہے۔"[۱]

آج کے دور کے شاعر، ادیب اور نقاد اس عمل کو اختیار نہیں کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیق اور تنقید بے سمتی کا شکار ہے۔

دوسرا مضمون "نئی تنقید کا منصب" ہے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

"نئی تنقید کے منصب کی تلاش میں پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ مختلف علوم و نظریات کے زیر اثر تنقید نے اب تک کیا کیا صورتیں اختیار کی ہیں اور ان صورتوں سے ادب کے مطالعے میں کیا مدد ملی ہے۔ اور کیا یہ صورتیں ادب و تنقید کے منصب کو پورا کر رہی ہیں۔"[۲]

ان سوالوں کا جواب انھوں نے اپنے مضمون میں ہر قسم کی تنقید پر بحث کر کے دیا ہے۔ اس مضمون پر ڈاکٹر نوازش نے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے۔

"اس مضمون میں انھوں نے تنقید کے تمام دبستانوں کو نہ صرف کھنگالا ہے بلکہ ان دبستانوں کی نارسائیوں کو بھی واضح طور پر بیان کر دیا ہے۔ "سماجی تنقید" "نفسیاتی تنقید" جمالیاتی تنقید، تاثراتی تنقید روایتی تنقید، سوانحی تنقید وغیرہ پر انھوں نے سیر حاصل گفتگو کے ساتھ ساتھ ان مختلف تنقیدی دبستانوں کا جائزہ لے کر انہیں یک رخی تنقید کے ذیل میں لا کر کھڑا کیا ہے۔"[۳]

ڈاکٹر نوازش کی رائے سے اتفاق کیا جا سکتا ہے، یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے مضمون میں تنقید کے ہر پہلو کو جاگر کیا تیسرا مضمون "تنقیدی اور تحقیقی موضوعات پر لکھنے کے اصول" اس مضمون میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے محقق اور نقاد کے لئے چند اصول تجویز کئے ہیں۔ جو اس طرح ہیں۔

"تنقید کی بنیاد تحقیق پر رکھنی چاہئے لکھنے سے پہلے اس موضوع پر جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس کا براہ راست مطالعہ کرنا چاہئے، تنقید میں بے اعتبار مفروضاعات سے گریز کرنا چاہئے لکھنے سے پہلے آپ کا ذہن صاف ہو، اپنے موضوع کے ساتھ آپ کو شب و روز بسر کرنے چاہئیں۔ لکھتے وقت کم سے کم لفظوں میں اپنی بات کہنی چاہئے

---

۱ ۲ نئی تنقید، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۸ء ص ۱۳ / ۴۷

۳ ارمغان سہ ماہی کراچی، جمیل جالبی نمبر، شمارہ ۳ (اپریل مئی جون ۹۶ء) ص ۱۲۸ ـ ۱۲۹

اور آپ کی تحریر میں زاویہ نظر کا ہونا ضروری ہے۔''[۱]

ان اصولوں کو اپنا کر محقق و نقادفائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اگلا مضمون ''جدیدیت کیا ہے'' ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے۔

''جدیدیت صنعتی معاشرے کے ہر دم بدلنے والے مزاج کا منطقی نتیجہ ہے۔ جیسے جیسے صنعتی نظام ہمارے معاشرے میں سرایت کرتا جارہا ہے ویسے ویسے تبدیلیوں کی اکھاڑ پچھاڑ بھی تیز تر ہوتی جارہی ہے اور جدیدیت کا مسئلہ ہر نسل کے لئے اہم سے اہم تر ہوتا جارہا ہے۔''[۲]

جدت پسندی اب ہر دور اور ہر نسل کے لئے ضرورت بن گئی ہے۔ یہ مغرب کی دین ہے مغرب کو ہم نے بڑی آسانی سے قبول کرلیا ہے۔

اب جو مضمون ہے وہ ''جدید اردو نثر کا مسئلہ'' ڈاکٹر جمیل جالبی کی رائے میں

''اردو نثر کی خرابی کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ انگریزی تعلیم کے اثر سے انگریزی زبان کا اثر اس قدر عام ہوا کہ جملوں کی ساخت، بندشوں اور فقروں کا لہجہ، جملہ معترضہ اور فاعل فعل مفعول کی ترتیب بھی متاثر ہونے لگی۔''[۳]

اگر نثر اردو زبان میں لکھی جائے تو یہ مسئلہ کچھ حل ہوسکتا ہے خیالات کہیں سے بھی لئے گئے ہوں مگر زبان اگر اردو ہو تو بہتر ہوگا۔

ڈاکٹر جالبی اپنے مضمون ''جدید شاعر'' کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''اب جدید شاعر کی بات چلی ہے تو یہ بتا تا چلوں کہ جدید شاعر رومانی شاعر نہیں ہے وہ زندگی سے فرار اختیار کر کے خوابوں کی دنیا میں پناہ نہیں لیتا بلکہ وہ زندگی کو بیک وقت اس کی ساری بیماریوں تعفن، منفی اور مثبت پہلوؤں کے ساتھ قبول کرتا ہے۔''[۴]

جدیدیت نے اپنا اثر ادب کی ہر صنف پر چھوڑا ہے۔ چاہے وہ نثر ہو یا شاعری ہر جگہ جدت نظر آتی ہے۔ اب جو مضمون ہے اس کا عنوان ''شام اودھ: ایک مطالعہ'' ہے ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے۔

''شام اودھ اردو میں تہذیبی ناول کی اسی روایت کو آگے بڑھاتا ہے جس کے پیش رو پنڈت رتن ناتھ سرشار اور امراء جان ادا والے مرزا ہادی رسوا ہیں، سرشار نے

---

۱ ۲ ۳ ۴ نئی تنقید، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۸ء ص ۷۶ / ۸۱ / ۸۷ / ۱۱۶

لکھنوی زندگی کے لاتعداد پہلوؤں کو "فسانہ آزاد" میں پیش کیا ہے رسوا نے لکھنو کی تہذیبی زندگی کے اظہار کے لئے طوائف کو موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے سرشار و رسوا کے دائروں سے ہٹ کر لکھنو کی تہذیبی زندگی کا مطالعہ ایک خاص نوعیت اور ایک خاص تصور کے ساتھ شام اودھ میں کیا ہے۔"[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے مضمون "صاحب طرز ادیب میں شاہد احمد دہلوی کی نثر نگاری پر روشنی ڈالی ہے۔ ابتداء میں انھوں نے جدید نثر کی خرابی بیان کی ہے۔ اسکی کمزوریاں بتائی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کو اس دور میں شاہ احمد دہلوی کی نثر ایک سایہ دار درخت محسوس ہوتی ہے انکی نثر میں شگفتگی اور دلکشی ہے۔ محاوروں اور الفاظ کا اس طرح صحیح استعمال کرتے ہیں کہ ہر لفظ جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ انکی عبارت میں نہ تو انگریزی الفاظ آتے ہیں نہ عربی، فارسی الفاظ کا استعمال ہے۔ اب جو مضمون ہے وہ "انارکلی ایک مطالعہ" ہے اس میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر پورا ڈرامہ سمجھ میں آجاتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے۔

"انارکلی" کو ڈرامہ نگاری کے فن کے لحاظ سے دیکھا جائے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ڈرامہ اسٹیج کی چیز ہے اور "انارکلی" اسٹیج کے لئے نہیں لکھا گیا تھا۔ بلکہ ایک "ادبی ڈرامہ" ہے جو پڑھنے کے لئے لکھا گیا ہے۔ یہ ناول بھی ہوسکتا ہے مگر ناول کے فن کے بجائے اسے ڈرامہ کے فن میں لکھا گیا ہے اور اسی معیار سے دیکھنا چاہئے۔[۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی کا اگلا مضمون "محمد تقی میرؔ" ہے جس میں انھوں نے میر کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے اور اشعار بھی پیش کئے ہیں۔ انکا خیال ہے۔

"میرؔ کے زمانے سے لے کر اب تک کوئی دور ایسا نہیں آیا جب میرؔ کی مقبولیت اور احساس عظمت کا سورج گہنا گیا ہو۔ غالب اپنے دور میں بڑے شاعر ضرور تھے لیکن مقبول شاعر نہیں تھے۔ میرؔ نہ صرف اپنے دور میں بلکہ آج تک بڑے شاعر بھی ہیں۔ اور مقبول شاعر بھی۔ میرؔ کی شاعری کی طرف ان کے معاصرین اور نئی نسلوں نے بھی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور آج تک یہ روایت اس طرح جاری ہے۔"[۳]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے مرزا غالب پر بھی "طرز غالبؔ" کے نام سے مضمون لکھا ہے اس میں غالبؔ

---

[۱] [۲] [۳] نئی تنقید، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۸ء ص ۱۳۹ / ۱۷۵ / ۱۹۷

کے اشعار کے ذریعہ انکی شاعری کے ہر رنگ کو بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے۔

''میرزا کے مزاج میں عام راستے سے عام چیزوں سے عام خیالات سے، عام وضع سے، عام روایت سے ہٹ کر چلنا بنیادی خصوصیت تھی۔ یہی مزاج جب شعر وادب میں ظاہر ہوا تو یہاں بھی سب سے ہٹ کر چلا اور اپنی الگ راہ نکالی۔''[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''مطالعہ اقبال کے نئے گوشے'' میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

''انقلابات کے اس دور میں مسلمانانِ عالم بھی اپنی تقدیر کی تشکیل نو کا آغاز کرر ہے تھے۔ اقبال نے روح مسلمان کے پیچ وتاب کو اپنی نوائے سرمدی میں جگہ اور دی معمارِ حرم کی تعمیر جہاں کے لئے اٹھ کھڑے ہونے کا پیغام دیا۔ یہ پیغام کسی چھوٹے تنگ نظر اور متعصب دل و دماغ کی پیداوار نہیں تھا۔ یہ ایک ایسے انسان کا پیغام تھا جو مشرق ومغرب کی قید سے بے نیاز وہ آفاقی انسان تھا جس میں خود آفاق گم ہو جاتے ہیں۔ اقبال چاہتے تھے کہ نئی دنیا کی تعمیر میں دوسری قوموں کی طرح مسلمان بھی حصہ لیں۔ اور اپنے اجتماعی کردار سے ایسی اقدار اور روایت کی تخلیق کریں جو پوری انسانیت کے لئے مفید ثابت ہو''۔[۲]

اگلا مضمون برٹرینڈ رسل: سائنس کا پیامبر ہے' ڈاکٹر جالبی کا خیال ہے۔

''رسل پہلا شخص ہے جس نے یہ امید دلائی کہ رفتہ رفتہ سائنسی سماج مذہبی سماج کی جگہ لے گا۔ اپنے خیالات کو عام کرنے کے لئے رسل نے فلسفہ کو علمی دائرے سے نکال کر عام دائرے میں پہونچا دیا اور اپنی طور پر پیش کیا کہ عام آدمی بھی اس کی فکر میں دلچسپی لے کر اسے اپنے شعور کا حصہ بنا سکے۔''[۳]

اب جو مضمون ہے وہ ''سنجیدہ فنکار: ایزرا پاؤنڈ' کے نام سے ہے اس میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے فن اور فنکار کے بارے میں بحث کی ہے اس مضمون میں دو پہلوؤں کو زیر بحث لائے ہیں پہلا جذبات اور شاعری اور دوسرا ہے۔ عظیم فن اور تنقید انھوں نے ایزرا پاؤنڈ پر کم بحث کی ہے، بلکہ اس بات کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے کہ ایک فنکار کو کسی حد تک انصاف پسند اور سنجیدہ ہونا چاہئے۔ صحیح غلط سمجھنے کی صلاحیت ہونی چاہئے۔ بقول جمیل جالبی

---

[۱]، [۲]، [۳] نئی تنقید، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۸ء ص ۲۱۳ / ۲۳۵ / ۳۳۲

''خراب فن ''غیر صحیح فن'' ہوتا ہے یہ وہ فن ہوتا ہے جو غلط رپورٹ دیتا ہے۔
فن سے جیسا کہ میں نے کہا ہے، ہم اس بات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انسان اصل
میں کس قسم کی مخلوق ہے۔''[1]

''نئی تنقید'' میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے تمام مروجہ تنقیدی دبستانوں سے بقدر ضرورت استفادے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

---

[1] نئی تنقید، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۸ء ص ۳۸۱

ادب کلچر اور مسائل

ڈاکٹر جمیل جالبی کے کئی تنقیدی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں سے ایک مجموعہ ''ادب کلچر اور مسائل'' ہے ان کے بیٹے خاور جمیل صاحب نے اس مجموعہ کو مرتب کیا ہے۔ اس میں ۵۶ مضامین شامل ہیں۔ اسکی فہرست اس طرح ہے۔

خاور جمیل صاحب نے اس کتاب میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے۔

''ان مضامین کے مطالعے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقیدی و تہذیبی فکر کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ یہاں آپ کو غیر معمولی تنوع ملے گا۔ ادب فکر کلچر اور زبان کے مختلف پہلوؤں پر بصیرت افروز خیالات ملیں گے[۱]

خاور جمیل کے خیالات سے اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ مگر ہم چند مضامین کا ہی جائزہ لیں گے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی مضمون ''ادب کیا ہے'' میں لکھتے ہیں

''ادب کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ ادب زندگی میں کسی چیز کا ''بدل'' نہیں ہے۔ اور اگر اس کی حیثیت کسی اور چیز کے بدل کی ہے تو پھر وہ ادب نہیں ہے۔''[۲]

''ادب اور ٹیکنولوجی'' میں انکا خیال ہے کہ'' اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ ادب زوال پذیر ہے کسمپرسی کا شکار ہے۔ چاہیں تو کہہ لیجئے کہ مر رہا ہے صرف ہمارے ہاں نہیں بلکہ ساری دنیا میں لیکن اس کی موت کی ذمہ دار ٹیکنولوجی تو نہیں ہے، وہ تو ادب کو نہیں مار رہی ہے۔ بلکہ سچ پوچھے تو ادب کو

---

۱ ، ۲ ادب کلچر اور مسائل، مصنف ڈاکٹر جمیل جالبی، مرتبہ خاور جمیل، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۸۸ء ص ۹ / ۱۵

فروغ دینے میں ہاتھ بٹا رہی ہے۔ یہ ٹیکنولوجی ہے جس کی وجہ سے دنیا میں ہر سال کروڑوں کتابیں اور رسائل شائع ہوتے ہیں۔"[۱]

روایت اور جدیدیت میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

"روایت اور جدیدیت" کا بنیادی تعلق ہے لیکن ہمارے ہاں جدیدیت بغیر سوچے سمجھے ہر چیز کو توڑنے پھوڑنے کے عمل کا اظہار بن کر آئی ہے۔ اس کی حیثیت اس مجمع کی سی ہے جو بغیر سوچے سمجھے ہر اس چیز کو آگ لگانے اور توڑنے پھوڑنے کا عمل کر رہا ہے۔ جو اس کے سامنے آجاتی ہے یہ وہ منفی رجحان ہے جس سے نہ ادب کو، نہ فکر کو، اور نہ خود تخلیق کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔"[۲]

مضمون "حالی کی نسل کا ذہنی رویہ" میں لکھا ہے۔

"حالی کی نسل کا یہ خیال تھا کہ وہ جو کچھ مغرب سے لے رہے ہیں دراصل وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ان کے لئے غیر ہے بلکہ یہ سب کچھ تو ان اصولوں، قدروں اور خیال کی ترقی یافتہ شکل ہے جو خود مغرب نے ایک زمانے میں ہم سے لیا تھا اسی خیال کے پیش نظر تعلیم عام کرنے کی کوششیں کی گئیں تاکہ ہم انگریزی زبان کے ذریعے ان علوم کو حاصل کر کے ترقی یافتہ بن سکیں۔"[۳]

"خطوط غالبؔ" میں ان کا خیال ہے۔

"جب غالبؔ سرسری طور پر پر تکلف سے بری اردو میں خطوط لکھنا شروع کیے تو ان میں ایک رنگا رنگ، ہمہ گیر اور زندگی سے بھرپور شخصیت کا اس طرح اظہار ہوا کہ ہر طرف سے واہ واہ کا ڈونگرا برس پڑا اور ان خطوط سے اردو نثر نویسی میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ غالب کے یہ خطوط آج سو سوا سو سال گزر جانے کے باوجود اسی طرح تازہ ہیں۔ جتنے اس وقت تھے، جب یہ پہلی بار لکھے گئے تھے۔"[۴]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے خطوط غالب کے ساتھ ساتھ اقبال کے خطوط کا بھی جائزہ لیا تھا۔ اس

---

۱ ،۲ ،۳ ،۴ ادب کلچر اور مسائل، مصنف ڈاکٹر جمیل جالبی، مرتبہ خاور جمیل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۸۸ء ص ۲۵ / ۶۷ / ۱۱۱ / ۱۱۷

مضمون کا عنوان ہے۔ ''خطوط اقبال کی اہمیت'' انکا خیال ہے۔

''اقبال کے خطوط کو پڑھ کر ان کے ذہنی سفر اور ان کے ذہنی ارتقاء کی داستان قلمبند کی جاسکتی ہے۔ وہ کہاں سے چلے اور کن کن راستوں سے ہوتے ہوئے کس منزل پر پہنچے۔ اقبال کے خطوط ان کی زندگی کا آئینہ ہیں۔'' [۱]

''فردوس بریں'' عبدالحلیم شرر'' میں وہ لکھتے ہیں۔ ''شرر نے چالیس کے قریب ناول لکھے۔ ان میں سے کئی ناول ایسے جو آج بھی مذاق زمانہ بدلنے کے باوجود دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ ان میں شرر کا ناول ''فردوسِ بریں'' تو اردو کے رومانی ناولوں میں ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے میں نے فردوس بریں کو رومانی ناول کہا ہے۔ اس کا موضوع تاریخی اور فرقہ باطنیہ وقرامطہ سے متعلق ہونے کے باوجود اصل میں حسین اور زمرد کے عشق کی دلچسپ داستان ہے۔'' [۲]

اب جو مضمون ہے وہ ''آغا حشر اور ڈرامے کی روایت'' ہے اس میں لکھا ہے۔

''آغا حشر نے ڈرامے کے فن کو بلند کیا۔ اس میں معاشرتی اور اصلاحی پہلو بھی اجاگر کئے اور ڈرامہ کے ذریعہ سیاسی بیداری اصلاحی مقاصد کا کام بھی لیا۔ ان کے مکالمے موزوں اور جاندار ہیں۔ ان میں شگفتگی بھی ہے۔ اور خیال وجذبہ کے اظہار کی قوت بھی خطابت انداز ایسا کہ شدت جذبات میں سننے والے کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں۔'' [۳]

اگلا مضمون ''مجنوں گورکھپوری کے بارے میں'' وہ لکھتے ہیں۔

''مجنوں صاحب نے اپنی زندگی میں کئی تحریکوں کا ساتھ دیا لیکن ان کا بنیادی حوالہ ہمیشہ ''ادب'' رہا۔ انھوں نے تنقید کے ذریعے ادب کو اولین اہمیت دی اور اسے کبھی کسی نظریے کے ماتحت نہیں کیا۔ یہی وہ گڑ بڑ ہے جس نے بیسویں صدی میں ادب کی ماہیت اور ادب کے منصب کو نقصان پہنچایا ہے۔ اسی لئے انکا ذوق ادب شفاف ہے۔'' [۴]

---

[۱]، [۲]، [۳]، [۴] ادب کلچر اور مسائل، مصنف ڈاکٹر جمیل جالبی، مرتبہ خاور جمیل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۸۸ء ص ۱۲۷ / ۱۵۹ / ۱۶۷ / ۱۸۳

ڈاکٹر جمیل جالبی نے مضمون ''فیض کی شاعری'' میں دو ادوار بتائے ہیں پہلا دور رومانی شاعری پر منحصر ہے اور دوسرے دور میں زندگی کے تجربات پیش کئے ہیں۔ انکا خیال ہے۔

''فیض احمد فیض کی شاعری کی سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت اس کے خیالات کی سنجیدگی، شخصیت کا متوازن پن، ذہنی ٹھراؤ اور شعری اعتدال ہے وہ واقعہ سے شدت کے ساتھ ضرور متاثر ہوتا ہے اور اسے دل کی گہرائیوں میں گونجتا ہوا بھی ضرور محسوس کرتا ہے۔''[۱]

مضمون ''اختر الایمان کی شاعری'' میں وہ لکھتے ہیں۔

''اختر الایمان کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت مجھے یہی خیال بار بار پیدا ہوا کہ اس کے ہاں شعری خلوص ہے اور وہ فیشن کے سیلاب میں بہہ نہیں جاتا بلکہ اپنے جذبات اور تجربات پر ایمان رکھتا ہے۔ اور انہیں کے سہارے وہ اپنی شاعری کے تاروپود بنتا ہے ۔ وہ نہ تو شاعری میں زیادہ انٹلیکچوئل (Intellec Tual) ہونے کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اور نہ اسے بالکل ڈل (Dull) بنا کر رکھ دیتا ہے۔''[۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''جہان دانش: احسان دانش'' کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے۔ اس کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے۔

''احسان دانش صاحب نے اپنی زندگی کے سارے نشیب و فراز بہت کم چھپائے بغیر بیان کر دیئے ہیں ۔ جہاں دانش ایک انسان کی جدوجہد کی ایسی داستان ہے جو پڑھنے والے میں جدوجہد کا ایک نیا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔''[۳]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے پاکستانی کلچر پر کافی بحث کی ہے۔ ''قومی کلچر کا مسئلہ: یک جہتی'' میں وہ کہتے ہیں۔

''فکر و عمل کے سلسلے میں یہ بنیادی بات ہے ۔ وہ عمل، جو فکر سے الگ ہو، بے نتیجہ رہتا ہے اور وہ فکر، جو عمل سے منقطع ہو، بے ثمر رہتی ہے ۔ ہمارے ہاں بھی یہی صورتحال ہے ہم یک جہتی کی تو بات کرتے ہے ۔ لیکن یہی وہ چیز

[۱، ۲، ۳] ادب کلچر اور مسائل، مصنف ڈاکٹر جمیل جالبی، مرتبہ خاور جمیل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۸۸ء ص ۲۰۷ / ۲۵۹ / ۲۹۲_۲۹۳

ہے جس سے ہم عملاً سب سے زیادہ آنکھیں چراتے ہیں ۔اس بات میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے کہ جب قومی یک جہتی پیدا کرنے کے لئے راستہ ہموار کیا جائیگا تو ہمیں بحثییت فرد بحثییت طبقہ۔ بحثییت علاقہ اپنی ذات اور اپنے دائرے کے حدود سے بلند اٹھنا اور باہر نکلنا ہوگا۔''[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ادب میں ہنسی مذاق کو بھی اہمیت دی ہے۔مضمون ''لطیفے اور تہذیب'' میں انکا خیال ہے۔

''زندگی کے بنانے اور سنوارنے میں ہنسی مذاق کی بنیادی اہمیت ہے۔ زندگی کا کوئی بھی کام خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا توازن کے ساتھ بغیر لذت نمک کے انجام نہیں دیا جاسکتا۔ہنسی مذاق اور زندگی کے خوشگوار پہلو خود زندگی میں ایک ایسا توازن پیدا کر دیتے ہیں کہ کام میں انہماک اور کارکردگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔''[۲]

وہ لطیفے کے بعد انقلاب و بغاوت کے وجوہات بتاتے ہیں ۔مضمون ''انقلاب کے عوامل'' میں انکا خیال ہے۔

''انقلاب اس وقت آتا ہے جب جبر واستحصال ،معاشی عدم مساوات اور انتشار کسی معاشرے کے توازن کو بری طرح بگاڑ دیتے ہیں اور فرد بے یقینی وعدم تحفظ کے احساس اور زندگی کے داخلی و خارجی تضاد کا شکار ہوکر اندر سے ٹوٹ جاتا ہے۔یہ سب عوامل مل جل کر فرد کو اس درجہ پست ، کاہل اور بے عمل بنادیتے ۔یا پھر اس کے اندر وہ عزم ،وہ قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ معاشرہ کی ان ناانصافیوں کے خلاف کمر باندہ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔''[۳]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''پاکستان میں اردو کا مسئلہ'' میں لکھا ہے۔

''یہ ہماری بدقسمتی اور ہمارا قومی المیہ ہے کہ ہم نے اپنی ذات پر اپنے تہذیبی ورثے پر اعتماد کرنا چھوڑ دیا ہے اور اپنے مسائل کے حل کے لئے کاسہ گدائی لے کر قدم قدم پر غیروں کی طرف دیکھتے ہیں اور چونکہ اپنے مسائل کا

۱،۲،۳ ادب کلچر اور مسائل ،مصنف ڈاکٹر جمیل جالبی ،مرتبہ خاور جمیل ،ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس ،دہلی ۱۹۸۸ء ص ۳۱۶/۳۱۹ ، ۳۳۵

حل ہم اپنے مخصوص قومی حالات وملی پس منظر سے الگ ہو کر تلاش کرتے ہیں
اس لئے ہر روز جب نئی صبح کا سورج طلوع ہوتا ہے نئے نئے مسائل میں الجھ
جاتے ہیں۔"[1]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے "ادب کلچر اور مسائل" میں طرح طرح کے ادبی اور ثقافتی مسائل کو اور ان کے حل کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

---

[1] ادب کلچر اور مسائل، مصنف ڈاکٹر جمیل جالبی، مرتبہ خاور جمیل، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۸۸ء ص ۳۷۳

قومی زبان: یک جہتی، نفاذ اور مسائل

اس کتاب میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا پیش لفظ ہے اس کے بعد فہرست ہے جس کے دو حصے ہیں۔
الف۔روح پاکستان قائدِ اعظم نے فرمایا: ب۔دستور پاکستان ۱۹۷۳ء میں لکھا ہے کہ:۔ اس کے بعد قومی زبان کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں: کچھ خطبات ہیں۔

۱۔ اردو اور پاکستان ۲۔ اردو کی قومی اہمیت
۳۔ اردو کیوں اور انگریزی کیوں نہیں ۴۔ نفاذِ اردو کا مسئلہ
۵۔ اردو کے بارے میں سات باتیں ۶۔ اردو اور ہمارا تہذیبی ورثہ
۷۔ پنجاب اور اردو ۸۔ بلوچستان اور اردو
۹۔ اردو اور مشینی تقاضے۔آخر میں ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبار اور رسالوں کے انتظامیہ سے گفتگو ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی پیش لفظ میں لکھتے ہیں

''ایک قوم کی حیثیت سے ہم میں وہ ساری خصوصیات موجود ہیں۔جن سے ترقی اور آگے بڑھنے کی منزل سر ہوتی ہے۔لیکن ''یک جہتی'' نہ ہونے کے سبب ہم آزادی کے بعد سے اب تک انتشار کا شکار ہیں۔آگے لکھتے ہیں۔'' آخر کیا وجہ ہے کہ گزشتہ ۴۳ سال سے ہمارے ہاں کوئی غزالی، کوئی شاہ ولی اللہ، کوئی سر سیّد کوئی قائد اعظم ،کوئی اقبال، کوئی حالی کیوں پیدا نہیں ہوا۔تعلیم کی شرح ہمارے ہاں کیوں نہیں بڑھی خود اس کا جواب تلاش کیجئے۔ جب تک ہم خود اپنی ذات پر اعتماد کرنا نہیں سیکھینگے ، جب تک ہم قومی سوچ کو پروان نہیں چڑھائیں گے۔''[۱]

یہ سوچ اپنی جگہ بالکل درست ہے۔بقول ڈاکٹر جمیل جالبی اردو نے دنیا کے زیادہ تر ملکوں میں اپنی مقبولیت کے جھنڈے گاڑ دیئے ہیں جہاں اُردو نے مُلکوں میں اپنی جگہ بنائی اور تمام دھرموں کے لوگوں کو متحد کرنے میں اپنا ایک الگ مقام پیدا کیا وہاں پاکستانی قوم نے اِس زبان سے اپنے مفادات کے لئے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا لیکن مفاد پرست سیاست داں اِقتدار کے لالچ میں اِس عظیم زبان کو نظر انداز کر گئے اور مغربی کلچر اور انگریزی زبان کے رسیاؤں نے اپنی اُردو زبان کو پس پشت ڈال دیا اگر

---

[۱] قومی زبان یکجہتی نفاذ اور مسائل، ڈاکٹر جمیل جالبی مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۹ء ص ۱۔۳

اُردو زبان کو سرکاری زبان بنایا جاتا تو وہ قومی زبان ہوتی اور اور پوری قوم یک جہتی کی ڈور میں نبدھی ہوتی کسی ملک کی مشترکہ زبان ہی یک جہتی اتحاد اور محبت پیدا کرتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بالکل درست کہا کہ پاکستان کی ایک فی صد آبادی والے لوگ جنکا قبضہ حکومت پر ہے وہ مختصر سا طبقہ ساری آبادی اور عوام کا استحصال کر رہا ہے اُنکا ذہن آج تک انگریزوں کی غلامی کے اثر میں ہے اُنکے دل و دماغ پر انگریزی زبان اور کلچر کا قبضہ ہے جو قومی یک جہتی کی راہ میں آہنی دیوار بنا کھڑا ہے ہم مغربیت کے رنگ میں ایسے رنگ گئے ہیں کہ اُسکا پکا رنگ اُترنا مشکل تو ہے ناممکن نہیں ہمیں اُسکے خلاف جدّ و جہد کرنا ہوگا ہمارے اوپر جو نظام مسلّط کیا گیا ہے اُسکو الٹنا ہوگا انگریزی ذریعہ تعلیم کے اسکولوں کی تعداد گھٹانی ہوگی اور اُردو ذریعہ تعلیم کے اسکولوں کی تعداد بڑھانی ہوگی کیونکہ انگریزی اسکولوں سے نکلنے والے طلبا اپنے اپنے کلچر روایات مذہب سے نابلد ہوتے ہیں اور وہی طبقہ حکومت کی باگڈور سنبھالتا ہے اور وہ انگریزی تعلیم نظام کو تقویت پہونچاتا ہے اور ہماری قومی زبان اردو کو صرف ایک مضمون کی حیثیت میں تبدیل کر دیا ہے اور ہمارے نوجوان نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے۔

خُطبہ

ڈاکٹر جمیل جالبی ''اردو کیوں اور انگریزی کیوں نہیں'' میں لکھتے ہیں کہ ''یہ بات طے شدہ ہے کہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہے بالکل اسی طرح جیسے ہندی بھارت کی، انگریزی انگلستان کی، نیپالی نیپال کی، چینی چین کی، جاپانی جاپان کی، مَلئے ملیشیا کی قومی زبانیں ہیں۔ مجھے اس موضوع پر گفتگو نہیں کرنی چاہیئے۔ لیکن میں یہ سوال اپنے سمجھنے کے لیے آپ کے سامنے ضرور اٹھاؤنگا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہی کیوں ہو اور دوسری صوبائی یا علاقائی زبان کیوں نہ ہو۔ ان میں سے ہر زبان کا اپنا علاقہ ہے لیکن کوئی زبان ان میں سے ایسی نہیں ہے جو دوسرے علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے پاس ایک ایسی ترقی یافتہ زبان موجود ہے جو سارے پاکستان کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ قومی مفاد اور قومی یک جہتی کے پیشِ نظر اردو ہی ہماری قومی زبان ہو سکتی ہے۔''[۱]

---

۱ قومی زبان یک جہتی، نفاذ اور مسائل ڈاکٹر جمیل جالبی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۹ء ص ۲۳۔۲۴

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے خطبوں سے قوم کے دل میں اردو زبان کے لئے جگہ بنانے کی پوری کوشش کی ہے انکا اندازِ بیان متأثر کرنے والا ہے۔ خطبہ ''اردو کے بارے میں سات باتیں'' میں سات اصول بتائے ہیں:

۱۔ ''جب تک علم اپنی زبان میں نہیں دیا جائے گا۔ اس وقت تک بنیادی تصورات ذہن میں صاف اور واضح نہیں ہوں گے۔

۲۔ جب تک اردو کو ذریعۂ دفتر، ذریعۂ عدالت، ذریعہ تعلیم نہیں بنایا جائے گا۔ اس وقت تک نہ کتابیں لکھی جائیں گی۔

۳۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو میں معیاری درسی کتابیں لکھائی جائیں۔

۴۔ ہر طالب علم کو ایک بڑی بیرونی زبان ضرور آنی چاہیئے اور ہمارے ملک کے لیئے یہ زبان انگریزی ہی ہو سکتی ہے۔

۵۔ اگر ہم قومی سطح پر آج یہ فیصلہ کرلیں کہ اردو کو دفتری زبان کے طور پر رائج کرنا ہے۔

۶۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم کا اثر قومی زندگی پر یہ پڑا ہے کہ ایک طبقۂ خواص وجود میں آ گیا ہے۔

۷۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم اور انگریزی درس گاہوں کے سلسلے میں حکومت کو یہ پالیسی اختیار کرنی چاہیئے کہ نظامِ تعلیم عوام اور خواص کے لئے یکساں ہوں۔'' [۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی کی باتوں پر عمل پیرا ہونے کی دیر ہے۔ اردو زبان کی اہمیت خود بخود ہو جائے گی ''اردو اور ہمارا تہذیبی ورثہ'' میں لکھتے ہیں۔

''جب ہم نے آزادی اور پاکستان کی جنگ لڑی تو اس زبان نے ہمارا ساتھ دیا۔ اگر یہ زبان نہ ہوتی تو آپ خود فیصلہ کیجئے۔ کیا انگریزی زبان ہمارے لئے یہ کام یا یہ خدمت انجام دے سکتی تھی'' [۲]

اردو کو آگے بڑھانے کے لئے اردو ٹیلیکس، اردو ٹیلی پرنٹر، اردو کمپیوٹر، اردو مشینی کتابت وغیرہ ہماری بنیادی قومی ضرورت ہیں۔ یہی وہ وقت ہے جب ہمیں اردو کمپیوٹر کو دریافت کرنا ہوگا اردو سائنس کی

---

[۱] قومی زبان یک جہتی، نفاذ اور مسائل ڈاکٹر جمیل جالبی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۹ء ص ۳۸۔۴۱

[۲] قومی زبان یک جہتی، نفاذ اور مسائل ڈاکٹر جمیل جالبی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۹ء ص ۴۴۔۴۵

زبان جب بنیگی جب اُسے سائنس میں استعمال کیا جائے گا ہم نے اُسے تاریخ میں استعمال کیا۔ ادب میں عمرانی علوم میں استعمال کیا اور وہاں اس کی قوت اظہار نکھر گئی اور کسی قسم کی دِقّت پیش نہیں آرہی نہ پڑھانے میں نہ تعلیم دینے میں اور نہ تحریر میں چنانچہ سائنس کی زبان بنانے کے لئے ضروری ہے کہ سائنس علوم میں اِس کا استعمال جاری ہو بقول ڈاکٹر جمیل جالبی اردو کو آگے بڑھانے کے لئے اردو ٹیلکس اردو ٹیلی پرنٹر کمپیوٹر سے مدد لینی چاہئے تھی جب ہی اردو انگریزی زبان کے ہم پلّہ ہوسکتی ہے یہ تو ہے کہ مشکلات ہر کام میں آتی ہیں لیکن الفاظ کے استعمال سے آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں اس کام میں دانشوروں ادیبوں کو اس لائن پر کام کرنا چاہیئے ۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے گفتگو میں جن شخصیتوں سے بات کی ہے ان میں ''اخبارِ اردو'' کی نصیر اعظم، ''نوائے وقت'' کے قاری حسن جاوید ہفت روزہ ''حرمت'' کے سحر صدیقی، ''جنگ فورم'' ملتان سے، ''زمانہ'' کوئٹہ کے امداد نظامی، ''روزنامہ جنگ،لندن'' کے محمد سرور اور شاہدہ نفیس، جنگ پینل لاہور کے سلیم چودھری، ڈاکٹر بشیر گورایا، حسین شاد اور اظہر غوری، ریڈیو پاکستان راولپنڈی کے منور ہاشمی، ٹیلی وژن پروگرام ''روبرو'' کے انور حسین، علی احمد بروہی، امجد اسلام اور گوہر اعجاز خانم، ''نوائے وقت'' کے سیّد شکیل احمد اور ریڈیو پاکستان راولپنڈی کے خالد وقار شامل ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے نوائے وقت اور ہفت روزہ ''حُرمت'' کے عہدہ داران کے سوالوں کے جوابات کے ذریعہ اپنی تمام اسکیموں پر روشنی ڈالی ہر سوال کا جواب دلائل پر مبنی ہے انھوں نے کہا کہ اس عہدہ پر آکر مجھے بہت سی جدید چیزوں کا استعمال کرنا ہے مثال کے طور پر رسم الخط کو الیکٹرانکس اور کمپیوٹر میں لے آئیں پھر بھی دفتری امور کے دیگر شعبۂ مثلاً نوٹنگ، بیرلفنگ سحری، پیرا گرافنگ اور فائل تیار کرنے کے دیگر لوازمات وغیرہ ان موضوعات پر کتابیں لکھوائی جائیں اُس کے لئے الفاظ اور اصطلاحات کا ذخیرہ فراہم کیا جائے اسطرح دفتری اردو بہتر شکل میں نظر آئے گی اور جو چیز استعمال ہوگی وہ خود بخود اپنا راستہ بنائے گی اور اجتماعی مزاج کے سانچے میں ڈھل جائیگی اور جب عوام اس زبان کے استعمال کی طرف قدم بڑھائیں گے تو اردو زبان نہایت خوبصورت اور بے نظیر نظر آئیگی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی قومی زبان اردو کو اعلیٰ مقام دلانے کے سلسلے میں دل وجان سے لگے ہیں۔ انھوں نے جو مفید مشورے پیش کئے ہیں ان کے ایک ایک لفظ میں اردو زبان اور قومی یکجہتی اور وطن کی محبت کا عکس نظر آتا ہے۔

معاصرادب

تنقید کا خیال آتے ہی ہمارے ذہن میں غیر دلچسپ مضامین کا تصور آجاتا ہے۔ کیونکہ یہ خیال عام ہے کہ تنقید نگاری ادب کا خشک ترین حصّہ ہے۔ لیکن اس خیال کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے غلط ثابت کردیا ہے۔ انکے تنقیدی مضامین قاری کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ مشکل سے مشکل بات بھی آسان الفاظ میں کہہ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ ''ڈاکٹر جمیل جالبی نے تنقید کو اپنے تخلیقی اور فکری عمل کا حصّہ بنایا ہے۔ وہ ایسی تنقید کو جو صرف ادب کے دائرے میں گردش کرتی ہے۔ قبول کرنے سے گریزاں ہیں۔ انکا ایک اساسی مؤقف یہ بھی ہے کہ تنقید کا مقصد نئے خیالات کی دریافت اور تجزیہ ہے۔'' [۱]

یہ بات بڑی حد تک ٹھیک ہے انھوں نے اپنی تنقید میں ادب کے ساتھ سائنس۔ اور بچوں کا ادب تقریباً ہر طرح کے موضوع پر لکھا ہے۔ ''معاصر ادب'' میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ننانوے مضامین لکھے ہیں۔ اس میں ہر طرح کا موضوع شامل کیا گیا ہے۔ یہ ادبی، تنقیدی وفکری مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں صحافت، افسانہ نگاری، شاعری، ناول نگاری، بچوں کا ادب، نعت گوئی، لطیفہ بازی، مشاعرہ، سوانح نگاری، طنز ومزاح اور فارسی شعراء کو اپنے مضامین کا حصّہ بنایا ہے۔

ڈاکٹر قاضی عبدالقادر پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ ''ڈاکٹر جمیل جالبی کے ساڑھے چارسو صفحات اور ننانوے مضامین پر مشتمل اس مجموعہ سے رابطہ کرنا دراصل عصری ذہن، معاشرہ اور سوچ سے اپنا رشتہ استوار کرنا ہے۔ جالبی صاحب کے یہاں لفظ کا استعمال، موضوع کا انتخاب، ادبی اور سماجی رویّوں کا تجربہ اور مسائل پر گرفت ان کے سماجی شعور کی علامت اور ان کی شناخت بن گئی ہے [۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی کے ''معاصر ادب'' میں سب سے پہلے پیش لفظ ہے۔ جو ڈاکٹر قاضی عبدالقادر نے تحریر کیا ہے۔ اس کا عنوان ''لفظ آگاہ، عصر آگاہ: ڈاکٹر جمیل جالبی'' ہے۔ اس کے بعد جو مضامین ہیں انکی فہرست اس طرح ہے۔

۱۔ ڈاکٹر انور سدید مضمون ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔۶،۱۹۹۳ء ص ۲۰۶

۲۔ ڈاکٹر قاضی عبدالقادر مضمون پیش لفظ آگاہ عصر آگاہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، مشمولہ معاصر ادب مصنف ڈاکٹر جمیل جالبی سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۱ء ص ۱۱

۱۔ ادب کی صورتِ حال

۲۔ نئے لکھنے والوں سے

۳۔ صحیح ادبی رویہّ

۴۔ شاعری اور مسائلِ حیات

۵۔ ادب اور جمہوریت

۶۔ اردو لغت گوئی کا تاریخی ارتقا

۷۔ ہائیکو کے بارے میں

۸۔ فنِ تدوین

۹۔ مشاعرے کی روایت

۱۰۔ بچوں کا ادب

۱۱۔ جدید افسانے کے بارے میں

۱۲۔ عزیز احمد: ایک جائزہ

۱۳۔ میراجی: ایک مطالعہ

۱۴۔ حسن عسکری کے افسانے

۱۵۔ افسانہ نگار ابوالفضل صدیقی

۱۶۔ ابوالفضل صدیقی کے آخری لمحات

۱۷۔ جمیلہ ہاشمی کے دو ناول

۱۸۔ جمیلہ ہاشمی کے آخری لمحات

۱۹۔ عصمت چغتائی

۲۰۔ رضیہ فصیح احمد کے افسانے

۲۱۔ مشرف احمد کے افسانے

۲۲۔ آصف فرخی کے افسانے

۲۳۔ نذر الحسن صدیقی کے افسانے

۲۴۔ سر سید احمد خاں

۲۵۔ شبلی نعمانی

۲۶۔ اکبر الہ آبادی

۲۷۔ نیاز فتح پوری

۲۸۔ اشتیاق حسین قریشی بحیثیت مؤرّخ

۲۹۔ پاکستانی فکر کی اساس

۳۰۔ تاریخی شعور اور ڈاکٹر قریشی

۳۱۔ اقبال اور تشکیلِ جدید

۳۲۔ مسجد قرطبہ

۳۳۔ اقبال کا پیغامِ عمل

۳۴۔ جوش ملیح آبادی

۳۵۔ جوش کی وفات پر

۳۶۔ جوش کے لطیفے

۳۷۔ فیض احمد فیض

۳۸۔ فیض احمد فیض

۳۹۔ فراق گورکھپوری

۴۰۔ غلام عباس

۴۱۔ رئیس احمد جعفری کی خدمات

۴۲۔ امداد صابری: تاریخ صحافت

۴۳۔ پیر حسام الدین راشدی

۴۴۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی

۴۵۔ مجنوں گورکھپوری

۴۶۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ: ایک تعارف

۴۷۔اعجاز الحق قدوسی

۴۸۔اے کے بردہی کی یاد میں

۴۹۔میر علی احمد خان تالپور

۵۰۔صادقین کے بارے میں

۵۱۔محمد نقوش کے بارے میں

۵۲۔مولانا ماہر القادری

۵۳۔ابراہیم جلیس

۵۴۔کامل القادری مرحوم

۵۵۔ڈاکٹر ایوب قادری

۵۶۔ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان: ایک تعارف

۵۷۔اختر حسین رائے پوری: گردِ راہ

۵۸۔مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: ایک تعارف

۵۹۔ڈاکٹر سہیل بخاری: ایک تعارف

۶۰۔بچوں کی شاعری: محشر بدایونی

۶۱۔بچوں کی نظمیں: شان الحق حقی

۶۲۔نعت گوئی: احمد سہارنپوری

۶۳۔قومی شاعری: منظر ایوبی

۶۴۔اردو گیت: ڈاکٹر بسم اللہ نیاز

۶۵۔جدید مرثیہ: ڈاکٹر یاور عباس

۶۶۔سلیم احمد کے بارے میں

۶۷۔صبا اکبر آبادی کی غزل

۶۸۔فارسی رباعیاتِ غالب کا اردو ترجمہ

۶۹۔ضیا جالندھری کی شاعری

۷۰۔قمر جمیل کے بارے میں ۷۱۔صمد انصاری کی غزل

۷۲۔پرتو روہیلہ اور ان کی شاعری

۷۳۔راشد مفتی کی غزل

۷۴۔صادق نسیم کی غزل

۷۵۔افسر ماہ پوری کی غزل

۷۶۔جمیل عظیم آبادی کی غزل

۷۷۔غنی دہلوی کی غزل

۷۸۔صابر ظفر کی غزل

۷۹۔''بے جواز'' کے حوالے سے

۸۰۔بات سے بات: نصر اللہ خان

۸۱۔تاریخ ادب انگریزی: ڈاکٹر احسن فاروقی

۸۲۔عمرِ گذشتہ کی کتاب: مرزا ظفر الحسن

۸۳۔پاکستان کی شخصیات: نور الصباح بیگم

۸۴۔یادوں کا جشن: کنور مہندر سنگھ بیدی

۸۵۔طنز و مزاح کی شاعر: شہباز امروہوی

۸۶۔ماحول اور شاعری: نظر حیدر آبادی

۸۷۔تذکرہ سخنورانِ کاکوری

۸۸۔معاصر شعراء کا تذکرہ: سخن ور

۸۹۔تذکرہ ماثر الکرام

۹۰۔دیوانِ غالب کا پنجابی ترجمہ

۹۱۔نظیر خوانی

۹۲۔غیر منقوطہ نثر: ہادیِ عالم

۹۳۔غیر منقوطہ شاعری: مصدرِ الہام

۹۴۔ رحمٰن بابا کا پیغام　　۹۵۔ شاہ لطیف بھٹائی کی شاعری کے نئے گوشے

۹۶۔ نظام الملک میر عثمان علی خان کی خدمات　　۹۷۔ قاضی خلیق مورائی

۹۸۔ حافظ شیرازی　　۹۹۔ نصرتی کی فارسی غزل

ان تمام مضامین میں سے چند مضامین کا حوالہ دیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''ادب کی صورتِ حال'' کے بارے میں لکھا ہے۔

''اپنے دور کے ادب کا مربوط مطالعہ کیجئے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ یہ وہ ادب نہیں ہے۔ جس میں اپنے زمانے کی روح کارفرما ہوتی ہے۔ اور جس سے ہم زمانے کو پہچانتے ہیں۔ یہ ویسا ادب بھی نہیں ہے۔ جیسا وہ ہوسکتا تھا یا ہونا چاہیئے تھا۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ادب، زندگی کے دھارے پر بہتے ہوئے، سچائیوں کے اظہار سے پیدا ہوتا ہے۔ ۱۹۵۸ء کے بعد سے عام طور پر ہمارا ادیب تعلقاتِ عامہ کے راستے پر چل پڑا ہے اور اپنا معاشرتی درجہ بڑھانے کے لیے ادب کو استعمال کر رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ادب اور فکر و خیال اب منزل نہیں بلکہ محض شہرت حاصل کرنے کا وسیلہ بن گئے ہیں۔''[۱]

''شاعری اور مسائلِ حیات'' کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''جب میں شاعری کی بات کرتا ہوں تو مسائلِ حیات کے تعلق سے اس میں دو سطحوں کا ہونا لازمی ہے۔ ایک سطح یہ ہے کہ مسائلِ حیات کے تعلق سے جب آپ شعر پڑھیں تو آپ کی توجہ اس مسئلہ کی طرف جائے جس کا اشارہ اس شعر میں اس نداز سے کیا گیا ہے کہ بات آپ کے دل میں اُتر گئی ہے۔ یہ وہ سطح ہے جو شاعر کے ہم عصر انسانوں اور خود شاعر کے لیے یکساں اہمیت کی حامل ہیں۔ ہر بڑے شاعر کے ہاں شعر کی دو سطحیں ہوتی ہیں ایک وہ سطح جس سے وہ اپنے دور کی ترجمانی کرتا ہے۔ دوسری وہ سطح جو اس کے عہد سے ماوراہوتی ہے۔''[۲]

''فنِ تدوین'' میں لکھا ہے کہ ''فن تدوین ایک ایسا موضوع ہے جس پر ہمارے ہاں بہت کم لکھا گیا ہے اور اب تک اس کے اصول و ضوابط اس طور پر

۱، ۲ معاصر ادب، ڈاکٹر جمیل جالبی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۱ء ص ۱۷، ۳۰

مدوّن نہیں ہو سکے کہ سب یکساں طور پر ان اصولوں پر عمل کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ املا، رموزِ اوقاف اور اصطلاحاتِ تراجم کی طرح یہ مسئلہ بھی قومی سطح پر ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ معذرت کے ساتھ یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ہم بحیثیت قوم مسائل کو سلجھانے کے بجائے الجھانے کا کام زیادہ تن دہی اور دل لگا کر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود قومی زبان کا مسئلہ بھی آج تک ہم نے وجہ بے وجہ الجھا رکھا ہے۔ مسئلہ تو صرف اتنا سا ہے کہ قومی زبان کو دفتری زبان اور ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال ہونا چاہیے تاکہ اظہارِ مدعا کا مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حل ہو جائے۔"[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے مضمون "حسن عسکری کے افسانے" میں لکھا ہے۔

"عسکری بحیثیت افسانہ نگار ہمیشہ قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے رہے۔ ان کے افسانے جدید اردو افسانے کی تاریخ کا ناگزیر حصہ ہیں۔ "شعور کی رو" وہ بنیادی تکنیک ہے جسے عسکری نے نہ صرف متعارف کرایا بلکہ نہایت خوبی سے نبھا کر اردو فکشن کے لیے نیا۔ راستہ کھولا اور اردو افسانے کو مغرب کے دائرے میں داخل کر دیا۔ "حرامجادی" (۱۹۴۰ء) اور "چائے کی پیالی" (۱۹۴۱ء) اس تیکنیک کے واضح اثرات نظر آئیں گے۔ اردو افسانہ میں حسن عسکری کی یہی تاریخی و تخلیقی اہمیت ہے۔" [۲]

اب جو مضمون ہے اس کا عنوان "جمیلہ ہاشمی کے دو ناول" ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی انکی شخصیت سے متاثر بھی اور انکی ناول نگاری سے خوش تھے۔ جمیلہ ہاشمی کے بارے میں انکا خیال ہے۔

"خوشی کی بات ہے کہ جمیلہ ہاشمی ہمارے لکھنے والوں میں وہ پہلی خاتون ہیں۔ جنھوں نے تاریخ کے حوالے سے اس سفر کا آغاز کر کے ذہن انسانی کے نہاں خانوں میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں وہ لگن ہے جو لکھنے والے کو ہر دم نئے سفر پر آمادہ رکھتی ہے۔ سفر حرکت کی علامت ہے۔ ان جانی دنیاؤں کو جاننے کی خواہش کا نام ہے۔ تخلیقی زندگی کا استعارہ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ آج سے بائیس سال پہلے ان کے افسانے جب ہفت روزہ "لیل و نہار" میں چھپے وہ سب کے سب اچھے لگتے تھے۔[۳]

---

[۱]، [۲]، [۳]۔ معاصر ادب، ڈاکٹر جمیل جالبی، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۱ء ص ۵۲/۱۰۲۔ ۱۰۳/۱۱۸

مضمون ''شبلی نعمانی'' میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے انکی شخصیت کو سر سیّد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دیکھایا۔

''۱۸۵۸ء میں سر سیّد احمد خاں کی عمر ۴۰ سال کی تھی اور شبلی نعمانی اسی سال پیدا ہوئے تھے۔ جب ۱۸۷۵ء میں سر سیّد نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا تو یہ دراصل برعظیم میں مسلمانوں کی نئی زندگی کا پہلا مرکز تھا۔ ۱۸۸۲ء میں شبلی نعمانی کی عمر تقریباً ۲۵ سال تھی۔ وہ علی گڑھ گئے۔ سر سیّد سے ملے اسی سال کالج سے وابستہ ہو گئے اور ۱۸۹۸ء میں جب سر سیّد کا انتقال ہوا شبلی کالج سے الگ ہو کر اپنے وطن اعظم گڑھ آ گئے۔ شبلی سر سیّد کے خیالات سے حد درجہ متاثر تھے۔ سر سیّد کی طرح مسلمانوں کی ترقی و عروج کے خواہاں تھے۔'' [۱]

''اکبر الہ آبادی'' کی شخصیت پر کچھ اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

''اکبر الہ آبادی کے بارے میں عام طور پر یہ کہا اور سمجھا جاتا ہے کہ وہ مزاح نگار ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے لیکن صرف ایک حد تک۔ مزاح دراصل اکبر کے لیے اپنی بات کو عوام و خواص تک پہنچانے کا ایک وسیلہ ہے تا کہ لوگ ان کی بات کو دلچسپی سے سن کر لطف اندوز ہوں اور اثر قبول کریں اکبر کے مزاح میں ایک جہت، ایک زاویۂ نظر ہے۔ اس جہت کی وجہ یہ ہے کہ بّرصغیر میں انگریزوں کے غلبے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ وہ تہذیب جس نے ایک ہزار سال کے سفرِ حیات میں ایک صورت بنائی تھی وہ ٹوٹ رہی ہے۔ وہ المیہ پیدا ہوگا کہ مسلمان اپنے تہذیبی نظام سے ہٹ کر نہ صرف مغلوب ہو جائیں گے بلکہ اپنی حقیقی تخلیقی قوت بھی گنوا دیں گے۔ جب انھوں نے اس بات کو محسوس کر کے تہذیب مغرب کی مخالفت کی تو انھیں رجعت پسند کہا گیا۔ دراصل سر سیّد اور اکبر ہماری قومی زندگی کے دو الگ الگ دھارے ہیں۔ [۲]

''اقبال اور تشکیلِ جدید'' میں لکھا ہے کہ ''پاکستان میں اقبال پر بہت کام ہوا ہے اور سینکڑوں چھوٹی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اگر ادبیاتِ اقبال کا جائزہ لیا

---

۱ ۲ ۳ معاصر ادب، ڈاکٹر جمیل جالبی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۱ء ص ۱۵۴۔۱۵۵/۱۵۸

جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان میں سے بیشتر کتابوں کی حیثیت دراصل توضیحی نوعیت کی ہے اور انھیں ہم زیادہ سے زیادہ تفہیمِ اقبال کے سلسلے میں ''حواشی'' کا نام دے سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم فکرِ اقبال کا تنقیدی جائزہ لیتے ، اس سے آنکھیں چار کر کے اس طور پر چھان بین کرتے کہ فکرِ اقبال کی روایت وہاں سے آگے بڑھ سکتی جہاں خود اقبال نے اُسے چھوڑا تھا۔''[۱]

علامہ اقبال جیسے عظیم شاعر کی روایت کو جس حد تک آگے بڑھایا جاتا کم تھا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی اقبال کے معاملے میں سوچ ٹھیک ہی ہے۔ اگلا مضمون ''جوش ملیح آبادی'' ہے۔

''جوش صاحب باغ و بہار انسان تھے۔ محفل میں بیٹھتے تو ایسے کہ سب کی توجہ کا مرکز بن جاتے اور محفل کو ایسے سجاتے کہ سب عالمِ محویت میں آجاتے۔ ساری عمر یوں ہی بسر کی۔ از سرتاپا شاعر تھے۔ روشن دماغ بھی تھے اور وسیع القلب بھی۔ ۱۹۲۰ء میں جب جوش ملیح آبادی کا پہلا مجموعہ ''روحِ ادب'' کے نام سے شائع ہوا تو اکبرالہ آبادی نے لکھا کہ '' آپ نے چشم بددور عمدہ طرز بیان پایا ہے۔ باسی سوسائٹی میں رہ کر ایسے خیالاتِ عالی حیرت افزا ہیں۔'' آج جوش کو ہم نے صرف لفظوں کی گھن گرج کا شاعر سمجھ لیا ہے حالانکہ ان کی شاعری میں وہ تنوع اور رنگا رنگی ہے کہ اس صدی کے چند شاعر ہی انکے مرتبے کو پہنچتے ہیں۔''[۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ادیب و شاعر کے ساتھ ساتھ صحافیوں پر بھی قلم اٹھایا ہے۔

''رئیس احمد جعفری کی خدمات'' میں لکھا ہے۔ ''رئیس احمد جعفر ایک اچھے ادیب لیکن مثالی صحافی تھے۔ ادیب صرف اپنے موضوعات پر سوچتا اور لکھتا ہے۔ صحافی بھی زندگی کے دائرے میں کام کرتا ہے لیکن اس میں ایسی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اس موضوع پر کم وقت میں لکھنے کی قوت رکھتا ہے جو اسے دیا جائے اور پڑھنے والا جب اس تحریر کو پڑھے تو مطمئن ہو جائے۔ مثالی صحافی کے ہاں اسی لیے موضوعات کا تنوع ہوتا ہے، پھیلاؤ ہوتا ہے۔ میں جب رئیس احمد جعفری صاحب کو مثالی صحافی کہتا ہوں تو اس کے ثبوت میں ان کی تحریروں کے تنوع اور پھیلاؤ کو

۱، ۲ معاصر ادب، ڈاکٹر جمیل جالبی، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۱ء ص ۲۰۲/۲۰۲

پیش کرتا ہوں۔ اور یہ وہ تحریریں ہیں۔ جو بہت کم وقت میں لکھی گئی ہیں۔ وہ ناول نگار بھی تھے۔ اور مترجم بھی۔ سوانح نگار بھی تھے اور مورخ بھی، مذہبی موضوعات پر بھی لکھتے تھے اور سیاسی موضوعات پر بھی۔ رئیس احمد جعفری کا قلم ہمیشہ زندہ و تازہ رہا۔"[۱]

آگے مضمون "اختر حسین رائے پوری" ہے۔ اس میں اختر حسین کی خودنوشت "گرد راہ" کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے۔

"گرد راہ" اس اعتبار سے اردو زبان میں ایک مختلف خودنوشت ہے گرد راہ کی خوبی یہ کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنی پوری زندگی کے حالات، اپنے تجربات و مشاہدات کو انتہائی دھیمے انداز میں انکسار و معروضیت کے ساتھ انا پرستی اور خود پروری سے بچ کر، اس سادگی سے بیان کیا ہے کہ یہ خودنوشت ناول سے زیادہ دلچسپ اور زندگی سے زیادہ حقیقی بن گئی ہے۔ "گرد رہ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ پوری کتاب میں ہمیں ایک جہت، ایک زاویئے کا احساس ہوتا ہے۔"[۲]

اگلا مضمون "نعت گوئی: احمد سہار نپوری" ہے۔ اس میں نعت اور میلاد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ احمد سہار نپوری نے اپنی شاعری میں نعتیں اور سلام لکھے ہیں۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی

"میں بی۔اے۔ کا طالب علم تھا۔ یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے کہ حضرت احمد کا مجموعۂ کلام "ہلال یثرب" کے نام سے شائع ہوا اور میں نے اسی زمانے میں پڑھا۔ ان کا "سلام" تو اتنا مقبول تھا کہ ہر گھر میں میلاد کے موقع پر پڑھا جاتا تھا۔ احمد صاحب غریب سہار نپوری کے شاگرد تھے۔ اور نصرت قریشی احمد صاحب کے شاگرد تھے۔ احمد سہار نپوری کا کلام عام روزمرہ کی زبان میں لکھا گیا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔"[۳]

"صمد انصاری کی غزل" میں لکھا ہے۔ "صمد انصاری کا کلام پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ غزل کی روایتی علامات و رمزیات کو ایک نئی وسعت دے رہے

---

۱ ۲ ۳ معاصر ادب، ڈاکٹر جمیل جالبی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۱ء ص ۲۳۱/۲۹۲/۳۰۶۔۳۰۷

ہیں اور خدا، کائنات اور انسان کو اس نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ جہاں لاانتہاؤں میں مسلسل بڑھتی پھیلتی کائنات ہر دم بدل رہی ہے۔ آج جب سائنس انسان کا ذہن، اس کی سوچ اور اس کا رُخ بدل رہی ہے اور ہم سب چیخنے چلّانے اور واویلا کرنے کے باوجود رفتہ رفتہ اس کے آغوشِ حسن میں آرہے ہیں، صمد انصاری کی شاعری ہمیں اس تبدیلی کا شعور عطا کر کے ہمارے ذہن کے بند دریچوں کو کھول رہی ہے۔"[۱]

اب جو مضمون ہے وہ تاریخ ادب پر لکھا گیا ہے۔ اس کا عنوان "تاریخ ادب انگریزی: احسن فاروقی" ہے۔ یہاں احسن فاروقی کی ادبی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے۔ "پروفیسر ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نہ صرف اردو ادب کے بڑے نقاد، بڑے افسانہ نگار اور بڑے ناول نگار تھے بلکہ برعظیم پاک و ہند میں انگریزی ادب کے ایسے استاد بھی تھے جو اپنے وسعتِ علم، کثرتِ مطالعہ اور دلنشِ انداز درس و تدریس کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی اردو، انگریزی، فارسی، عربی کے علاوہ فرانسیسی، جرمن، لاطینی و یونانی زبانوں سے بھی واقف تھے۔ اب تک اردو زبان میں انگریزی ادب کی کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی گئی جسے مستند کہا جاسکے۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر احسن فاروقی کی زیرِ نظر کتاب "تاریخ ادب انگریزی" پہلی تاریخ ہے، جسے انگریزی ادب کے ایک رازدان نے اردو زبان میں لکھا ہے۔ اس کتاب میں جو مواد اور زاویۂ نظر پیش کیا گیا ہے وہ فاروقی صاحب کے پچاس سال کے گہرے مطالعے اور درس و تدریس کے وسیع تجربے کا نچوڑ ہے۔"[۲]

اب مضمون "معاصر شعراء کا تذکرہ: سخن ور" ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے۔

"سلطانہ مہر ہمارے ملک کی نامور صحافی، معروف افسانہ نگار، ناول نگار اور شاعرہ ہیں۔ وہ برسوں تک روزنامہ "جنگ" کا صفحۂ خواتین مرتب کرتی رہی ہیں۔ انکے چار ناول داغِ دل، تاجور، اک کرن اجالے کی، جب بسنت رُت آئی شائع ہو چکے

---

۱ ۔ ۲۔ معاصر ادب، ڈاکٹر جمیل جالبی، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۱ء ص ۳۴۰/۳۸۳۔۳۸۴

ہیں، ''آج کی شاعرات اور اقبال دورِ جدید کی آواز'' انکی مرتب کی ہوئی کتابیں ہیں ان کی تازہ ترین تالیف ''سخن ور'' ہے۔ جس میں سلطانہ مہر نے عہد حاضر کے شاعروں کے انٹرویو اس طور پر مرتب کیئے ہیں۔ کہ یہ کتاب جدید شاعروں کا ایک تذکرہ بن گئی ہے جس میں ہر شاعر کے بارے میں مفید معلومات بھی درج ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ایک دلچسپ کتاب ہے۔''[۱]

اگلا مضمون ''رحمٰن بابا کا پیغام'' ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ

''غور کیجئے تو آپ بھی میری طرح اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ مرنا برحق ہے۔ لیکن وہ لوگ جو زندگی میں اچھے اچھے کام کرتے ہیں۔ زندگی میں جن کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ وہ لوگ رحمان بابا کی طرح مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ اسی لیے آج یوم رِحمان بابا مناتے ہوئے آپ کو بھی میرا یہی مشورہ ہے۔ کہ آپ بھی زندگی میں ایسے کام کریں جن سے آپ کا نام روشن ہو۔

رحمٰن بابا نے کہا تھا:

غفلت کی نیند سے جاگ اٹھو
کب تک اونگھتے رہو گے
ہر وقت دعا اور درود میں مشغول رہو
آدمی کے ظاہر لباس سے دھوکا نہ کھانا
اس کے باطن کو دیکھو کہ پر مغز ہے یا بے مغز ہے۔[۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال اور مشورہ بہت بہتر ہے رحمٰن بابا کی شاعری پر عمل کر کے انسان رہتی دنیا تک زندہ رہ سکتا ہے۔

آخری مضمون ''حافظ شیرازی'' کے نام سے ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی

'حافظ شیرازی دنیائے ادب کے چند عظیم شاعروں میں سے ایک ہیں۔ ان کا اثر دنیا کی بیشتر زبانوں کے ادبیات نے قبول کیا ہے اور برصغیر کے ادبیات اور بالخصوص اردو شاعری پر تو اُن کا اثر بہت واضح اور گہرا ہے۔ حافظؔ کی زندگی ہی میں ان کی شہرت برصغیر تک پہنچ چکی تھی۔ حافظؔ شیرازی برصغیر کی مسلم تہذیب کا

[۱، ۲] معاصر ادب، ڈاکٹر جمیل جالبی، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۱ء ص ۳۱۸، ۳۳۰۔۳۳۱

ایک اہم حصہ ہیں۔ جیسے امیر خسرو عوام و خواص کی تہذیب میں خون کی طرح گردش کر رہے ہیں۔ اسی طرح حافظ شیرازی خواص کی تہذیب کا سرمۂ چشم بن کر نور کو دوبالا کر رہے ہیں۔"[1]

اس کتاب میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے تنقیدی قلم کے ذریعے اردو ادب کے ساتھ ساتھ فارسی شاعروں کی بھی ادبی زندگی پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

---

[1] معاصر ادب، ڈاکٹر جمیل جالبی، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۱ء ص ۳۵۹

باب چہارم

(جمیل جالبی کے ترجمے)

جانورستان

(جارج آرول کا شہرۂ آفاق ناول)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے جارج آرول کی کتاب اینیمل فارم کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ سب سے پہلے ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کا ترجمہ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا اس ناول نے کافی مقبولیت پائی۔

اینیمل فارم میں روس کے مزدوروں پر کیے گئے مظالم اور زیادتیاں بیان کی گئی ہیں۔ انسان کو جاگیر دار دکھایا گیا ہے۔ اور مزدوروں کو جانوروں کی شکل میں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ مزدوروں کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔

کتاب کے مقدمہ میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے لکھا ہے

> ''اینیمل فارم کوئی علمی اور خشک مقالہ نہیں ہے۔ نہ یہ کسی روسی کی سرگذشت ہے، یہ بظاہر ایک کہانی ہے جو حقیقت کی آئینہ دار ہے اور انصاف کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہے۔ اگر اس میں کارل مارکس اور روسی زعما کے عمل میں تفاوت کو نمایا کیا گیا ہے تو فرسودہ جاگیرداری کی خرابیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔'' [۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے شروع میں جو تصویر کھینچی ہے وہ اس طرح ہے۔

> ''میز فارم کے مالک مسٹر جونز نے رات کے وقت مرغیوں کو ڈربے میں بند کیا۔ وہ شراب کے نشہ میں دُھت ڈربے کی چٹخنی لگانا بھول گیا۔ جیسے ہی سونے کے کمرے کی روشنی گل ہوئی باڑہ کی پوری عمارت میں زندگی کے آثار پیدا ہونے شروع ہوئے۔ دن میں یہ بات پھیل چکی تھی کہ بوڑھے میجر نے کل رات ایک عجیب وغریب خواب دیکھا ہے۔ اور وہ اسے تمام جانوروں کو سنانا چاہتا ہے یہ بات طے پا چکی تھی کہ مسٹر جونز کے سونے کے بعد سب کے سب بڑے کھلیان میں جمع ہو جائیں گے۔'' [۲]

---

۱ ۲ جانورستان، مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی، مکتبہ نیا دور کراچی ۱۹۵۸ء ص ۵ ـ ۶ / ۹ ـ ۱۰

جانوروں کی اس میٹنگ سے یہ بات سامنے آجاتی ہے۔ کہ ان کے اندر یونین بنانے کی صلاحیت موجود تھی بس ایک صدر کی ضرورت تھی، بوڑھے میجر کی شکل میں وہ اپنی یونین کا صدر مقرر کر چکے تھے، اس میٹنگ میں نشست کا انداز بھی انوکھا اور سلیقے کا ہے۔ جس جانور کی جو حیثیت ہے وہ اسی جگہ پر بیٹھا ہے۔ سب سے آگے میجر بیٹھا تھا اور اس کے بعد سور بیٹھے تھے۔ باقی جانور پیچھے تھے۔ یعنی میجر کیونکہ بارہ سال کا تھا۔ سینئر بزرگ ہونے کہ وجہ سے وہ عزت کے قابل تھا۔ اسکی بات سب مانتے تھے۔ یہ بات اسکی تقریر سے ظاہر ہوتی ہے۔

> ''ساتھیوں! ہماری اس زندگی کی نوعیت کیا ہے۔ سنو ہماری زندگیاں قابلِ رحم سخت اور مختصر ہیں۔ ہم پیدا ہوئے ہیں۔ ہمیں صرف اتنا کھانے کو دیا جاتا ہے کہ ہم مرنے نہ پائیں۔ ہم میں سے وہ جو محنت رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ آخر دم تک کام کرنے پر مجبور کئے جاتے ہیں۔ جیسے ہی ہماری افادیت ختم ہو جاتی ہے اور ہم محنت کرنے کے قابل نہیں رہتے ہمیں انتہائی بے رحمی سے ذبح کر دیا جاتا ہے۔ انگلستان میں کوئی جانور آزاد نہیں ہے یہ حقیقت ہے کہ جانوروں کی زندگی مسلسل ایک عذاب اور غلامی بن کر رہ گئی ہے۔'' [1]

اس ناول میں آگے یہ دیکھایا گیا ہے کہ میجر تو مر جاتا ہے۔ مگر اس کی تقریر کا اتنا اثر ہوتا ہے کہ ایک دن سارے جانور مالک کے ظلم سے تنگ آکر بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس بغاوت کو نئے انداز میں ڈھالا گیا ہے اور ایسے ایسے لطیف طنز و مزاح کا رنگ دیا ہے کہ پڑھنے والے کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔

بغاوت کے بعد جو آزادی انھیں میسر ہوئی ہے اسکو ایسے پیرائے میں دکھایا گیا ہے کہ جب کسی کو اپنی کھوئی ہوئی چیز ملتی ہے تو وہ خوشی سے پاگل ہو جاتا ہے۔

> ''اگلے دن وہ علی الصبح حسبِ معمول اٹھ بیٹھے۔ اور اپنی شاندار کامیابی کے تصور سے ناچنے اور دوڑنے لگے مرغزارے سے ذرا نشیب میں ایک ٹیلا تھا۔ تمام جانور اس ٹیلے پر چڑھ گئے۔ اور سارے باڑے کا جائزہ لینے لگے'' ہر نظر آنے والی چیز ان کی تھی''۔ وہ گھاس پر لوٹے۔ انھوں نے منہ بھر بھر کر گرمیوں کی میٹھی میٹھی

---

[1] جانورستان، مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی، مکتبہ نیا دور کراچی ۱۹۵۸ء ص ۱۲

گھاس کو اپنے دانتوں سے کترا۔''[۱]

آزادی کا جشن منانے کے بعد انھوں نے اپنی زندگی کے کچھ قانون بنائے۔ جن پر سب کو عمل کرنا تھا۔

۱۔ وہ جو دو ٹانگوں پر چلتا ہے دشمن ہے۔

۲۔ وہ جو چار ٹانگوں پر چلتا ہے یا پر رکھتا ہے دوست ہے۔

۳۔ کوئی جانور کپڑے نہیں پہنے گا۔

۴۔ کوئی جانور بستر پر نہیں سوئے گا۔

۵۔ کوئی جانور شراب نہیں پیئے گا۔

۶۔ کوئی جانور دوسرے جانور کو نہیں مارے گا۔

۷۔ سب جانور برابر ہیں۔

جس طرح انسانوں میں فطرت ہوتی ہے اسی طرح جانوروں میں بڑے چھوٹے کا فرق موجود ہے۔ سوروں کی اہمیت زیادہ ہے وہ دانش منداور پڑھے لکھے ہیں۔ باقی جانور کمزور ہیں اس لئے ان سے خوب کام لیتے ہیں۔ عیش و آرام کا جھوٹا عدہ کرتے ہیں۔ جس طرح یونین کا صدر مزدوروں سے نعرہ لگواتا ہے۔ اسی طرح سور غریب بھیڑوں کو چند جملے یاد کراتا ہے۔ جو وہ ہمیشہ احتجاج کے طور پر بولتی ہیں۔

چار ٹانگیں اچھی۔ دو ٹانگیں خراب

ناول کے دو کردار بہت اہم ہیں سنو بال اور نپولین سارے جانور انکی بات مانتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ان دونوں کی ہوس بڑھنے لگی دودھ اور سیب کو یہ ہی اپنے کھانے میں استعمال کرتے تھے۔ اگر دوسرے جانور احتجاج کرتے تھے تو ان کو یہ سمجھایا جاتا تھا۔ کہ سور دماغ کا کام کرتے ہیں اس لئے انھیں اچھا کھانا ضروری ہے۔ آخر میں ان دونوں میں بھی اختلاف ہوگیا۔ یہ اختلاف پون چکی کو لے کر تھا۔ اس کا منظر کچھ اس طرح بیان کیا گیا۔

''جب جانور کھلیان میں جمع ہو گئے سنو بال کھڑا ہوا اور پون چکی کی تعمیر کے سلسلے میں اپنے دلائل پیش کئے۔ جب سنو بال تقریر ختم کر چکا تو ان کا جواب دینے کے لئے نپولین کھڑا ہوا۔ اس نے بڑے سکون کے ساتھ اس بات پر زور دیا کہ پون چکی کا منصوبہ مہمل ہے اور وہ ہر جانور کو مشورہ دے گا کہ وہ اس کی موافقت میں

---

[۱] جانورستان، مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی، مکتبہ نیا دور کراچی ۱۹۵۸ء ص ۲۹

رائے نہ دے۔''[۱]

اس بحث کو دیکھنے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ جانوروں میں بھی انسان کی ہر فطرت موجود ہے۔ انھیں بھی کرسی یا لیڈر شپ کا موقع ملے گا تو وہ بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔

ناول کا خاتمہ اس بات پر ہوا ہے کہ جب سوروں کو تمام جانوروں کے مقابلے میں نمایا حیثیت حاصل ہو گئی تو انھوں نے بھی بڑے چھوٹے کا فرق شروع کر دیا انھیں بھی اپنی حیثیت کا غرور ہو گیا۔ وہ سب سے الگ مقام پر رہنے لگے۔ باقی جانوروں کو سور اور انسان ایک شکل میں نظر آنے لگے۔

> بقول اشتیاق حسین قریشی کہ ''اس کتاب کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ افراد کے کسی انبوہ کا حوصلہ کتنا ہی بلند اور مطمح نظر کیسا ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو، اگر اس میں سیاسی فراست، معاملہ فہمی اور ادراک وجود نہیں ہیں تو وہ ضرور خود غرض لیڈروں کی آمریت کا شکار ہوگا اور اپنی آزادی اور نصب العین دونوں گنوا بیٹھے گا۔'' آگے لکھتے ہیں کہ ''جناب جمیل جالبی نے اس کتاب کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ ہمارے ادب میں ابھی تک طنز کا سرمایا بہت کم ہے اس لئے یہ ترجمہ اردو کی خدمت ہے۔''[۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی کی ترجمہ نگاری سے اردو زبان و ادب کو بہت فیض پہنچا ہے۔

---

۱ ۲ جانورستان، مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی، مکتبہ نیا دور کراچی ۱۹۵۸ء ص ۵۹ / ۷

ایلیٹ کے مضامین

اردو ادب میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایلیٹ کے مضامین کا ترجمہ کر کے ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ اور ہماری تنقید نگاری کو ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ خاص طور سے ان لوگوں کے لئے یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے، جو انگریزی سے نابلد ہیں۔ ''ایلیٹ کے مضامین'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۰ء میں نکلا تھا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۱۴ مضامین شامل ہیں۔ جبکہ پہلے میں صرف نو مضامین تھے۔ پہلے ایڈیشن میں جو ترجمے میں غلطیاں بتائی گئیں تھیں۔ ان کو صحیح کر دیا گیا ہے۔

> ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا خیال ہے کہ ''دوسرے ایڈیشن کا سب سے زیادہ نمایاں حصّہ ''پہلا حصّہ'' ہے۔ اس میں ۷۴ صفحے ہیں جن میں ایلیٹ کا مطالعہ بحیثیت نقاد، بحیثیت شاعر، بحیثیت ڈرامہ نگار مفصّل طریقے پر، مگر ضروری اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے اور آخر میں ایلیٹ کا ادبی مقام مقرر کیا گیا ہے۔ ٹی. ایس. ایلیٹ کا اندازہ لگانے کے لئے یہ بہترین مقدمہ ہوسکتا ہے۔ ٹی. ایس. ایلیٹ اپنی تنقید کو اپنی شاعری کے کارخانے کو ضمنی پیداوار بتاتا ہے مگر جالبی صاحب اس سلسلے میں کہتے ہیں: ''اس کی تنقید اس کی شاعری کا ایک ذیلی حصّہ نہیں ہے بلکہ شاعری سے الگ ایک زندہ سرگرمی ہے۔'' غرض پہلے حصّے کے اضافے سے مضامین کو مکمل طریقے پر سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔[1]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''ایلیٹ کے مضامین'' میں سب سے پہلے پیش لفظ چوتھا ایڈیشن پھر پیش لفظ پہلا ایڈیشن اس کے بعد پہلا حصّہ ٹی. ایس. ایلیٹ ایک مطالعہ، دوسرا حصّہ ایلیٹ کے مضامین، کتابیات اور مختصر سوانح ایلیٹ پیش کی ہیں۔ پہلا حصّہ ٹی۔ ایس. ایلیٹ: ایک مطالعہ میں ڈاکٹر جالبی نے ایلیٹ کو بحیثیت نقاد، بحیثیت شاعر، بحیثیت ڈرامہ نگار اور ایلیٹ کے ادبی مقام کو بیان کیا ہے۔

> بحیثیت نقاد بقول ڈاکٹر جمیل جالبی ''ایلیٹ کا تنقیدی شعور بہت لطیف ہے۔ وہ کلاسیکیت کا حامی ہے۔ اس کی تخلیقی صلاحیت اس کے تنقیدی فیصلوں کو اور اس کا تنقیدی شعور اس کی تخلیقی قوت کو غصب نہیں کرتے بلکہ دونوں کو الگ الگ محفوظ

---

[1] ڈاکٹر احسن فاروقی مضمون ایلیٹ کے مضامین مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ موئف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔۶، ۱۹۹۳ء ص ۳۲۰۔۳۲۱

رکھنے اور پرورش پانے میں مدد دیتے ہیں۔''[۱]

ایلیٹ بحیثیت شاعر بقول ڈاکٹر جمیل جالبی ''ایلیٹ کی شاعری 'نئی' ہونے کے باوجود 'عظیم' شاعری کی بہت سی خصوصیات اپنے اندر رکھتی ہے۔ ایلیٹ نے اپنے ایک مضمون میں عظیم شاعر کی تعریف یہ کی ہے کہ اس کے کلام کے الگ الگ حصے اہم نہیں ہوتے بلکہ تمام کلام مل کر ایک ایسا اتحاد پیش کرتا ہے کہ ایک نئی دنیا وجود میں آجاتی ہے۔ خود ایلیٹ کی شاعری اس معیار پر پوری اترتی ہے۔''[۲]

بحیثیت ڈرامہ نگار ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ ''ایلیٹ کے ڈراموں کے بارے میں یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس کے ڈرامے اسکی نظموں کی زیادہ خارجی شکلیں ہیں۔ یہاں بھی موضوعات اور تصوّرات وہی ہیں۔ مرکزی کردار بھی وہی ہیں مگر فرق صرف اتنا ہے کہ ڈراموں میں انھیں زندگی کے تعلّق سے اور زندگی کے درمیان رکھ کر دیکھا گیا ہے۔''[۳]

''ایلیٹ کا ادبی مقام'' میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ ''ایلیٹ کی مثال ہر سنجیدہ ادیب کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہر عظیم ادب کا کام یہ ہے کہ وہ زندگی سے ایسی فارم تلاش کرلے جس میں زندگی کا پورا پورا نقشہ صحیح صحیح اُتر آئے، جو بظاہر وقتی ہو اور واقعاتی ہو مگر قوتِ تخیّل کے ذریعہ آفاقی قدروں سے ہم کنار ہو جائے۔''[۴]

''دوسرا حصّہ'' اس میں ایلیٹ کے ۱۴ مضامین شامل ہیں۔ پہلا ''شاعری کا سماجی منصب'' اس میں شاعری کے عام اور مخصوص منصبوں کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ فلسفیانہ، مذہبی، سیاسی، اخلاقی ناصحانہ شاعری کا منصب فلسفہ، مذہب، سیاست واخلاقیات کے منصب کے ساتھ وابستہ ہے۔

۲۔ ''شاعری کی تین آوازیں'' پہلی آواز وہ آواز ہے جس میں شاعر خود سے بات کرتا ہے یا کسی اور سے نہیں کرتا۔ دوسری آواز اس شاعری کی ہے جو سامعین سے مخاطب ہوتا ہے۔ تیسری آواز اس شاعر کی ہے جب وہ نظم میں باتیں کرنے والے ڈرامائی کردار تخلیق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔''[۵]

۱۔۲۔۳۔۴۔۵ ایلیٹ کے مضامین مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۶، ۲۰۰۰ ص ۲۳/۳۲/۶۵/۳/۹۶/۷

۳۔ ''شاعری کی موسیقی'' ''شاعری کی موسیقی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو معنی سے علیحدہ اپنا وجود رکھتی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو ایسی شاعری بھی ضرور ہوتی جس میں عظیم موسیقانہ حسن تو ہوتا لیکن جس میں مفہوم کچھ نہ ہوتا۔ لیکن اب تک میں نے ایسی شاعری نہ دیکھی ہے نہ سنی ہے۔''[1]

۴۔ ''شاعری اور ڈرامہ'' اس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ڈرامہ میں شاعری کی کیا اہمیت اور ضرورت ہے۔ کیونکہ تھیٹر کے شوقین لوگ شاعری کو پسند نہیں کرتے۔

۵۔ ''شاعری اور پروپیگنڈا'' ''عمومی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی ادب پارے کے حقیقی اثر میں پروپیگنڈا کے عنصر کا انحصار یا تو نظریہ اور اصولوں کی دائمیت پر ہوگا یا پھر ادب پارے کی زمانی قربت پر۔''[2]

۶۔ ''بودلیئر'' ''میرا خیال ہے کہ بودلیئر کی قدر و قیمت اور اس کا مقام متعین کرنے کی مشکلات کے خاص وجوہ ہیں۔ ایک چیز تو یہ کہ بودلیئر کچھ باتوں میں اپنے زمانہ کے نقطۂ نظر سے کافی آگے تھا اور اس کے باوجود شدت سے اپنے زمانے کا ایک جزو تھا اور بڑی حد تک اپنے زمانے کی اچھائیوں، برائیوں اور فیشن میں برابر کا شریک رہا۔''[3]

۷۔ ''روایت اور انفرادی صلاحیت'' ''روایت کا معاملہ بہت وسیع اہمیت کا حامل ہے۔ یہ میراث میں نہیں ملتی۔ کوئی شاعر کوئی فن کار خواہ وہ کسی بھی فن سے تعلق رکھتا ہو، تنِ تنہا اپنی کوئی مکمل حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کی اہمیت اور اس کی بڑائی اسی میں مضمر ہے کہ پچھلے شعراء اور فنکاروں سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ الگ رکھ کر اس کی اہمیت متعین نہیں کی جا سکتی۔''[4]

۸۔ ''کلاسیک کیا ہے'' یہاں ادب میں کلاسیک کی کیا اہمیت ہے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کلاسیک اور رومانٹک کا مقابلہ اور فرق کرنے کو منع کیا گیا ہے۔

۹۔ ''مذہب اور ادب'' اس مضمون میں دینی اور اخلاقی باہمی پر زور دیا گیا ہے۔ جس دور میں

۱،۲،۳،۴۔ ایلیٹ کے مضامین مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۲/۱۶۰/۱۶۶/۱۸۴۔۱۸۵

مذہب واخلاق میں اتفاق ہوگا۔ اس دور میں ادب زیادہ اچھا ہوگا۔ بہ نسبت دوسرے دور کے جس میں دین واخلاق میں تفرقہ ہوگا۔

۱۰۔ ''ادب اور عصرِ جدید'' اس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک ادبی فنکار کو اپنے دور کی سماجی ذمہ داریوں کا احساس ہونا چاہیئے۔

۱۱۔ ''صحافت اور ادب'' ''اب صحافت اور ادب کے درمیان کوئی مفید امتیاز صرف ادبی اقدار کی ترازو میں رکھ کر نہیں کر سکتے۔ یہ امتیاز ایک عمدہ تحریر اور ایک انتہائی عمدہ تحریر کے درمیان فرق کرنے سے پیدا نہیں ہوتا۔ ایک دوسرے درجہ کا ناول صحافت نہیں ہے۔ لیکن یقیناً اسے ادب بھی نہیں کہا جا سکتا۔''[۱]

۱۲۔ ''تنقید کا منصب'' اس مضمون میں ادب میں تنقید کی اہمیت اور اس کا منصب بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تنقید کا کام کسی بھی فن پارے کی تفسیر وتشریح کرنا اور اسکی خوبی اور خامی بیان کرنا ہے۔

۱۳۔ ''تجربہ اور تنقید'' ''اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ساری تنقید ان معنی میں ''تجرباتی'' کہی جا سکتی ہے جن معنی میں ہر نسل کے رہن سہن کے اپنے طریقے ایک تجربہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں ان معنی میں 'تجرباتی تنقید' پر اظہار خیال کرکے یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آج نقاد شعوری طور کس قسم کی تنقیدی تحریروں کی کوشش کر رہے ہیں۔''[۲]

آخری مضمون یعنی ''تنقید کے حدود'' ہے۔ ''اس مقالہ کا موضوع یہ ہے کہ آیا تنقید کے کچھ حدود ہوتے ہیں کہ جہاں سے ایک طرف بڑھ کر ادبی تنقید ادبی نہیں رہتی اور دوسری طرف بڑھ کر تنقید ہی نہیں رہتی۔''[۳]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان مضامین کے بعد کتابیات اور ایلیٹ کی مختصر سوانح بھی پیش کی ہے۔ جس میں اسکی پیدائش سے لیکر وفات اس کے درمیان اس کی تعلیم، کام اور کیا پرائز ملے سب کے بارے میں لکھا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے ایلیٹ کو اچھی طرح سے جانا جا سکتا ہے۔

بقول ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ''یہ مانا جا چکا ہے کہ 'ایلیٹ کے مضامین' اسی پایے کے ترجموں میں سے ہیں جو نشاۃ الثانیہ میں نئی روشنی کی بنیاد ٹھہرے۔'' آگے

۱،۲،۳ ایلیٹ کے مضامین مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۶، ۲۰۰۰ ص ۲۵۲/ ۲۷۲/ ۲۹۰

لکھتے ہیں کہ ''ترجمہ اتنا قدرتی، رواں اور انفرادی ہے کہ اسے ''اصل'' تصنیف کہنا چاہیے۔ پڑھنے والوں کو جدید ترین تنقید کی سطح پر لانے میں پوری مدد کرتا ہے اور اس سطح پر جو مسائل سامنے آتے ہیں، ان پر فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔''[۱]

---

[۱] ڈاکٹر احسن فاروقی مضمون ایلیٹ کے مضامین مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ۱۹۹۳ء، ص ۴۲۰

ارسطو سے ایلیٹ تک

ڈاکٹر جمیل جالبی کی یہ کتاب ''ارسطو سے ایلیٹ تک'' ترجمے کی شکل میں سامنے آئی ہے۔ اردو ادب میں اس کا ایک اپنا مقام ہے۔ کیونکہ یہ مغربی تنقید کو مشرقی نقاد اور طالب علم کے لئے آسان بناتی ہے۔ اس کتاب میں یورپ کے عظیم تنقید نگاروں کی تحریریں جمع کی گئیں ہیں۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''جمیل جالبی کا ان سب شاہکاروں کا ترجمہ نپولین کے تمام یورپ کو تسخیر کر لینے سے کم نہیں ہے۔ جمیل صاحب کہنہ مشق مترجم ہیں۔ اور یہاں جو ترجمہ ملتا ہے وہ بڑی اہم خصوصیات کا حامل ہے۔ یہ ترجمہ ایلیٹ کے مضامین والے ترجمہ سے ایک قدم آگے اٹھاتا ہے۔''[۱]

''ارسطو سے ایلیٹ تک'' ایک ایسی کتاب ہے۔ جس میں سب سے پہلے پیش لفظ ہے۔ پھر مقدمہ ہے۔ اس میں تقریباً ۱۸ مصنف ہیں۔ اور ان سب کے مضامین کا ترجمہ شامل ہے۔ جن میں ارسطو۔ بوطیقا، ہوریس۔ فنِ شاعری، لونجائنس۔ علُویت کے بارے میں، دانتے۔ عام بول چال کی زبان کا ادبی استعمال، سر فلپ سڈنی۔ شاعری کا جواز، بولو۔ فنِ شاعری، لیسنگ۔ لاؤکون، گوئٹے۔ ناول اور ڈرامہ کلاسیکیت اور رومانیت، ارسطو کی بوطیقا کا تتمّہ، کولرج۔ قوتِ تخیل، رومانی شاعری، نظم اور شاعری، شاعری کی زبان، سانت بیو۔ کلاسیک کیا ہے؟ میتھو آرنلڈ۔ شاعری کا مطالعہ، تنقید کا منصب، لٹوٹالستائی۔ فن کیا ہے؟ ہنری جیمس فکشن کا فن، کروچے۔ شاعری کا جواز، آئی۔اے۔رچرڈس۔ سائنس اور شاعری، کرسٹوفر کاڈویل شاعری کا مستقبل، ایذرا پاؤنڈ۔ سنجیدہ فنکار، ٹی۔ایس۔ایلیٹ۔ روایت اور انفرادی صلاحیت، شاعری کا سماجی منصب، کتابیات، اشاریہ۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے کتاب میں مضامین کے ساتھ ساتھ مصنف کی تصاویر بھی شامل کی ہیں۔ ان میں ارسطو دانتے، سر فلپ سڈنی، بولو، گوئٹے، لیسنگ، کولرج، سانت بیو، میتھو آرنلڈ، ٹالستائی، ہنری جیمس، کروچے اور ٹی۔ایس۔ایلیٹ ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے مقدمہ کا عنوان ''مغربی تنقید کا ارتقاء'' دیا ہے۔ مغربی تنقید کو کئی ادوار میں

---

[۱] ڈاکٹر محمد احسن فاروقی مضمون ارسطو سے ایلیٹ تک مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ء ص ۴۱۶

تقسیم کیا ہے۔

۱۔ قدما کا دور ۲۔نشاۃ الثانیہ ۳۔کلاسیکیت ۴۔رومانیت ۵۔سائنس کا دور

۶۔بیسویں صدی

انھوں نے مغرب کے پہلے شاعر ہومر اور انکے معاصر شعراء کا ذکر کیا ہے اور انکی شاعری میں تنقیدی اشاروں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ بقول جمیل جالبی۔

> ''ہومر کے نزدیک شاعری کا مقصد ''لطف'' ہے جو ایک قسم کا جادو ہے۔ ہیسیڈ کے نزدیک شاعری کا منصب الہامی درس دینا ہے۔ زنوفینز ہومر اور ہیسیڈ دونوں پر اعتراض کرتا ہے پنڈار فطری شاعرانہ جوہر کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے جور جس شاعری کو عروضی نظام کی ایک شکل کہتا ہے۔ ارسٹوفینز کی کامیڈیوں میں طنز کے ساتھ ساتھ تنقیدی اشارے بھی ملتے ہیں۔'' [۱]

ان شاعروں کے علاوہ مقدمے میں مغربی تنقید نگاروں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے جو اپنے آپ میں کافی جامع ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔

> ''اس کتاب کے مقدمہ کا ذکر کرونگا۔ یہ یورپ میں تنقید کے ارتقا کا منظر دکھاتا ہے۔ مجھے جو چالیس برس سے انگریزی تنقید کا درس دے رہا ہوں چونکا دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مقدمہ اور ان نوٹوں کو ملا کر یورپ کی تنقید کے بابت ایک مکمل تنقید کی کتاب بنائی جاسکتی ہے۔'' [۲]

یہ بات بڑی حد تک ٹھیک ہے اس مقدمہ سے ایک مختصر کتاب تیار ہوسکتی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ افلاطون پیدائشی شاعر تھا مگر اسنے سقراط کا ایسا اثر لیا کہ اپنی ساری توجہ فلسفے پر لگادی ارسطو کو تنقید کا اصل بانی مانتے ہیں۔ ہورلیس کا زمانہ امن کا دور تھا۔ اس کی بات کی بڑی اہمیت تھی۔ لونجائس کے بارے میں کوئی خاص معلومات فراہم نہیں ہوتی۔ دانتے کے بارے میں ایلیٹ کا خیال ہے کہ وہ قرونِ وسطیٰ کا نمائندہ تھا۔ جبکہ جمیل جالبی کا خیال ہے کہ وہ نشاۃ الثانیہ کی صبح کا ستارہ تھا۔ نشاۃ الثانیہ کے لئے بھی وہ لکھتے ہیں کہ یہ کسی تحریک کا نہیں بلکہ اس فضا کا نام ہے جس نے ہر قوم کو نئی روشنی دی تھی۔ اس کے ذریعہ قومی زبانوں نے یورپ پر فتح حاصل کر لی۔ سر فلپ سڈنی نشاۃ الثانیہ کی تنقید

۱۔ ارسطو سے ایلیٹ تک ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۲ء ص ۲۰۔۲۱

۲۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی مضمون ارسطو سے ایلیٹ تک مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ء ص ۴۱۷

کا سب سے بڑا نمائندہ تھا۔نشاۃ الثانیہ کے زمانے میں ہی ایک دور ایسا آیا۔جس کے مصنفین قدما کے پیرو تھے۔اس لیے اس تحریک کا نام کلاسیکیت پڑا۔ بولو کلاسیکیت کا نمائندہ شاعر ہے۔ بولو کے زیرِ اثر ڈارائڈن نے اس تحریک کو آگے بڑھایا۔لیکن کلاسیکیت کا اصل نمائندہ پوپ کہلایا۔ یہ بولو کا پیرو ہے۔ اسکے بھی اصول اٹل ہیں۔انگریزی کلاسیکیت جونسن کی نظر میں عقیدہ کا درجہ رکھتی ہے۔گوئٹے بھی اس تحریک کا حامی تھا۔

جب فرانس میں انقلاب آیا۔تو حکومت کی باگ ڈور عوام کے ہاتھ میں آگئی۔کلاسیکیت کے اصول بے معنی ہوگئے۔انکی جگہ رومانیت نے لے لی۔ ورڈسورتھ سے شاعری میں رومانیت کی ابتداء ہوتی ہے۔کولرج بھی اسی زمانے کا ادیب ہے۔اس نے ورڈسورتھ کے خیالات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وکٹر ہوگو رومانی تحریک کا نمائندہ ہے۔اس نے رومانی فن کو جدید فن کا نام دیا ہے۔

رومانی تحریک کے وقت ہی سائنس کا دور آتا ہے۔اس تحریک کا دور دھیرے دھیرے ختم ہو جاتا ہے۔اسی زمانے میں سانت بیو شاعر سامنے آتا ہے۔جو رومانی تحریک کو ترک کرکے پھر سے کلاسیکیت کو اپناتا ہے۔تائین سانت بیو کا شاگرد تھا۔لیکن وہ تنقید کو سائنس بنانا چاہتا ہے۔وہ خود کو سائنسی دور کا انسان سمجھتا ہے۔میتھیو آرنلڈ بھی سانت بیو سے متاثر تھا۔وہ انگریزی ادب کے لئے وہی کرنا چاہتا تھا۔جو سانت بیو نے فرانس کے ادب کے لئے کیا تھا۔ٹالسٹائیب بھی اسی زمانے کا تھا۔اس نے تنقید کو نئے انداز سے دیکھنا چاہا۔ اس نے فن کی اخلاقی اہمیت پر زور دیا۔ والٹر پیٹر کے وقت یورپ میں ''ادب برائے ادب''اور''فن برائے فن'' کا چرچا تھا۔یہ اسی تحریک کا نمائندہ مانا جاتا ہے۔

ہنری جیمس ایک ناول نگار ہے۔جس نے جدید ناول کے فن کے بارے میں بہت سی اہم باتیں بتائیں۔کارل مارکس کے نظریات نے مغربی تنقید پر بڑا اثر ڈالا۔کیونکہ ادب بھی اس کی فکر کے دائرہ میں آتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے بیسوی صدی کی تنقید پر بھی روشنی ڈالی ہے۔اس صدی کی تنقید کی خاص بات یہ ہے کہ وہ معلموں،فلسفیوں اور سائنس دانوں کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ برگساں بیسویں صدی کا ایک ایسا فلسفی ہے۔جو ادب،فن،فنکار کی فطرت اور اس کے کام کے بارے میں اہم خیالات کا اظہار کرتا ہے۔کروچے بھی ایک فلسفی ہے۔جو فلسفہ جمالیات سے تعلق رکھتا ہے۔فرائڈ نے جمالیات کی

طرح نفسیات پر توجہ دی اور اپنی زندگی میں نفسیات کو سائنس کے درجے تک پہونچایا۔ آئی۔اے۔رچرڈس پروفیسر تو جمالیات کا ہے مگر تنقید کرتے وقت نفسیات کی بھی مدد لیتا ہے۔ ٹی۔ایس۔ایلیٹ اس دور کی سب سے بڑی شخصیت ہے۔ ایلیٹ نشاۃ الثانیہ کے دور میں جو رجحانات تھے۔ ان کے خلاف ہے۔ وہ قرونِ وسطٰی کی طرف لوٹ کر جانا چاہتا ہے۔ ایف۔آر۔لیوس بھی ایلیٹ کے معاصر ہیں۔ انکی تنقید یہ بات ظاہر کرتی ہے۔ کہ ایک عالم اپنی فکر اور مطالعے کے ذریعے ایک نقاد کا کام کر سکتا ہے۔ کرسٹوفر کاڈویل ایک مارکسی نقاد ہے۔ انکا نظریہ ہے کہ اشتراکی شاعر کا حقیقی زندگی سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے مقدمہ میں تین دائروں کا ذکر کیا ہے ایک اخلاقی دائرہ اس میں وہ نقاد آتے ہیں جو قدیم راہ کو اپنانے کی وجہ سے ''اخلاقی افادہ'' کے قائل نہیں۔

دوسرا نفسیاتی دائرہ ہے۔ یہ رجحان بیسویں صدی کی اہم چیز ہے۔ نفسیاتی نظریات ادب کی وضاحت کے لیے استعمال میں آتے ہیں۔ تیسرا دائرہ سماجی دائرہ ہے۔ اس میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے نقاد آتے ہیں۔ سانت بیو کے یہاں بھی یہ رجحان عام ہے۔ فرانسیسی نقاد تائین نے تو ادب میں سماج کو خاص اہمیت دی۔ اس کے بعد فارم پرستی اور اشارتی تنقید کے بارے میں لکھا ہے۔ فارم پرستی کے نظریے والے نقاد شاعری میں فارم کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ایلیٹ اور ایزرا پاؤنڈ کو سمجھنے کے لیے فارم کا نظریہ رکھنا ضروری ہے۔ اشارتی تنقید میں آفاقیت کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ادب کی قدر و قیمت سمجھنے کے لئے اشاروں اور علامتوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ یہاں آ کر مقدمہ ختم ہو جاتا ہے۔

تقریباً ۸۱ صفحات پر مشتمل مقدمے کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کتاب کی ابتداء ارسطو سے کی ہے۔ اس میں ہر ادیب پر تعارفی نوٹ کے ساتھ اس کے مضامین کا ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا خیال ہے۔

> ''یہ تعارفی نوٹ مجھے بڑے معنی خیز نظر آئے۔ یہ ثابت کرتے ہیں کہ جمیل صاحب ہر نقاد کی تمام تصانیف سے بخوبی واقف ہیں۔ یہ نوٹ انگریزی میں ترجمہ کر کے انگریزی تنقید کے طالب علموں کے لیے بہت ہی مفید ثابت ہونگے۔''[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے سب سے پہلے ارسطو کا تعارف کرایا ہے ارسطو وہ شخصیت ہے جس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

۱۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی مضمون ارسطو سے ایلیٹ تک مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ء ص ۲۱۶

بقول جمیل جالبی ''ارسطو سے سینکڑوں کتابیں اور رسالے منسوب کیے جاتے ہیں۔اس بات سے یہ ضرور پتا چلا کہ ارسطو نے جو کچھ لکھا وہ سب کا سب ہم تک نہیں پہونچا۔لیکن منطق، سائنس، فلسفہ، اخلاق وسیاست کے بارے میں کئی اہم تصانیف کے علاوہ ''فنِ خطابت'' اور ''بوطیقا'' ہم تک پہونچی ہیں۔''[۱]

بوطیقا میں تمہید ہے اور کئی باب ہیں۔

۱۔ **شاعرانہ نقل کے ذرائع:** شاعرانہ نقل کی اشیاء، شاعرانہ نقل کا طریقہ، شاعری کا مخرج اور اس کا ارتقاء، کامیڈی کا آغاز: ایپک اور ٹریجڈی مقابلہ، ٹریجڈی کی تعریف، پلاٹ کی وسعت، پلاٹ کا اتحاد، شاعرانہ صداقت اور تاریخی صداقت، سادے اور پیچیدہ پلاٹ، تنسیخ، انکشاف اور مصیبت، ٹریجڈی کے خاص حصے، یحک عمل، خوف اور ترس، ٹریجڈی کے کردار، انکشاف کی مختلف قسمیں، ٹریجڈی لکھنے والے شاعر کے لیے کچھ اصول، ٹریجڈی لکھنے والے شاعروں کے لیے کچھ اور اصول، خیال اور زبان و بیان، زبان و بیان اور طرز اِدا، ایپک شاعری، ایپک شاعری، تنقیدی اعتراضات اور انکے جواب، ایپک اور ٹریجڈی کا مقابلہ۔

ہورلیس کے تعارف کے ساتھ اسکی فنِ شاعری کا ترجمہ ہے فن شاعری کا مخاطب پیسو خاندان کا کوئی ایسا فرد ہے جو ادیب، شاعر اور ڈرامہ نگار بننا چاہتا ہے۔لونجائنس کے بارے میں کوئی صحیح معلومات نہیں ہے۔اس کا اصل نام کیا تھا۔اور یہ کون تھا۔اس کی تصنیف سے اس کے یونانی ہونے کا پتہ لگتا ہے۔ لونجائنس کی تصنیف کا ترجمہ عُلویّت کے بارے میں ہے۔اسکی تمہید ''سیسی لیلیس کا مقالہ اور اس کی کمزوریا'' ہے۔اس کو بھی کئی باب میں تقسیم کیا گیا ہے ''علویّت کے بارے میں ابتدائی خیالات''، کیا علویّت کا بھی کوئی فن ہے، ''غلطیاں جو علویّت کے خلاف جاتی ہیں''، تصنع پسندی، ''ادبی ناشائستگی کا مخرج''، تنقید اور علویّت، ''حقیقی علویّت''، ''غلویّت کے پانچ مخرج''، ''روح کی رفعت''، ''مواد کا انتخاب اور اس کی تنظیم''، ''توسیع''، توسیع کی تعریف''، ''افلاطون اور علویّت۔نقل''، ''کچھ عملی ہدایت''، ''امیجری اور قوتِ تخیّل''، ''صنائع: التجا''، ''صنائع اور عُلویّت''، ''صنعتِ سوال و جواب''، لاعطفی یا حروفِ عطف کا نہ ہونا''، ''صنائع کا اجتماع''، ''حروفِ عطف: کچھ نقصانات''، ''صفتِ عکس ترتیب تاکیدی یا صنعتِ تقلیب''، واحد اور جمع کی باہمی تبدیلی''، ''جمع کو واحد کر دینا''، ''زمانے کی

---

[۱] ارسطو سے ایلیٹ تک، ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۲ء ص ۱۱۴

تبدیلی''، ''ضمیر شخصی کی تبدیلی، ذاتی خطاب کا طریقہ''، ''واحد متکلم میں تبدیل کرنا''، ''پیچیدہ گوئی''، ''پیچیدہ گوئی کے خطرے''، ''زبان و بیان کا مناسب انتخاب''، ''مانوسی زبان''، ''استعارہ''، ''بے نقص معمولی تخلیق سے پُرنقص علویت بہتر ہے''، ''ہائپر آئی ڈیس اور ڈیمو ستھینیز''، ''افلاطون اور لائی سی اس''، ''علویت اور ادبی شہرت''، ''مماثلت اور تشبیہ''، ''مبالغے''، ''مضمون نگاری یا مواد کی ترتیب''، ''جملے کی ساخت''، ''علویت کی راہ میں رکاوٹیں''، ''اختصار''، ''طرز کی سطحیت اور توسیع''، ''خطابت وفصاحت کا زوال''۔ یہ باب پوری طرح مکمل نہیں ہیں۔

دانتے کے بارے میں جالبی لکھتے ہیں کہ یہ ''طربیۂ خداوندی'' کی وجہ سے زندہ جاوید ہے۔ یہ شروع سے ادب، ڈرائنگ اور شعر گوئی کی طرف مائل تھا۔ اسکی تصنیف کا ترجمہ ہے ''عام بول چال کی زبان کا ادبی استعمال'' اس میں جلد اوّل اور جلد دوم ہے۔ جلد اوّل کے چار باب کا ذکر ہے۔

پہلا باب، سولہواں باب، سترہواباب، اٹھارواں باب۔

جلد دوم میں پہلا باب، چوتھاباب اور ساتواں باب شامل ہے۔

سَر فلپ سڈنی پین ہرسٹ کے مقام پر پیدا ہوا۔ ''آرکیڈیا'' اس کی مشہور رومانی نظم ہے۔ جب شاہی عتاب دور ہوا تو فلپ سڈنی کو سَر کا خطاب ملا۔ ''شاعری کا جواز'' فلپ کی تصنیف کا ترجمہ ہے۔

بولو کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''نکولا بولو داپروا'' پیرس میں پیدا ہوا۔ طنزیات ومضحکات کا مجموعہ سب سے پہلے شائع ہوا۔ اس کے بعد انکی نظموں کی شہرت ہوئی۔ بولو کی ''فنِ شاعری'' میں چار کینٹو دیئے گئے ہیں۔ پہلا کینٹو، دوسرا کینٹو میں دیہی شاعری، مرثیہ، غزلیہ نظم، ایہام اور ہجو ہے۔ تیسرا کینٹو میں ٹریجیڈی اور ایپک ہے۔ چوتھا کینٹو۔

اس کے بعد لیسنگ ہے۔ جرمن ادب میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ لیسنگ کے چار مجموعے شائع ہوئے۔ جن میں شاعری کے ساتھ ساتھ حکایات، ڈرامے اور تبصرے بھی شامل ہیں۔ ''لاؤکون'' لیسنگ کا ترجمہ ہے۔ جس میں معودی اور شاعری کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی گوئٹے کے بارے میں لکھتے ہیں۔ وہ ایک جرمن شاعر، ڈرامہ نگار، ناول نویس اور سائنس دان تھا۔ گوئٹے کا نام ''فاؤسٹ'' کی وجہ سے امر ہے۔ ان کا ترجمہ کلاسیکیت اور رومانیت، ارسطو کی بوطیقا کا تمتہ ہے۔ کولرج کے بارے میں لکھتے ہیں کہ کولرج کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ ان خیالات کی ضروری تصحیح کر کے انھیں ایک نیا

توازن دے کر قابل قبول بنا دیتا ہے۔ ''بایوگرافیا لٹریا'' اس کی سب سے اہم تصنیف ہے۔ کولرج کے ترجمے۔ قوتِ تخیل، رومانی شاعری، نظم اور شاعری اور شاعری کی زبان۔

سانت بیوا اپنی علمیت، اندازِ بیان اور آزاد رائے کی وجہ سے اپنے معاصرین میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ترجمہ ''کلاسیک کیا ہے'' کلاسیک ایک ایسے قدیم مصنف کو کہا جاتا ہے کہ جو اپنے مخصوص اسلوب میں اپنا ثانی نہ رکھتا ہو اور اس کی حیثیت مستند اور مسلم ہو۔ میتھیو آرنلڈ آکسفورڈ میں شاعری کا پروفیسر تھا۔ ان کا ترجمہ شاعری کا مطالعہ اور تنقید کا منصب ہے۔ یہ دونوں ان کے اہم مضمون ہیں۔

لیوٹالسٹائی ایک ایسا ادیب ہے جس کی تحریریں نئے مذہبی، اخلاقی اور سماجی اعتقادات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا ترجمہ ''فن کیا ہے'' کے نام سے ہے۔ جس میں فن اور موضوع و مواد سے بحث ہے۔ آگے ہنری جیمس کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ہنری جیمس مذہبی، سماجی اور معاشی اعتقادات میں انتہا پسندی کی حد تک آزاد خیال تھا۔

لندن میں اس نے اپنی ناول نگاری کا آغاز کیا۔ ان کا ترجمہ '' فکشن کا فن'' ہے۔

کروچے نے ردم یونیورسٹی سے قانون کی تعلیم حاصل کی مگر ادھوری۔ اس نے ''لاکریٹیکا'' کی بنیاد رکھی۔ اور اس کا ایڈیٹر بھی رہا۔ اس رسالے، تصنیف اور مضامین کی وجہ سے اس نے قومی زندگی میں ایک اہمیت حاصل کی۔

آئی. اے. رچرڈس نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں معنی کے معنی، ادبی تنقید کے اصول، سائنس اور شاعری اور عملی تنقید ہیں۔ یہ سنگ ہوا یونیورسٹی میں پروفیسر رہا۔ سائنس اور شاعری ترجمہ ہے۔ اس کا پہلا باب عام صورتِ حال دوسرا باب شاعرانہ تجزیہ تیسرا باب کیا چیز وقیع ہے چوتھا باب زندگی کی بالادستی پانچواں باب نیچر کا بے اثر ہونا چھٹا باب شاعری اور عقائد ہے۔

کرسٹوفر کاڈویل کے بارے میں لکھتے ہیں۔ وہ تعلیم سے فارغ ہو کر۔ پہلے رپوٹر ہوا۔ پھر ایڈیٹر اور ڈائریکٹر تک بنایا گیا۔ لندن میں فریب وحقیقت کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ ان کے مضمون کا ترجمہ شاعری کا مستقبل ہے۔

ایزراپاؤنڈ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایک امریکی ہے مگر واشنگٹن کے پاگل خانہ میں قید رہا۔

کیونکہ وہ جنگ کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ یورپ آنے کے بعد امریکہ تین بار گیا۔ ایک مشہور شاعر کی حیثیت سے دوسری بار جنگِ عظیم کو روکنے اور آخری بار پاگل اور غدّار کی حیثیت سے۔ ''پیسن کینٹوز'' پر اسے شاعری کا سب سے بڑا انعام دیا گیا، ایزرا پاؤنڈ کے مضمون کا ترجمہ ''سنجیدہ فنکار'' ہے۔ اس میں سنجیدہ اور غیر سنجیدہ فنکاروں اور شاعروں کے بارے میں بنیادی باتیں بتائی گئی ہیں۔ آخر میں ٹی.ایس.ایلیٹ کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ایلیٹ نے اپنی زندگی ایک ٹیچر کی حیثیت سے شروع کی۔ کچھ دن کلرک بھی رہا، آخر میں ایک اشاعت گھر ''فیبر اینڈ فیبر'' سے وابستہ رہا۔ اسکی شاعری کی شہرت اس کی طویل نظم ''ڈی ویسٹ لینڈ'' سے ہوئی شاعری کے ساتھ وہ نقاد کی حیثیت سے بھی مشہور ہوا۔ اس کے ترجمے روایت اور انفرادی صلاحیت اور شاعری کا سماجی منصب ہے۔ اس کتاب کے آخر میں کتابیات اور اشاریہ شامل ہے۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ کا خیال ہے۔ ''اس کارنامے کو دیکھ کر دل نے چاہا کہ انھیں اردو زبان کا ٹی.ایس.ایلیٹ کہوں۔ بہر حال دفتری مصروفیات کے ساتھ ساتھ ایسے مختلف الاطراف اور وقیع علمی و ادبی تحقیقی و تنقیدی اور نظریاتی و فکریاتی موضوعات پر بلند پایہ کتابوں اور مقالوں کی تدوین ان کے ذوقِ علمی پر گواہ ہے۔ یہ آخری کتاب ''ارسطو سے ایلیٹ تک'' درحقیقت علم و تحقیق کا کوہ ہمالیہ ہے۔''[۱]

پروفیسر سجاد شیخ کا خیال ہے کہ ''انگریزی سے اردو میں تراجم جس حسن و خوبی سے جالبی صاحب نے کیے ہیں، اس کا اعتراف تبصروں کی حد تک تو نہایت فراخدلی سے کیا گیا ہے لیکن اب تک اس تراجم کا تفصیلی تنقیدی جائزہ لینے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی''[۲] یہ بات بڑی حد تک مناسب معلوم ہوتی ہے۔

۱۔ ارمغان سہ ماہی کراچی جمیل جالبی نمبر، شمارہ ۳، (اپریل، مئی، جون ۹۶ء) ص ۴۷

۲۔ پروفیسر سجاد شیخ مضمون اعلیٰ ترجمے کی دو مثالیں، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مولف گوہر نوشاہی۔ ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ء، ص ۴۰۵

برصغیر میں اسلامی جدیدیت

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ترجمہ نگاری میں ادب کے ساتھ ساتھ غیر ادب کے مسائل کو بھی اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس میں دونوں زبانوں پر عبور ہونا ضروری ہے۔

> اس سلسلے میں پروفیسر نظیر صدیقی کا ایک جملہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ''ترجمے کے معاملے میں ان کی خدمات ایک انفرادیت کی حامل ہیں۔''[۱]
>
> ''برصغیر میں اسلامی جدیدیت'' پروفیسر عزیز احمد نے انگریزی میں ۱۹۶۷ء میں تحریر کی۔ یہ مغربی قارئین کے لئے لکھی گئی تھی۔ مگر ضروری تھا کہ اس سے مشرقی قارئین بھی فیض اٹھائیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ ''میں نے یہ ترجمہ صرف ترجمہ کے لیے نہیں کیا بلکہ اپنے معاشرے میں فکرِ نو کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لیے کیا ہے۔ اس کا ترجمہ کتنا مشکل کام تھا میں نے ترجمہ متن کے عین مطابق کیا ہے۔ اور انگریزی کے پیچیدہ جملوں اور عزیز احمد کے تہ دار اسلوب کو بھی اردو زبان کے مزاج کے قریب رکھنے کی کوشش کی ہے۔'' [۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ابتداء میں اپنا مضمون ''اس کتاب کے بارے میں'' پھر پروفیسر عزیز احمد کی ''تمہید'' اور انکے بعد مقدمہ شامل کیا ہے۔ اس کتاب میں سولہ ۱۶ باب پیش کئے گئے ہیں۔ آخر میں کتابیات اور اشاریہ بھی ہے۔

پہلا باب: مقدمہ، ابتدائی روابط و اثرات، مغربی تمدن کے ابتدائی ارتسامات ابوطالب، برطانوی نظام عدالت کے گہرے اثرات، مذہبی فرقوں کا ردِّ عمل اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی، حواشی۔ اس باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ۱۴۹۷ء کے واسکوڈ گاما سے شروعات کی ہے۔ ہندوستان کی تلاش میں دنیا کے کتنے خطوں سے لوگ آئے اور ہندوستان پر حکومت کی مغلوں نے اور انگریزوں نے ہندوستان پر زیادہ حکومت کی یہی وجہ تھی کہ یہاں کے عوام پر انکے اثرات بھی زیادہ تھے مغلوں کے دور میں ہندوستان نے

---

۱ پروفیسر نظیر صدیقی مضمون ڈاکٹر جمیل جالبی ممتاز مترجم مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ موئف گوہر نوشاہی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۶، ۱۹۹۳ء ص ۴۰۴

۲ برصغیر میں اسلامی جدیدیت مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی ایمان پرنٹرز لاہور ۱۹۸۹ء ص ۱۱

کافی ترقی کی تھی۔

''مغربی تمدن کے ابتدائی ارتسامات'' میں ابو طالب خاں کے سفر نامے کا ذکر ہے۔ اس کی روداد سفر بیان کی گئی ہے۔ ''ابو طالب خاں نے اپنے چار سالہ قیام کے دوران زیادہ وقت انگلستان میں گذارا وہ پہلا مسلمان ہے جس نے مغربی استشراقیت کے نا قابلِ اعتماد ہونے کا تحریر میں اظہار کیا۔ اس نے سر ولیم جونس کی ''فارسی قواعد پر تنقید کی کہ اس میں بعض مقامات پر غلطیاں کی ہیں''۔[1]

دوسرا باب: سر سیّد احمد خاں اور علیگڑھ تحریک۔ اطاعت شعاری اور سیاسی علیحدگی پسندی، مغربیت، تعلیم اور ثقافت، تاریخ نویسی کی منہاجیات، مذہبی تفکّر، تقابلی، حواشی۔

دوسرے باب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ سر سیّد احمد خاں نے کس طرح اپنی پوری زندگی انگریزوں کی اطاعت اور وفاداری میں گذار دی تا کہ اسلام اور مسلمانوں کو کوئی نقصان نہ پہونچے۔ پروفیسر عزیز احمد نے لکھا ہے کہ ''سر سیّد احمد خاں کی اطاعت شعاری کو تین مرحلوں میں ناپا جاسکتا ہے۔ ۱۸۵۹ء سے ۱۸۷۰ء تک ان کی توجہ خاص طور پر سیاسی استحکام کی طرف تھی۔ اس کا مقصد اپنی قوم کو مخالفت کی حکمتِ عملی ترک کرنے اور تعاون و تسلیم کی حکمت عملی اختیار کرنے پر مائل کرنا تھا۔ دوسری منزل ۱۸۷۰ء تا ۱۸۸۴ء تک ہے اس منزل میں وہ اطاعت شعاری کی موجودہ حالت کے تحفّظ کے لیے کوشاں تھے۔ ۱۸۷۷ء سے ۱۸۹۸ء کی تیسری منزل میں انکی اطاعت شعاری مسلمانوں کی سیاسی علیحدگی پر زور دینے میں مصروف رہی۔''[2]

تیسرا باب: نظری جدیدیت کا انضمام۔

اس تیسرے باب میں پروفیسر عزیز احمد نے ان لوگوں کے نظریات پیش کئے ہیں جو سر سیّد کے ساتھ تھے۔ انتہاپسندی: چراغ علی، خلافِ روایت جدید: محسن الملک اور ممتاز علی اور نسائی تحریک، حواشی۔

چوتھا باب: اسلامی تاریخ کے زاویے۔

داخلی سمت: شبلی نعمانی، مغرب کی جانب رُخ: امیر علی، حالی اور تاریخی نظم، حواشی۔

پانچواں باب: روایاتی احیاء مذہب۔

۱۔ برصغیر میں اسلامی جدیدیت مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی ایمان پرنٹرز لاہور ۱۹۸۹ء ص ۲۶۔۲۷

۲۔ برصغیر میں اسلامی جدیدیت مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی ایمان پرنٹرز لاہور ۱۹۸۹ء ص ۶۱۔۶۲

عظیم مکاتیب، نو روایت پسندی: اہلِ حدیث، حواشی۔

چھٹا باب: خلافت اور بین اسلامیت۔ اس باب میں ہندوستانی مسلمانوں کے دو دور پیش کئے گئے ہیں۔ جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں پر خلافت اور اسلامیت کا کیا اثر پڑا۔ پہلا دور۔ (۱۸۷۰ء - ۱۹۱۰ء) اور دوسرا دور (۱۹۱۱ء - ۱۹۲۴ء) تک ہے۔

ساتواں باب: اقبال: مفکرانہ نو جدیدیت۔ اس باب میں اقدار کا انتخاب، مذہبی تفکر اور حواشی ہیں۔

آٹھواں باب: تخلیق پاکستان: اقبال کا نظریۂ پاکستان، محمد علی جناح اور دو قومی نظریہ، تحریکِ پاکستان کے مختلف رجحانات، حواشی۔

یہ باب کافی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اس میں اقبال اور محمد علی جناح دو اہم شخصیتوں کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

> اس کتاب میں لکھا ہے کہ ''۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء کے دوران اقبال اور جناح سیاسی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ اقبال، جناح کے نام اپنے خطوط میں اس بات پر مُصر تھے کہ ایک علیحدہ اسلامی ریاست کا قیام ہی ہندوستان میں امن برقرار رکھنے اور مسلمانوں کے مسئلہ کا واحد قابلِ عمل حل ہے۔''[۱]
>
> آگے ''محمد علی جناح اور دو قومی نظریہ'' میں لکھتے ہیں کہ ''جناح کو مستقبل میں دونوں قوموں کے امن و آشتی کے ساتھ زندگی گزارنے کا موقع صرف برصغیر کی تقسیم میں نظر آ رہا تھا۔''[۲]

اس بات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جناح کے ساتھ ساتھ اقبال بھی پاکستان بنانا چاہتے تھے۔

نواں باب: ابوالکلام آزاد: تفسیری انتخابیت اور حواشی۔

دسواں باب: مخلوط قومیت اور حواشی ہیں۔

گیارہواں باب: اسلامی سوشلزم کے تین نظریے۔ اور حواشی۔

بارہواں باب: ابوالاعلیٰ مودودی: راسخ العقیدہ اساسیت اور حواشی: اس باب میں مولانا مودودی مذہبی تحریک اور جدید اسلام کی مخالفت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

''۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۷ء کے دوران پہلے تو مولانا مودودی نے مولانا مدنی اور

۱۔ برصغیر میں اسلامی جدیدیت مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی ایمان پرنٹرز لاہور ۱۹۸۹ء ص ۲۳۶

۲۔ برصغیر میں اسلامی جدیدیت مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی ایمان پرنٹرز لاہور ۱۹۸۹ء ص ۲۴۰

علمائے دیو بند کی مخلوط قومیت کے موقف کی مخالفت کی اور بعد میں تحریکِ پاکستان کی لادینی قیادت کی بنا پر تنقیص کی۔ ۱۹۴۱ء میں انھوں نے ''جماعتِ اسلامی'' کی بنیاد رکھی۔ اس کی قیادت خود سنبھالی۔''[۱]

تیرھواں باب: پروفیسر تفسیری نو جدیدیت اور دوسرے آزاد رجحانات، حواشی۔

چودھواں باب: پاکستان میں جدیدیت اور راسخ الاعتقادی کی گومگو کیفیت، حواشی۔

چودھویں باب میں پاکستان کی حکومت اور اس کے اندرونی حالات بیان کئے گئے ہیں۔ بقول پروفیسر عزیز۔

''پاکستان کا پہلا دستور ۱۹۵۶ء میں منظور کیا جو بہر حال جدید پسندی اور راسخ العقیدگی کے درمیان سمجھوتہ تھا۔ ریاست کا قانون اور انتظامیہ دونوں جدید اور وسیع لادینی طرز کے رہے لیکن دستور میں، نظریاتی طور پر، اسلامی ریاست کی توثیق کی گئی تھی۔ مملکت کا نام ''اسلامی جمہوریۂ پاکستان تھا۔''[۲]

پندرھواں باب: ہندوستان میں اسلام کے رجحانات (۱۹۴۷ء - ۱۹۶۴ء)، حواشی۔ اس باب میں ہندوستان میں اسلامی رجحانات بیان کئے گئے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اسلام کے ماننے والوں نے خاص طور سے علماء اور نیتاؤں نے اپنے مذہب کے لئے کیا کیا کتنی تحریکیں چلائیں۔ اس میں ابو لکلام آزاد، اے۔اے۔ فیضی، ڈاکٹر ذاکر حسین، محمد مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین کے نام سامنے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ علماء میں محمد طفیل، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا محمد میاں، مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے نام شامل ہیں۔ جنھوں نے اپنے ملک میں اسلام کے لئے کچھ کام کیا۔

سولھواں باب: اختتامیہ، اس باب میں مسلم قوم کے حالات بیان کئے گئے ہیں اور سر سید احمد خاں نے کس طرح اپنی قوم کی بہتری کے لئے جدّ وجہد کی ہے۔

اس کتاب کے سلسلے میں پروفیسر سجاد شیخ لکھتے ہیں کہ ''ہم جالبی صاحب کے ان دو غیر ادبی ترجموں ''برصغیر میں اسلامی جدیدیت'' (۱۹۸۹ء) اور ''برصغیر میں اسلامی کلچر'' (۱۹۹۱ء) کا مطالعہ کریں گے جو دو تین سال پہلے شائع ہوئے ہیں۔ ان دونوں کتابوں کا موضوع برصغیر میں اسلامی تمدّن وثقافت کے فروغ کی

---

[۱] برصغیر میں اسلامی جدیدیت مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی ایمان پرنٹرز لاہور ۱۹۸۹ء ص ۳۰۰

[۲] برصغیر میں اسلامی جدیدیت مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی ایمان پرنٹرز لاہور ۱۹۸۹ء ص ۳۳۶

تاریخ کا جائزہ لینا اور ان محرکات کی نشاندھی کرنا ہے۔ جو مسلمانوں کے عروج وزوال اور عہد حاضر کی ملک گیر تحریک آزادی کا باعث بنے بالاخر اس خطّہ ارض کے لوگوں کو غیر ملکی تسلّط اور سامراجی چیرہ دستیوں سے نجات دلانے میں ممد ومعاون بنے۔"[1]

یہ بات صحیح ہے کہ اس کا موضوع اس لئے اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے ذریعے ہندوستان اور پاکستان میں مسلمانوں کے مذہبی حالات سامنے آتے ہیں۔

---

[1] پروفیسر سجاد شیخ مضمون اعلیٰ ترجے کیدو شالیں مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نوشاہی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۶، ۱۹۹۳ء ص ۴۰۷

برصغیر میں اسلامی کلچر
(ہندو پاک میں اسلامی کلچر)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے پروفیسر عزیز احمد کے ''اسلامک کلچر'' کا ترجمہ اسلامی کلچر کے نام سے کیا ہے۔ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہ کتاب ہندوستان پاکستان کی اسلامی تاریخ معلوم ہوتی ہے۔اس کا مطالعہ کرنے سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہندو پاک میں اسلام کن حالات سے گذر رہا تھا اور کس طرح پروان چڑھ رہا تھا۔

> ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ ''ان کتابوں کا ترجمہ کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ان کے مطالعہ سے وہ تاریخی شعور ہمارے اندر پیدا ہو سکے جس کا بڑا دھارا ہمارے شعور کے دوآبہ میں خشک ہو رہا ہے۔اور ہم زندگی کو آگے بڑھانے والے بڑے بنیادی سوالوں سے غافل ہو کر صرف عظمت رفتہ کے خواب دیکھنے میں مصروف ہیں۔تاریخی شعور قوموں کو زندہ رکھتا ہے۔''[1]

''اس کتاب کے بارے میں'' ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخی شعور کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔اس کے بعد پروفیسر عزیز احمد کا پیش لفظ ہے۔یہ کتاب دو حصّوں پر مشتمل ہے۔حصہ اوّل کا موضوع ''مسلم ہندوستان کا اِسلامی دنیا سے تعلق'' ہے۔اس میں چار باب ہیں۔

پہلا باب: ''سلطنتِ دہلی اور آفاقی خلافت'' اس زمانے کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔جب مسلمانوں نے پہلی بار ہندوستان میں قدم رکھا۔یہ بنو امیّہ کا اسلامی دور تھا۔

دوسرا باب: منگولوں کی یلغار یہاں ہمیں منگولوں کے حملوں کے بارے میں پتہ چلتا ہے کس کس طرح اور کون سے علاقوں پر منگولوں کا حملہ ہوا۔چین، وسطی ایشیا، روس اور فارس ان حملوں کی زد میں تھے۔ مگر ہندوستان ان حملوں سے محفوظ تھا۔جب کہ دہلی کا حکمراں کافی کمزور تھا۔

تیسرا باب: مسلم ہندوستان اور دارالاسلام، سولہویں اور سترہویں صدی میں۔اس باب کے دو حصّے ہیں۔

(ا) ''مغل ہندوستان اور دارالاسلام'' اس میں بابر کی حکومت سے شروع ہو کر اورنگ زیب تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔

---

[1] ہندو پاک اسلامی کلچر، مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۶۔۱۹۹۱ء ص ۱

(ب) ''دارالاسلام اور دکن و گجرات کی بادشاہتیں'' اس حصّے میں دکن کی بہمنی اور گجرات کی علاقائی سلطنت کا حال بتایا گیا ہے۔ جنھوں نے پندرہویں اور سولہویں صدی میں دہلی پر حکومت کی۔

چوتھا باب: بین الاسلامیت اور جدیدیت۔ اس میں چار حصّے ہیں۔

(ا) سیّد احمد خاں اور جمال الدین افغانی (ب) خلافتِ عثمانیہ (ج) ابوالکلام آزاد کا نظریۂ خلافت (د) اقبال۔ جدیدیت اور نو بین الاسلامیت اسلام کو لے کر ابوالکلام آزاد کا نظریہ یہ تھا۔

> ''ابوالکلام نے ''تاسیس'' میں جسے وہ مذہب کی تعمیرِ نو سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور ''تجدید'' میں جو نری جدیدیت ہے اور جس کے مبلغ سید احمد خاں تھے۔ خط امتیاز قائم کیا چونکہ وہ اسلام کے ایک مثالی مذہب ہونے پر یقین رکھتے تھے اس لئے اس کی اپنی ذات میں اکملیت اور جامعیت کو لاابدی تصور کرتے تھے۔''[۱]

پہلے حصّے کے مقابلے میں حصہ دوم میں بارہ ابواب ہیں۔ اس میں ''مسلم ہندوستان اور ہندو ہندوستان کا باہمی تعلق'' ہے۔ پہلے باب میں تمہید: مسلمانوں کا اثر اس کے بھی آٹھ حصّے ہیں۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی کیا اہمیت اور کیا اثرات ہیں۔

(ا) دو ثقافتوں کی متصادم فطرت (ب) مسلمانوں کے دور کا عمل (ج) مسلم اداروں کا اثر (د) تبدیلی مذہب اور ارتداد (ھ) بت شکنی (و) رواداری اور تعصّب (ز) ہندو مزاحمت (ح) ہندو تنگ نظری۔

دوسرا باب: مسلم نظم و نسق میں ہندو عناصر۔

(ا) ہندو اشرافیہ کا انجذاب (ب) ہندو انتظامی طبقوں کی ثقافتی انتخابیت

تیسرا باب: ہندو ثقافت کے متعلق مسلمانوں کی ابتدائی تحقیقات۔

(ا) ہندو علوم کے متعلق عربی تحقیقات (ب) البیرونی (ج) امیر خسرو

> پرفیسر عزیز احمد لکھتے ہیں کہ ''۷۱۸ء اور ۸۰۰ء کے مختصر درمیانی عرصہ میں جب سندھ خلافت کا ایک صوبہ تھا، سنسکرت کے علوم عربی زبان میں براہِ راست منتقل کئے گئے (ا) ہندو سائنسی علوم خاص طور پر طب اور نجوم سے عربوں کو اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی یونانی علوم سے۔ ہندو اطباء کو بغداد آنے کی دعوت دی گئی۔''[۲]

---

[۱]، [۲] ہندو پاک اسلامی کلچر، مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۶۔ ۱۹۹۱ء ص ۹۶ / ۱۶۳

چوتھا باب: تصوف اور ہندو ویدانت ۔ اس حصّے میں ہندوستان کے ویدانت اور تصوف کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اگر دونوں کا موازنہ کیا جائے تو دونوں کے خیالات مشترک ہیں۔ یہ دونوں ہی دنیا سے الگ رہنا پسند کرتے ہیں۔

> بقول پروفیسر عزیز احمد ''البیرونی نے ہندو، یونانی اور مسلم صوفیاء کے خیالات کی ہم آہنگی مقدمات اولیٰ کے بارے میں مشاہدہ کئے ہیں۔ اسی طرح، آزاد خیال صوفیوں میں وحدت الوجود کے رجحانات ہندو رجحانات سے مماثل نظر آتے ہیں۔ اور تناسخ کا نظریہ صوفیوں کی طرح ان میں بھی پایا جاتا ہے۔ سامکھیہ میں بہشت کا جو مثالی تصور پایا جاتا ہے، البیرونی کے مطابق وہ بعینہ صوفیوں میں بھی رائج ہے۔'' [۱]

پانچواں باب: اتحادِ مذاہب کی مقبولِ عام کوشش پانچویں باب کے چھ حصّے ہیں۔
(ا) بھگتی تحریک: اسلام کے خلاف ردِّ عمل اور مزاحمت (ب) کبیر (ج) بھگتی تحریک: دورِ مابعد میں اسلام سے تعلق (د) سکھ مت: اتحاد سے عداوت تک (ح) اتحادِ مذاہب کے چھوٹے داعی (و) لوک عقائد میں اتحاد، مذاہب۔

اس حصّے میں ان لوگوں کا ذکر ہے۔ جنھوں نے ہندوستان میں اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ تقریباً ہر مذہب میں ایسے لوگ تھے جو ملک کے اندر اتفاق اور اتحاد چاہتے تھے۔ ان ہی میں ایک کبیر داس کا ہے۔

> ''پندرھویں صدی کا بھگتی شاعر کبیر داس روحانی طور پر رامانند کے پیروؤں میں سب سے زیادہ آزاد روشن خیال تھا۔ اس نے جو انتخابیت اور آزادہ روی پیش کی اس میں ہندو اور مسلم عوام کے اتحاد کے لئے زمین تیار کی گئی تھی۔ اس تحریک کی جڑیں رام کے مسلک میں مضبوطی سے قائم تھیں۔ یہ انتخابیت بڑی مؤثر اور پرخلوص شاعری میں پیش کی گئی تھی۔'' [۲]

چھٹا باب: اکبر: بدعتی یا مُرتد؟

ساتواں باب: نقشبندی ردِّ عمل۔

---

[۱] [۲] ہندو پاک اسلامی کلچر، مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۶۔ ۱۹۹۱ء ص ۱۸۹ / ۲۱۶۔۲۱۷

آٹھواں باب: داراشکوہ اوراورنگ زیب۔آٹھویں باب کے دوحصے ہیں۔

(ا) داراشکوہ کا قیاسی اتحادِ مذاہب (ب) اورنگ زیب کی دینی تخصیص پسندی۔

نواں باب: ولی اللٰہی تحریک۔اس میں دوحصے ہیں۔

(الف) شاہ ولی اللہ کے مذہبی اور سیاسی افکار۔

(ب)تحریکِ مجاہدین۔

بقول پروفیسر عزیز احمد کہ ''اٹھارویں صدی کے ابتدائی دور میں مسلم ہندوستان کی مذہبی فکرنو کی ضروریات میں شاہ ولی اللہ کا جو حصہ ہے۔وہ ایک طرف اسلامی فقہ کونظم و ضبط حدیث کے تحت لانا تھا۔ اور دوسری جانب مختلف صوفی نظاموں کے بچے کھچے حصّوں کومروجہ راسخ اسلام میں مکمل طور پر جذب کرنا تھا۔'' [۱]

جس طرح شاہ ولی اللہ نے مذہبی خیالات کو مستحکم کرنے کی کوشش کی اسی طرح تحریکِ مجاہدین میں جولوگ شامل تھے۔انھوں نے بھی ہندوستان میں اسلام کوفروغ دینے کی بھرپور کوشش کی۔یہی تحریک ولی اللٰہی تحریک تھی۔

دسواں باب: ثقافتی تعیّنات: قرونِ وسطیٰ کا ادب۔یہ تین حصّوں پر مشتمل ہے۔

(ا) سنسکرت ادب اور مسلم سرپرستی (ب) فارسی ادب: مسلم سرچشمہ (ج) فارسی ادب میں ہندوؤں کی خدمات کی نوعیت۔

گیارھواں باب: ثقافتی تعیّنات: اردواور ہندی اس باب کے بھی تین حصے ہیں۔

(ا) ہندی ادب: ہندودھارااور مسلم اشتراک (ب) اردو: مسلم دھارااور ہندواشتراک

(ج) لسانی تنازعہ

بارھواباب: تتمہ: موجودہ علیحدگی پسندی (۱۸۵۷ء۔ ۱۹۴۷ء)اس باب میں وہ حالات بیان کئے گئے ہیں۔ جومسلمانوں کے حق میں نقصان دہ ثابت ہورہے تھے۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک مسلمانوں کواپنی زبان چھوڑنی پڑی فارسی سے انگریزی کی طرف آنا پڑا۔ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کوزیادہ ناپسند کرتی تھی۔

اس کتاب کے آخر میں کتابیات اوراشاریہ پیش کیا گیا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی ترجمہ

---

[۱] ہندوپاک اسلامی کلچر،مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی،ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۶۔۱۹۹۱ء ص ۳۱۰

نگاری سے اردو ادب کے ساتھ ساتھ ہندو پاک کے مسلمانوں کو فائدہ پہونچایا ہے۔ انکی ترجمہ نگاری کو دیکھتے ہوئے پروفیسر سجاد شیخ کا خیال ہے۔

''بلاشبہ جالبی صاحب نے عزیز احمد کے پیچیدہ جملوں کو ان کی بامعنی ترکیب نحوی کے ساتھ اردو کے مزاج میں ڈھال کر ایک ایسا اسلوب فراہم کیا ہے جس میں عالمانہ سنجیدہ اور بڑی کتابیں لکھی جانی چاہئیں[۱]

'' پروفیسر سجاد شیخ نے چند مثالیں بھی پیش کیں ہین۔ ایک مثال یہ ہے۔

"Since the 1880s, but more specifically after 1924 Indian Muslim Political Separatism was feeling its way, out of the complex of Indian unity."

(Islamic Culture, p. 269)

(ترجمہ: ۱۸۸۰ء کے عشرے سے اور خاص طور پر ۱۹۲۴ء کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی علیحدگی پسندی ہندوستانی وحدت کے الجھاؤ سے نکلنے کے لیے راستہ تلاش کر رہی تھی) (اسلامی کلچر ص ۴۱۱)

اس مثال سے ترجمہ نگاری کے سلسلے میں جالبی کا یہ خیال صحیح لگتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انگریزی کتاب (اسلامی کلچر) کا ترجمہ کرنا کتنا مشکل کام تھا۔ میں نے ترجمہ متن کے عین مطابق کیا ہے۔

---

[۱] پروفیسر سجاد شیخ، مضمون اعلیٰ ترجمے کی دو مثالیں، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ موئف گوہر نوشاہی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ء ص ۴۰۹۔۴۱۰

باب پنجم

(متفرق ادبی تحریریں)

بچوں کا ادب

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے قلم سے بچّوں کو بھی خوش کیا ہے۔ اپنی تحریروں سے انھوں نے اطفال کو محروم نہیں کیا۔ جہاں ایک طرف تنقید، تحقیق، لغت، تاریخ اور ترجمے جیسے سنجیدہ پہلوؤں پر کتابیں لکھیں وہیں دوسری طرف ادب الاطفال کو بھی اردو ادب میں ایک معقول حیثیت عطا کی۔

ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے اپنے مضمون ''ڈاکٹر جمیل جالبی۔ بچوں کے ادیب'' میں لکھتے ہیں۔

''اپنے عظیم تر تحقیقی، تنقیدی اور لسانی کاموں کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے بچوں کے ادب کو کبھی بھی بے مایہ نہیں سمجھا۔ وہ ایک جہاں دیدہ اور تجربہ کار معلّم بھی ہیں۔ موصوف اپنی عملی زندگی کے ابتدائی دو برسوں تک کراچی کی ایک ایسی معروف درسگاہ جو قائداعظم کے دستِ راست اور تحریک پاکستان کے نامور سپوت نواب بہادر یار جنگ کے نام نامی سے منسوب ہے، کے مدرس اعلی بھی رہے ہیں۔ انھوں نے اس قومی فریضے کا آغاز قیام پاکستان کے فوراً بعد کر دیا تھا۔ جب مولانا رازق الخیری کے رسالہ ''بنات'' میں اپنی دلچسپ کہانی ''بلّیاں'' شائع کرائیں تھیں۔ ۱۹۸۴ء تک آپ کی ۴۷ کہانیاں شائع ہوئیں۔ اور ایک طویل قصّہ ''حیرت ناک کہانیاں'' کے عنوان سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔''[۱]

دنیائے ادب میں جب کوئی قلم اٹھاتا ہے۔ تو دو باتوں کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ ایک موضوع اور دوسرا اسلوب ہے۔ سب سے پہلے موضوع کے لئے ذہن کو تیار کیا جاتا ہے۔ جب بچوں کے لئے کچھ لکھنا ہے تو موضوع پر خاصا دھیان دینا پڑتا ہے۔ ساتھ ساتھ عمر کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ زبان بھی ایسی استعمال ہوگی۔ جو بچوں کو متاثر کرے۔ ان پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ڈاکٹر جمیل جالبی کا ادب الاطفال میں کیا مقام ہے۔ اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمود الرحمٰن لکھتے ہیں۔

''جب جالبی صاحب ارسطو سے ایلیٹ تک کی سطح سے معارخ موڑ کر بچوں کے لیے کہانیاں لکھنے بیٹھتے ہیں۔ تو وہ فکر و فلسفہ اور علم و ادب کے حصار سے باہر نکل

---

[۱] ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ موئف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۲ء، ص ۴۴۳۔ ۴۴۴

آتے ہیں اور اس دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں اسمٰعیل میرٹھی، صوفی تبسم، شفیع الدین نیر، عبدالواحد سندھی اور محمدی بیگم کا راج ہے۔"[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی کی جو کتابیں سامنے آئی ہیں۔ وہ بچوں کے لئے تحفہ کے طور پر ہیں۔ ایک تو ''حیرت ناک کہانیاں'' اور دوسری ''نہ ہوئی قرولی'' یہ خوجی کی سرگزشت ہے۔ تیسری ''بارہ کہانیاں'' یہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بچپن میں سنی تھیں۔

''حیرت ناک کہانیاں''

''حیرت ناک کہانیاں'' مافوق الفطرت عناصر پر منحصر ہیں۔ یہ کہانیاں حیرت ناک اور خوف زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کتاب میں جو کہانیاں پیش کی ہیں۔ ان میں عجیب وغریب واقعات شامل ہیں۔ یہ واقعات زیادہ تر خود انکے ساتھ گذرے ہیں۔ یہ واقعات کتاب کی شکل میں انکی بیٹیوں کی فرمائش پر سامنے آئے ہیں۔ اس میں دو کہانیاں ہیں۔ ایک ''چُھن چُھن چُھن چُھن'' اور دوسری ''بید کی کہانی'' ان واقعات میں بید کے کردار کو سب سے زیادہ نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس نے ہندوستان سے پیچھا کرتے کرتے پاکستان تک ڈاکٹر جمیل جالبی کا پیچھا کیا ہے۔ اور آخر میں وہ کردار ڈاکٹر جمیل جالبی کو بید بیچ کر چلا گیا۔ یہ بید انکے پاس آج تک محفوظ ہے۔ اس کتاب کے آخر میں وہ لکھتے ہیں۔

> ''گذشتہ پچیس سال کے واقعات ایک ایک کر کے میرے سامنے آرہے تھے اور خوف مجھے اپنی لپیٹ میں لے کر پسینے کی شکل میں پیشانی سے بہہ رہا تھا۔ اس کے بعد پھر کوئی واقعہ میرے ساتھ پیش نہیں آیا وہ بید آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔''[۲]

اس کتاب کے واقعات خود ڈاکٹر جالبی کے ساتھ گذرے معلوم نہیں یہ خواب تھا خیال تھا یا حقیقت تھی۔ بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ چند احساسات انھوں نے اپنے قلم کے ذریعہ کچھ پتوں پر اتار دیئے ہیں۔ جو بچوں کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ مؤلف گوہر نوشاہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۶۔۱۹۹۳ء ص ۴۴۵

۲۔ حیرت ناک کہانیاں، ڈاکٹر جمیل جالبی نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد ۱۹۹۷ء ص ۳۸

''نہ ہوئی قرولی''

ادب الاطفال کی دنیا میں انکی دوسری کوشش ''نہ ہوئی قرولی'' ہے۔ یہ کتاب پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناول ''فسانۂ آزاد'' کے کردار خوجی پر منحصر ہے سرشار نے خوجی کے کردار، میں جو رنگ بھرا ہے۔ وہ اپنے آپ میں مکمل اور خوبصورت ہے۔ ڈاکٹر جالبی نے اس زندۂ جاوید کردار کو موضوع بنا کر اس کتاب کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ''نہ ہوئی قرولی'' خوجی کا تکیہ کلام ہے۔ جو عنوان کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ۱۹۷۶ء میں ان کہانیوں کو ترتیب دینا شروع کیا جو بچوں کے رسالے ''ہونہار'' میں شائع ہونی شروع ہوئیں۔ آخری قسط ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی۔ سرشار کے خوجی کا نام خواجہ بدیع الزماں ہے۔ یہ بہت ہی مختصر سی شخصیت ہیں مگر جوش انکے اندر پہلوانوں کا سا ہے۔ جو غصّے میں اپنی قرولی نکالنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ مگر ہمیشہ دوسروں سے پٹ جاتے ہیں۔ اس کردار کو بڑی خوبی سے سمجھایا گیا ہے خوجی لکھنوی تہذیب کے نمائندہ ہیں۔ جن پر حکومت کا اور طاقت کا نشہ ہے حالانکہ نہ طاقت ہے نہ حکومت ہے۔ مگر شیخی بھگارنے سے باز نہیں آتے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''نہ ہوئی قرولی'' میں ۲۶ کہانیاں پیش کیں ہیں۔ انکے عنوان بڑے دلچسپ ہیں۔

۱۔ آزاد مل گئے، خوجی کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا، خوجی صاحب حکیم بن گئے، وارے کے نیارے ہو گئے، چور چور چور، خوجی پکڑے گئے، ناک میں مرچیں ڈال دیں، خوجی نے بونے کو مار گرایا، بونے سے بدلہ لیا، خوجی قید ہو گئے، روسی میجر سے ملاقات، خوجی قید سے بھاگ نکلے، بُرے پھنسے، جان بچی اور لاکھوں پائے، خوجی نے دُون کی ہانکی، خوجی ہوا کھانے نکلے، خوجی کو دریا میں پھینک دیا، اچانک اعلانِ جنگ ہو گیا، میدانِ جنگ میں خوجی کے کارنامے، خوشی کے شادیانے بجنے لگے، خوجی نے خواب دیکھا، اچانک ہلّا بول دیا، آزاد پھر ملے، خوجی شہزادی سے ملنے گئے، خوجی کے ہوش اڑ گئے، شہزادی آزاد سے ملنے گئی، خوجی نے شرط پوری کرادی، خوجی برات لے کر چلے، خوجی پاگل خانے میں، خوجی اور آزاد کی طلبی ہو گئی، خوجی نے پانی پیا، خوجی پر کیا گذری، آزاد پکڑے گئے، خوجی پھر پہنچ گئے، شہزادے شہزادیاں نکلیں، گن کے دو جوتے لگائیے، خوجی تھر تھر کانپنے لگے، خوجی نے بھیس بدلا خوجی دھر لئے گئے، پھر بُرے

پھنسے، اچھا جھانسا دیا، خوجی اکیلے رہ گئے، لیجئے پھر پکڑے گئے، پوچھ گچھ شروع ہوئی، خوجی پاگل بن گئے، پھانسی کا پھندا، کیا فرمایا آپ نے؟ واپسی کا سفر، پھر کشتی ہوگئی، خوجی نے بگھی چلائی، خوجی دھڑام سے گرے، خوجی دلہن دیکھنے گئے، دلہن بہروپیا نکلا، زہر کھلاؤ اور دعوت مانگو، ساتھ خیریت کے پہنچ گئے، خوجی بہک گئے، خوجی موج میں آگئے، جان چھڑانی مشکل ہوگئی، خوجی پہلوان سے بھڑ گئے، خوجی ڈینگیں مارتے رہے، آزاد خوجی سے آملے، جے سوجے، ڈٹے سوڈٹے، خوجی کا پارہ چڑھ گیا، خوجی پھر تاؤ میں آگئے، زمین کھا گئی یا آسمان؟ ان مضامین کی زبان اور لب ولہجہ اتنا سادہ اور آسان ہے کہ بچوں کو اندازہ بھی نہیں ہوسکتا کہ یہ کہانیاں ایک ماہر نقاد اور محقق کی لکھی ہوئی ہیں۔

بقول ڈاکٹر محمود الرحمٰن ''ایسا لب ولہجہ جو بچوں کے مزاج و مذاق، ذوق ووجدان اور سن وسال سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔ وہ تو بچہ بن کر بچوں کی زبان بولتے ہیں۔ جو ننھے دلوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔''[1]

افسوس اس بات کا ہے کہ بچوں کے لئے ان کے پاس وقت بہت کم ہے۔ اپنی ادبی مصروفیات اور دیگر ذمہ داریوں کی وجہ سے ڈاکٹر جمیل جالبی بچوں سے دور ہوتے چلے گئے۔

---

[1] ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ، موئف گوہر نوشاہی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ۱۹۹۳ء، ص ۴۳۸

''بارہ کہانیاں''

''بارہ کہانیاں'' بچوں اور بڑوں دونوں کے لئے ہیں۔ اس میں عنوان کی مناسبت سے ۱۲ کہانیاں شامل ہیں۔ (۱) اپنی مدد آپ (۲) دو دوست دو دشمن (۳) ایک چیل کی کہانی (۴) ایک عجیب معاہدہ (۵) نادانی کی سزا (۴) سمجھ دار گدھا (۷) قصہ ایک بھیڑیے کا (۸) مغرور لومڑی (۹) نادان بکری (۱۰) ناشکرا ہرن (۱۱) بدذات بلّی (۱۲) دو چوہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ

> '' یہ وہ کہانیاں ہیں جو میں نے بچپن میں سنی یا پڑھی تھیں۔ میں چاہتا ہوں کہ موجودہ اور آنے والی نسلیں بھی ان کہانیوں کو پڑھ کر اپنے ذہن کو تر و تازہ کریں۔ ان کہانیوں کو میں نے اس طرح لکھا ہے کہ بچے اور بڑے یکساں دلچسپی کے ساتھ انھیں پڑھ سکیں اور دونوں کے لیے ان کے معنی الگ الگ ہوں۔ بچوں سے یہ کہانیاں ان کی ذہنی سطح کے مطابق، مکالمہ کریں۔ اور بڑوں سے یہ کہانیاں ان کی زندگی کے اپنے تجربوں اور ذہنی سطح کے مطابق، مکالمہ کریں۔ جب یہ کہانیاں پہلی بار ہر مہینے بچوں کے رسالے ہمدرد نونہال میں شائع ہوئیں تو بچوں کے تاثرات ان سے مختلف تھے۔ جو بڑوں کے رسالے علامات کے قارئین نے مجھے بھیجے۔''[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے جو یہ کہانیاں پیش کی ہیں۔ تقریباً سب سبق آموز ہیں۔ ان پر عمل کرنے سے بچے زندگی کی راہ میں صحیح قدم اٹھا سکتے ہیں۔ اور بڑے بھی سنبھل کر چل سکتے ہیں۔ مجھے ان کی دو کہانیاں بے حد پسند آئیں ایک ''اپنی مدد آپ'' اور ''دو دوست دو دشمن'' یہ حقیقت ہے کہ انسان اگر زندگی میں کچھ اچھے اصول بنائے اور ان پر عمل بھی کرے تو بہت سی پریشانیوں سے بچ سکتا ہے۔ یہ کہانیاں بچوں کو ضرور سنانی چاہئیے۔

•

---

[۱] بارہ کہانیاں، ڈاکٹر جمیل جالبی، ۱۹۹۸ء ص ۱

تبصرہ نگاری

ڈاکٹر جمیل جالبی کی ادبی خدمات کے سلسلے میں ان کی تبصرہ نگاری کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ تبصرہ نویسی کا فن انگریزی سے اردو میں آیا اور حالی وشبلی کے زمانے سے کتابوں اور رسالوں پر رویو (تبصرہ) شائع کرنے کی روایت قائم ہوئی اور تاحال جاری ہے۔ تبصرہ کی خوبی یہ ہے کہ مختصر ہو جامع ہو اور قاری کو کتاب کی روح تک پہنچا سکے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے تبصرے کامیاب تبصرہ نگاری کے عمدہ نمونے ہیں۔ ان کے تبصروں کی کل تعداد ۱۲۴ ہے۔ یہ سب ان ہی کے رسالے "نیا دور" کراچی میں اشاعت پذیر ہوئے۔ ان میں سے زیادہ تر تبصرے ایک دو صفحات پر مشتمل ہیں مگر بعض تبصرے طویل بھی ہیں جو مضمون کی شکل اختیار کر گئے ہیں جنھیں انگریزی میں Reveiw Article یعنی مضمون نما تبصرہ کہا جاتا ہے اور بعض تبصرے چند سطری بھی ہیں ان کا سب سے طویل تبصرہ ذہین شاہ تاجی کے مجموعہ کلام آیات جمال پر ہے جو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے اور مختصر ترین تبصرہ مجلس یادگار غالب کے مطبوعات پر ہیں جو آٹھ دس سطروں سے زیادہ کے نہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے تبصروں کا ڈھانچہ عموماً مندرجہ ذیل تین حصّوں پر مشتمل ہوتا ہے پہلے حصے میں کتاب کا نام، مصنف رمرتبہ رمترجم کا نام، کتب صفحات کی تعداد، کتاب کی قیمت سن اشاعت اور ناشر کا نام درج ہوتا ہے۔ یہ حصہ رسمی ہوتا ہے۔

دوسرا حصہ سب سے اہم ہوتا ہے۔ اس میں کتاب کی ضرورت، اہمیت افادیت پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کتاب کسی اعتبار سے اضافے کی حیثیت رکھتی ہے یا نہیں زیر تبصرہ کتاب کی خوبیوں اور خامیوں کا بھی مختصر اًذکر ہوتا ہے۔

تیسرے حصے میں کتابت وطباعت اور کاغذ کی نوعیت کا ایک دو جملوں میں ذکر ہوتا ہے یہ حصہ بھی رسمی ہوتا ہے۔ جمیل جالبی اپنے تبصروں کی ساخت میں فن کارانہ تنوع سے خوب کام لیتے ہیں۔ چنانچہ کبھی کبھی وہ تبصرہ کے رسمی حصوں کو ایک ساتھ شروع ہی میں بیان کردیتے ہیں ااور دوسرا حصہ جو اہم ہے اسے بعد میں زیر بحث لاتے ہیں جیسا کہ نیا دور شمارہ ۶۱۵ میں خلیل الرحمٰن اعظمی کے نثری مجموعے پر اسی طریقے سے تبصرہ کیا ہے۔

کتاب کا نام :کاغذی پیرہن
مصنف :خلیل الرحمٰن اعظمی
ناشر :آزاد کتاب گھر، دہلی
صفحات :۲۱۲
قیمت :درج نہیں ہے،

کتاب وطباعت عمدہ، سرورق سادہ مگر جاذب نظر

خلیل الرحمٰن اعظمی کا یہ پہلا شعری مجموعہ تھا جالبی کے تین صفحات پر تبصرے میں اعظمی کی شاعرانہ خوبیوں کا بھی ذکر ہے اور خامیوں کا بھی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی مقبولیت کا اعتراف بھی ہے اور مستقبل میں ان کی شاعری سے متعلق اندیشے کا اظہار بھی۔ جس دور میں کاغذی پیرہن شائع ہوا۔ اس دور میں تقلید میر کا رواج عام تھا۔ جالبی نے نوجوان شعرا کے لئے رنگ میر کی پیروی کو خطرناک قرار دیا ہے، جالبی کی نظر میں نو جوان شاعر خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری کے حدود وامکانات کیا ہیں؟ اس کے لئے مذکورہ تبصرے سے چند اقتباسات یکجا ملاحظہ ہوں:

''خلیل اعظمی نوجوان ہیں، انہیں رومان بے روزگاری'' افلاس'' سماجی ناانصافیوں سرمایہ دارانہ ذہنیت اور ان کی خودغرضیوں، بے رحمیوں سے براہ راست واسطہ پڑا ہے اور یہی چیزیں ان کے کلام کا موضوع ہیں۔ واحد متکلم کا صیغہ ان کے کلام میں بار بار آتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ اعظمی کا کلام ان کی ذات کا آئینہ دار ہے اور ان کی اپنی زندگی کی کہانی۔ یہاں تک کہ وہ اکثر نظمیں خود سے مخاطب ہو کر لکھتے ہیں۔ یہ بات اچھی بھی ہے اور بری بھی۔ اچھی ان معنی میں کہ جو کچھ شاعر کہہ رہا ہے وہ اسے شدت کے ساتھ محسوس کر کے کہہ رہا ہے اور بری اس طرح کہ اگر تجربہ گہرا نہیں ہے اور اپنی ذات اور اس سے پیدا ہونے والا احساس اپنے اندر وہ عمومی جاذبیت نہیں رکھتا جس سے قاری کو دلچسپی پیدا ہو سکے۔ تو اس صورت میں شاعری ایک قسم کی ذاتی ڈائری سی بن کر رہ جاتی ہے۔''

خلیل الرحمٰن اعظمی ہندی کے کومل اور میٹھے میٹھے لفظوں کو بھی اکثر استعمال کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ میر کا دامن بھی پکڑتے ہیں اور پھر ایک اعظمی ہی کیا اب تو یہ بات ایک فیشن بن گئی ہے کہ شعراء میر کی بحروں، میر کے لفظوں اور اس کے لہجہ کا سہارا لیکر شعر کہنے لگے ہیں۔ ایسے شعروں میں نرمی اور گھلاوٹ ہونے

کے باوجود یہ احساس ضرور ہو جاتا ہے کہ شاعر کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ اسے ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ سو میر نے اسے دے دیا۔ اس طرح میر نے نئے شاعروں کو بہت کچھ دینے کے باوجود انہیں خراب بھی بہت کیا ہے۔ اس وقت اس بات کی ضرورت ہے کہ میر کے لب ولہجہ کو نظر انداز کیا جائے اور اس کے کندھے پر رکھ کر بندوق نہ چلائی جائے۔ میر کی شاعری اور اس کے لب ولہجہ کی نرمی اور شدت تسلیم۔ لیکن نئے شاعروں کے ہاں جب یہ لب ولہجہ نظر آتا ہے جو کچھ چھوٹے ہوئے کا اتوسول کا احساس ہوتا ہے۔ میکیس نے جب یہ دیکھا کہ ایلیٹ اس پر حاوی آ گیا ہے تو اس نے اس سے جان چھڑانے اور اپنی انفرادیت ، سوچ بچار کر برقرار رکھنے کے لئے ایلیٹ کو پڑھنا ہی چھوڑ دیا۔ اسی طرح اس وقت میر اور اس کے اثر سے بچنے کی ضرورت ہے تا کہ کہیں وہ ہمارے اعصاب پر ایسا سوار نہ ہو جائے کہ ہمیں کہیں کا نہ رکھے۔

اعظمی کے ہاں امیج (Image) تخلیق کرنے کی کوشش کا بھی احساس ہوتا ہے یہ ضرور ہے کہ ان کے ہاں کوئی بھی امیج مکمل نہیں ہو پائی۔ لیکن اس سے ان کے مستقبل پر اچھی روشنی پڑتی ہے اسی لئے اگر کوئی شاعر انسانی معاشرہ کو ایک جامعہ امیج دیدے تو بس وہ فرض شعری سے پورے طور پر سبکدوش ہو جاتا ہے اور یہ بات برسوں میں ایک بار ہوتی ہے۔ بہر حال یہ تو ایک الگ موضوع ہے۔ مجھے تو صرف اتنا کہنا ہے کہ اگر اعظمی اپنی موجودہ شہرت سے مطمئن نہ ہوئے اور انہوں نے اپنی تخلیق کے ساتھ فن کاروں کی سی سچی محنت کی تو شاید وہ اردو شاعری کو بہت کچھ دے سکیں۔

تبصرہ (پیت کی ریت)

''پیت کی ریت'' خواجہ دل محمد دل کی تصنیف ہے۔ یہ دوہوں کا مجموعہ ہے دل صاحب نے اس میں پانچ سو (۵۰۰) دوہے شامل کئے ہیں۔ جس میں ہندی کے عام الفاظ کے ساتھ ساتھ عربی فارسی کے الفاظ بھی اس طرح استعمال کئے گئے ہیں۔ کہ شاعری میں موسیقیت کا احساس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''پیت کی ریت'' پر جو تبصرہ کیا ہے اس میں سب سے پہلے دوہے کی خاصیت بیان کی ہے۔ ادب میں دوہے کا کیا مقام ہے۔ اس کے بعد تبصرہ کیا ہے اور آخر میں اچند اشعار بھی شامل کئے ہیں۔ دوہا ہندی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس صنف کو اردو زبان میں بھی اپنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

جدید شعراء نے اپنی شاعری کو نیا رنگ دینے کے لئے دوہے کہنے شروع کئے۔ اس میں انہیں مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ کبیر، نانک اور تلسی داس کے دوہے عام فہم اور اردو زبان سے کافی قریب ہیں۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ کبیر، نانک اور تلسی داس کا ذکر اردو شاعری کی تاریخ میں نہیں آیا۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی۔

''یہ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہم نے نانک، تلسی داس اور بالخصوص کبیر کا ذکر بھولے سے بھی اردو شاعری کی تاریخ میں نہیں کیا۔ اور ان سب کو خالص ہندی کا شاعر ہی سمجھتے رہے۔'' [۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی دوہے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''دوہا ایک ایسی صنف شاعری ہے جس میں ایک خیال یا تاثر احساس دو مصرعوں میں ادا کرنا ہوتا ہے اور اس بات کا اہتمام خاص طور پر کیا جاتا ہے کہ لفظوں کی بندش انتخاب اور قوت اظہار اس طرح کی ہو کہ سننے یا پڑھنے والے پر اس کا اثر بھرپور اور گہرا ہو۔ دونوں مصرعوں میں قافیہ کا اہتمام بھی ہوتا ہے، مضمون کی کوئی قید نہیں ہوتی، ہر قسم کے مضامین خیالات، مشاہدات، تجربات، تصورات اور محسوسات، مدرکات اس صنف کے ذریعہ پیش کئے جاسکتے ہیں۔'' [۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''پیت کی ریت'' پر مختصر اور عمدہ تبصرہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''حال ہی میں ''پیت کی ریت'' کے نام سے ہمارے دیرینہ سال بزرگ خواجہ دل محمد صاحب دل نے اپنے دوہوں کا مجموعہ، جس میں پانچ سو دوہے شامل ہیں، نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے ان دوہوں کو بہ اعتبار موضوع دس حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور وہ سارے دوہے جو ایک موضوع سے متعلق تھے ایک جگہ کر دیئے گئے ہیں، اس مجموعے کے بیشتر دوہے جاندار رسیلے معصوم بھولے بھالے اور معشوقہ دلجو کی صفات کے حامل ہیں۔ ان میں ہندی کے عام فہم الفاظ استعمال کئے ہیں بحر بھی وہی استعمال کی گئی ہے۔ جو دوہوں کے لئے مخصوص ہے۔ ہندی فارسی وعربی کے الفاظ اس طور پر شیر وشکر ہو گئے ہیں کہ کہیں بھی گرانی اور بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا۔ لفظوں کی نشست وبرخاست اور انتخاب اس طور پر کیا گیا ہے کہ شاعری کی دیوی سولہ

۱، ۲ نیادور کراچی شمارہ ۱۳۔۱۴ص ۴۴۴ ، ۴۴۵

سنگھار کیے اپنی دلفریبیوں اور محبوبیت سے ایک نظر میں گھائل کر دیتی ہے۔ شعریت موسیقی اور اثر آفرینی پورے مجموعے میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ ان دوہوں کا کمال تنوع دیکھ کر اس بوڑھے سخنور کی غیر معمولی صلاحیت کی داد دینی پڑتی ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اگلے وقتوں کے لوگوں میں تخلیقی صلاحیت ہماری نسل کے لوگوں سے کہیں زیادہ ہے اور یہ لوگ سو پچاس صفحے کا مجموعہ چھپوا کر تھک نہیں جاتے بلکہ ان کی تخلیقی صلاحیت اور اس کا ذہنی ارتقاء مسلسل جاری رہتا ہے۔[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے خواجہ دل محمد کے دوہوں کے کچھ عمدہ نمونے پیش کئے ہیں جن میں دو مندرجہ ذیل ہیں:

"وہ روٹی سے تنگ ہیں جن کے منہ میں دانت
روٹی ان کے پاس ہے جن کے دانت نہ آنت
تیرے نرمل گیت سے جاگے من میں پیت
پھول کہیں یہ رنگ ہے کان کہیں یہ گیت۔" [۲]

تبصرہ (دیوانِ ناطق)

ڈاکٹر جمیل جالبی "دیوانِ ناطق" پر تبصرہ کرتے ہیں۔

"ناطق لکھنوی اردو غزل کے پرانے اساتذہ میں سے ایک تھے۔ جنھوں نے فنِ شعر کی پچاس سال خدمت انجام دی ہے۔ وہ جید عالم بھی تھے۔ پختہ کار ادیب اور پرگو شاعر بھی۔ انھوں نے شاعری میں ہمیشہ سوقیانہ اور بازاری خیالات کو عیب سمجھا۔ ناطق لکھنوی نے غزل سے مرگ وگریہ ماتم و نوحہ کے مضامین کو خارج کیا۔ انھوں نے غزل سے شکست خوردگی اور فراریت کے عناصر کو بھی دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے غزل میں لطفِ احساسات اور سنجیدہ و شستہ تجربوں کو پیش کیا جس سے ان کے مزاج شاعری میں ایک انفرادیت پیدا ہوگئی ہے۔ طباعت، کتابت گٹ اپ اور

---

۱ ۲ نیادور کراچی شمارہ ۱۳۔۱۴ ص ۴۴۵ / ۴۴۷

جلد بندی وغیرہ کے اعتبار سے یہ دیوان بہت نفیس اور جاذب نظر ہے۔''[۱]

تبصرہ (آیاتِ جمال)

ڈاکٹر جمیل جالبی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''حال ہی میں جب'' آیاتِ جمال'' کے نام سے ذہین شاہ تاجی کا مجموعۂ کلام دیکھنے کوملاتو میں نے اسے بڑے شوق سے لیا۔ بڑے چاؤ سے پڑھا اور بہت سے اشعار پر سر دُھنا۔ ذہین شاہ صاحب کا کلام پڑھ کر سب سے پہلا تاثر یہ تھا کہ وہ ایک عاشق صادق ہیں۔ جن کا دل عشق کی آگ سے ہر دم سلگتا رہتا ہے۔ اور وہ انسان و کائنات کے سارے مسائل کو عشق کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ ان کے ہاں محبوب کا کوئی روپ نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ سب کچھ، یہ زمین و آسمان، یہ ذرّے اور کائنات سب اسی کے روپ ہیں یہاں عاشق ومعشوق، شاہد وشاہد باز، حقیقت ومجاز، سوز اور ساز، ناز اور نیاز دور اور پاس ماضی وحال سب ایک بن کر سامنے آتے ہیں۔ چونکہ شاعر کے طرزِ احساس میں ہر چیز ایک ہے اس لئے محبوب کی کوئی شکل وصورت مرتب نہیں کی جاسکتی ہاں مجرد عشق کی شخصیت اور اس کے خدوخال بہت نمایاں ہیں۔ اچھے غزل گو کے کلام سے آپ اس کے محبوب کی تصویر بناسکتے ہیں۔''[۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی آگے لکھتے ہیں'' میں جو کچھ کہہ رہا ہوں آپ اسے چند اشعار میں دیکھئے۔

عشق منسوب تھا کبھی تم سے ۔ آج تم بھی ہو عشق سے منسوب

میں نہیں میں نہ آج تم ہو تم ۔ ہو گئے ایک طالب ومطلوب

عشق تنہا حقیقتِ عالم ۔ یہ حقیقت مجاز سے محجوب

ذہین شاہ تاجی کا یہ مجموعۂ کلام اردو شاعری کی اس روایت کا ایک حصہ ہے جس نے میرزا مظہر جانجاناں' میر درد' نیاز بریلوی، اصغر گونڈوی اور میکش اکبرآبادی جیسے شعراء پیدا کیے۔ ان سب شعراء کرام کے کلام میں جو فرق ہے وہ خود ان کی اپنی واردات کیفیات اور روحانی تجربات کا فرق ہے۔ اسی عمل سے ان کی

---

[۱] نیا دور کراچی، شمارہ ۱۵۔۱۸ ص ۳۰۲۔۳۰۳

[۲] نیا دور کراچی شمارہ ۴۳۔۴۴ص۳۷۹۔۳۸۶

بڑائی اور درجوں کے فرق کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ تصوف کی روایت اب تعویز گنڈوں اور جھاڑ پھونک تک محدود رہ گئی ہے لیکن وہ نور اور روشنی جو اسنے علم و ادب شعروشاعری اور فلسفۂ حیات کے ذریعہ معاشرے کی رگ و پے میں داخل کی تھی اب رفتہ رفتہ ختم ہوتی جاتی ہے (اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذہین شاہ تاجی اس روایت کی شاید آخری کڑی ہیں۔ خدا انہیں عمرِ خضر عطا فرمائے) یہ بات یاد رکھئے کہ اردو زبان کے بغیر تصوف خود ادھورہ رہ جاتا ہے اور جب تک اہل تصوف پاکستان میں اردو زبان کو اپنے مزاج میں رسا بسا کر اس روایت کو آگے نہیں بڑھائیں گے تصوف کے چراغوں کی روشنی مدھم ہوتی چلی جائے گی۔ آخر تیل کے بغیر چراغ کب تک روشن رہ سکتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں کہ "صحتِ زبان کے ساتھ وہ پیچیدہ احساس و خیال کو اسی لیئے اپنے لفظوں میں یوں آسانی سے ادا کر جاتے ہیں کہ ان کے اشعار ہمارے دلوں کے ترجمان بن جاتے ہیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ چند اشعار سنئے۔

بھیس بدلے ہوئے جیسے شبِ تنہائی ہے
اس ادا سے بھی ملاقات کی رات آئی ہے

بے خودی میں وہ مرے سانس کی خوشبو تھی جسے
میں نے سمجھا ترے دامن کی ہوا آئی ہے

میرا خیال ہے کہ ذہین شاہ تاجی کی شاعری ہمیں عشق کے عظیم تصور سے محبت کرنا ضرور سکھا دیتی ہے۔

تبصرہ (بنگال کا پوتھی ادب)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے بنگال کا پوتھی ادب پر بہت مختصر تبصرہ پیش کیا ہے۔ اس کے ناشر ادارہ مطبوعات پاکستان۔ کراچی ہیں ڈاکٹر جالبی لکھتے ہیں۔

"مسلمانوں کا یہ مزاج رہا ہے کہ وہ جہاں کہیں پہنچے، انھوں نے نہ صرف اپنے علوم کی اشاعت کی بلکہ دوسروں کے علوم کو بھی اسلامی دنیا تک پہنچایا۔ بنگال پر ان

کوششوں کا اثر دوررس ہوا، اور وہاں کی عوامی زبان اور عوامی ادب بھی اس رنگ میں رنگ گئے۔ بنگالی زبان کا وہ منظوم حصہ جو پوتھی ادب کہلاتا ہے اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ پوتھی ادب، بنگالی زبان کا وہ پرانا ادب ہے جس کی نشو ونما زیادہ تر مسلمانوں کے ہاتھوں ہوئی۔ پوتھی ادب کی اہمیت اس لئے پاکستان بننے کے بعد زیادہ ہوگئی کیونکہ اس میں ''اسلامی موضوعات کو عوام کی صاف اور سادہ زبان میں نظم کرنے'' کی کوشش کی گئی تھی۔'' اور فارسی اور عربی کے الفاظ ومحاورات بلا تکلف بنگلہ میں استعمال کئے گئے تھے۔ ''بنگال کا پوتھی ادب'' اس اعتبار سے بہت مفید کتاب ہے کہ اس سے پوتھی ادب کا بہت اچھا تعارف ہوجاتا ہے۔''[1]

تبصرہ (فرہنگ اصطلاحات فلسفہ)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''فرہنگ اصطلاحات فلسفہ'' (انگریزی اردو) پر مختصر سا تبصرہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''حال ہی میں کراچی یونیورسٹی نے اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا ہے۔ جیسے الفاظ ہمارے خیال کی علامتیں ہیں۔ اسی طرح اصطلاحات کسی علم کے خیال کی علامتیں ہیں۔ اہل علم ان سے مانوس ہوتے ہیں۔ ایک انگریزی اصطلاح 'ACCIDENTLISM' لیجے۔ اسکے کیا معنی ہیں فلسفہ میں یہ کس کس طور پر استعمال ہوتی ہے۔ یہ ہمیں اس وقت تک معلوم نہیں ہوسکتا جب تک ہم فلسفہ کا مطالعہ نہ کریں اور اس علم کو نہ سیکھیں۔ اس مسئلہ پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ اردو یو ں ہی اپنوں اور غیروں کی غفلت کا شکار رہے گی زیرِ نظر فرہنگ اصطلاحات فلسفہ ایک اہم علمی کام ہے اور اردو زبان میں کام کرنیوالوں کے لئے ایک راستہ کھولتا ہے، کراچی یونیورسٹی نے خوبصورت ٹائپ میں، عمدہ کاغذ پر اسے شائع کیا ہے۔''[2]

۱؎ نیا دور کراچی شمارہ ۳۔۴ ص ۳۸۶

۲؎ نیا دور کراچی شمارہ ۳۱۔۳۲ ص ۳۳۵ ۔ ۳۳۶

تبصرہ (سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے)

ڈاکٹر جمیل جالبی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ڈاکٹر حسینی شاہد قدیم اردو کے ان فاضل محققوں میں سے ایک ہیں جن کی تحریروں اور تصانیف نے طالبانِ ادب کے علم میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے'' سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ: حیات اور کارنامے'' ہر لحاظ سے ایک ایسی کتاب ہے جس کو پڑھ کر ایسی بہت سی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔ امین الدین اعلیٰ اور ان کے خاندان کے حالات مستند مآخذ کے حوالوں سے تحریر کئے ہیں۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے اس کتاب کے لکھنے میں بڑے جگر کاوی اور جان سوزی کا ثبوت دیا ہے اور ایسے مآخذ کو استعمال کیا ہے جو اس سے پہلے کہیں استعمال نہیں ہوئے تھے۔'' ڈاکٹر جمیل جالبی کے خیال میں ''اس کتاب کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر حسینی شاہد ایک صاف ذہن کے مالک ہیں اور انھیں مواد کے ڈھیر میں سے موتی چننے کا ہنر آتا ہے، نہ صرف موتی چننے کا بلکہ انہیں ربط دے کر خوبصورت ہار بنانے کا بھی پورا سلیقہ ہے۔ '' حالات'' کا باب یقیناً اپنی جگہ اہم ہے لیکن جس طور پر انھوں نے خاندانِ امینیہ کے نظامِ تصوف کو سمجھایا ہے یہ ایک ایسا کام ہے جس سے اہل تحقیق دامن بچاتے ہیں اور شاہد صاحب نے اس باب کو پوری محنت و کاوش سے لکھا ہے۔ ایک نہایت اہم باب مطالعۂ زبان ہے جس میں ڈاکٹر حسینی شاہد نے نہ صرف صرفی و نحوی نقطۂ نظر سے حضرت امین الدین کی تصانیف کا جائزہ لیا ہے بلکہ حضرت امین کی زبان کا میراں جی اور جانم کی زبان سے تقابلی مطالعہ بھی کیا ہے۔ یہ باب اپنی نوعیت اور طرزِ مطالعۂ کے اعتبار سے منفرد ہے۔ اس کتاب کی محنت کی داد اتنے مختصر سے تبصرے میں نہیں دی جاسکتی۔ میں اس تصنیف کو اردو ادب میں ایک گراں بہا اضافہ سمجھتا ہوں اور گذشتہ دس سال میں لکھی جانے والی اس نوع کی تصانیف میں اسے بہت بلند مقام دیتا ہوں۔''[1]

---

[1] نیادور کراچی شمارہ ۷۳-۷۴، ص ۳۷۷-۳۷۸

تبصرہ (فکروفن)

''فکروفن'' جناب خلیل الرحمن اعظمی کی تصنیف ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی ''فکروفن'' پراس طرح تبصرہ کرتے ہیں کہ

''تخلیق فن کار ہی تنقید کا کام کرلیا کرتا تھا۔اور اپنے فن کی تخلیق کے سلسلے میں اسے جو تجربات ہوتے تھے ان کا اظہار کرتا تھا۔لیکن جب سے تنقید نگاری ایک الگ پیشہ بنا ہے (اور یہ کوئی ایسی بری بات بھی نہیں ہے) تو نقاد حضرات، میں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے جن کے پاس نہ تو گرہ میں کچھ ہے اور نہ وہ نظر ہے جو تنقید کے لئے ہونی چاہئے۔نقاد کہیں تاریخی مغالطے کے چکر میں تو کہیں ذاتی مغالطے میں ایسا پھنس کر رہ گیا ہے کہ کبھی تو وہ ترازو لے کر بلیوں کا قضیہ نمٹا تا نظر آتا ہے اور کبھی وہ پاسنگ نکالتا رہ جاتا۔تنقید کے لئے جس مذاق، مطالعے، نظر اور بصیرت کی ضرورت پڑتی ہے وہ بس خال خال نظر آتے ہیں۔اردو کے وہ نقاد جن کے نام ہماری زبانوں پر بار بار آتے ہیں۔ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے (اور اس میں ناراض ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے) جس نے کسی موضوع پر کوئی مستقل کتاب لکھی ہو۔زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے کہ جو طالب علموں کی ضرورت یا لیکچر کی تیاری کے سلسلہ میں تیار کئے ہوئے اشارات کی مدد سے مضمون لکھتے ہیں اور یہی مضامین جب پانچ سات ہوجاتے ہیں تو کتابی شکل میں پیش کردیئے جاتے ہیں۔اردو ادب کی اب تک تنقیدی و تہذیبی تاریخ نہیں لکھی جاسکتی ہے۔اردو کے شاعروں پر الگ الگ مستقل تصانیف انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں۔نظریائی مسائل پر کوئی ڈھنگ کی کتاب نہیں ملتی۔''[1]

ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں۔

''بہرحال ان حالات میں جب کوئی نیا تنقیدی مجموعہ سامنے آتا ہے تو ذہن میں رہ رہ کر یہی خیال پیدا ہوتے ہیں۔اعظمی صاحب نے آٹھ دس سال پہلے آتش پر مختلف پہلوؤں سے مضامین لکھنے شروع کئے تھے۔پھر میں تو سمجھا تھا کہ چلئے آتش پر

---

[1] نیادور کراچی شمارہ ۱۱۔۱۲ ص ۴۵۷ ۔ ۴۵۹

ایک نوجوان ادیب کچھ لکھ رہا ہے۔ اور یہ آتش پر پہلا تنقیدی کام ہوگا، پھر اللہ جانے کیا ہوا اعظمی صاحب بڑے ہونہار آدمی ہیں مجھے ان سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ اگر وہ صلاحیتوں کو ایسے کاموں میں صرف کریں تو اچھا کام کر سکتے ہیں۔ حال ہی میں ان کا تنقیدی مجموعہ 'فکروفن' کے نام سے شائع ہوا ہے اس مجموعہ میں مصنف نے شعراء کے کلام کو جدید تنقیدی تقاضوں اور نئے پہلوؤں کے ساتھ سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ جس میں باسی پن کا احساس نہیں ہوتا بلکہ جرات مندی کے ساتھ شاعر کے مزاج اور شخصیت کو پانے کی کوشش ملتی ہے اس مجموعہ میں فراق صاحب کا اثر بھی نمایاں ہے 'فکروفن' کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نئے لوگوں نے اس کامیابی سے ہمارے شاعروں کو سمجھنے کی کوشش کم کی ہے۔ غالب اور عصرِ جدید بہادر شاہ ظفر، حسرت کے شاعرانہ مرتبہ کا تعین اس مجموعہ کے کامیاب اور اچھے مضامین ہیں''[1]

تبصرہ (تارِ پیراہن)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے شان الحق حقی کی تصنیف ''تارِ پیراہن'' پر تقریباً ساڑھے چار صفحات کا تبصرہ کیا ہے وہ نوجوان فن کاروں کی مخفی صلاحیتوں کو بھانپ کر نہ صرف دنیا کے سامنے لاتے ہیں۔ بلکہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو مناسب راہ پر لگانے کی کوشش کرتے ہیں حقی کے مجموعہ کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''حقی نے غزلیں بھی کہی ہیں، چھوٹی بڑی نظمیں بھی لکھی ہیں اور ترجمے بھی کئے ہیں لیکن ان سب میں ایک مزاج اور ایک فضا کارفرما نظر آتی ہے۔ اور وہ ہے زبان و بیان کی قدرت اور جذبات کو دھیمے لہجے میں ڈھالنے کی اہلیت۔ ایک طریقہ تو ان کے ہاں یہ ہے کہ وہ ردیف اور قافیے کے انوکھے پن سے کام لیتے ہیں۔ اور جب مصرع ختم ہوتا ہے تو ذہن میں ایک کھٹک اور چبھن کا احساس باقی رہ جاتا ہے۔ ماضی کی یادیں، ماضی کی تہذیبی صحت مندی، ماضی کا گہرا احساس حقی کا محبوب رویہ ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی آگے فرماتے ہیں۔ ''کیا اچھا ہو کہ حقی اس تجربے کو پھیلائیں،

---

[1] نیا دور کراچی شمارہ ۱۱۔۱۲ ص ۴۵۷۔۴۵۹

اپنے احساس ماضی اور ان کی یادوں کو پورے طور پر کام میں لائیں اور ایک مثنوی شہر آشوب (جو مثنوی کی مروجہ بحر میں نہ ہو) اسی تجربے کی نہج پر لکھ ڈالیں۔ جس میں حال کے دریچوں سے ماضی کو دیکھا جائے، قطب کی لاٹ کی آخری منزل سے نیچے کی طرف اور بھی نیچے سے آخری منزل کی طرف دیکھا جائے اور ساتھ ساتھ اس زیر و بم اور نشیب و فراز کے اس کرب کا، بدلتی قدروں، اور شعور و ادراک کا احاطہ کیا جائے جن سے آج یہ ساری نسل دوچار ہے۔ بہر حال میرا تو یہ خیال ہے کہ اس روحانی اور ذہنی انتشار کا اس سے بہتر اور کیا ذریعۂ اظہار ہوسکتا ہے۔ ایک بات اور حقی میں دوہے کہنے کی بھی بڑی صلاحیت ہے۔ مجھے تو ان کے ہاں دو چار جگہ یہ احساس ہوا کہ نظموں کی تعمیر ہی دوہوں کے مزاج پر کی گئی ہے۔ بنیادی جذبہ اصل میں دوہوں ہی کا تھا۔ دوہا تو خود غزل کا ایک تیکھا شعر ہوتا ہے۔ جس میں میٹھے میٹھے رسیلے لفظوں کے خوب صورت جماؤ سے اور شہد گھلنے لگتا ہے۔ بھلا کیا یہ شعر دوہے نہیں ہیں ۔

چال اٹکھیلی دھوم مچائے کوسوں کوس دہائی
روپ سجیلا، گن ہیں کالے رات یہ کیسی آئی

جلتا جیون جگمگ سپنے دیکھے اور رہ جائے
کیا پھولے وہ ڈالی جس کو آس ہی راس نہ آئے

حقی صلاحیتوں کے آدمی ہیں۔ ان کی سج دھج میں بانکپن ضرور ہے لیکن ان کی منزل ابھی بہت دور ہے۔ کیا اچھا ہو اگر وہ اپنی عمر کے دوسرے شاعروں کی طرح ایک آدھ مجموعہ کے بعد تھک کر نہ بیٹھ جائیں اور تھوڑی سی شہرت اور مشاعروں کے دعوت ناموں کو معراج زندگی نہ سمجھ کر آگے اور آگے بڑھنے کی طرف لگے رہیں تا کہ وہ ایسے شعر تخلیق کرسکیں جن کی آرزو انھوں نے خود کی ہے۔

حسن تاثیر کو صورت سے نہ معنی سے غرض
شعر وہ ہے کہ لگے جھوم کے گانے کوئی شخص'' [۱]

---

[۱] نیا دور کراچی شمارہ ۱۳-۱۴ ص ۳۳۶-۳۴۰

تبصرہ (جدید غزل)

'جدید غزل' کے مصنف رشید احمد صدیقی ہیں۔ جس پر ڈاکٹر جمیل جالبی تبصرہ کرتے ہیں۔

''رشید احمد صدیقی نے ایک طرف تو غزل کے مزاج کو اجاگر کیا ہے اور دوسری طرف اس مزاج کی روشنی میں جدید اردو غزل کا جائزہ لیا ہے۔ غزل کی کسی ایک علامت کو لے کر اگر اس کا مطالعہ پوری اردو غزل کو سامنے رکھ کر کیا جائے تو ہم ہر ہر علامت سے اپنے عروج و زوال اپنی تہذیب کی تاریخ، اپنے جذبات و احساسات کو داستان قلمبند کر سکتے ہیں صرف گل و بلبل کی علامتوں کو سامنے رکھ کر ہر دور کی غزل کو دیکھئے تو ہمارے ذہن اور اردو کلچر کی پوری تاریخ اس سے مرتب کی جا سکتی ہے۔''

ڈاکٹر جمیل جالبی غزل پر اعتراض کے اسباب لکھتے ہیں ''اب تک غزل پر جو اعتراض ہوئے ہیں۔ وہ خواہ حالؔی نے کئے ہوں یا شبلؔی نے ان میں یہ جذبہ پوشیدہ تھا کہ غزل کو اس کے عیوب سے پاک کر کے اسے بدلتے زمانے کے مطابق ڈھالا جائے۔ گویا غزل پر اعتراض اس لئے نہیں کیا گیا تھا کہ اسے ترک کر دینا چاہئے بلکہ اس لئے کیا جاتا تھا کہ اسے ایک نئے مزاج میں ڈھال کر عہد حاضر کی روح کے ساتھ اپنے تصرف میں لایا جائے۔ اقبالؔ نے غزل کو استعمال کیا تو عہدِ حاضر کی روح نے اسکے مزاج اور طرز ادا کو نکھار کر اردو کو ایک نیا اسلوب دیا۔''

''ڈاکٹر جمیل جالبی آگے لکھتے ہیں کہ ''یہ کتاب بہت معمولی کتابت وطباعت اور گیٹ اپ کے ساتھ شائع ہوئی ہے معلوم نہیں کہ ہماری زبان کے ناشرین کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اچھی کتابیں برے گیٹ اپ کے ساتھ اور بُری کتابیں اچھے گیٹ اپ کے ساتھ شائع کر کے اپنی عاقبت سنوار رہے ہیں۔''[1]

تبصرہ (تذکرہ صوفیائے پنجاب)

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے کہ ''تذکرہ صوفیائے پنجاب مولانا اعجاز الحق قدوسی کی تصنیف ہے۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی گزشتہ پانچ چھ سال سے پاکستان کی تاریخ

---

[1] نیا دور کراچی شمارہ ۴۵۔۴۶ ص ۳۸۵ ۔ ۳۸۸

تصوف مرتب کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے کی سب سے پہلی کتاب تذکرہ صوفیائے سندھ شائع ہو کر علمی حلقوں میں مقبول ہو چکی ہے۔ اس کتاب پر پنجاب یونیورسٹی نے مصنف کو انعام بھی دیا تھا۔

دوسری کتاب شیخ عبدالقدوس گنگوھی اور ان کی تعلیمات کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ جس میں مصنف نے اس عظیم ہستی کی نہ صرف سوانح عمری مرتب کی ہے بلکہ سلسلہ چشتیہ صابریہ کی مکمل تاریخ بھی پیش کردی ہے۔ یہ کتاب گزشتہ ۷۵۰ سالوں میں اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں سب سے زیادہ وقیع ہے۔ حال ہی میں اسی سلسلے کی کتاب تذکرہ صوفیائے پنجاب شائع ہوئی ہے۔[۱]

تبصرہ (اُردو ادب میں رومانوی تحریک)

''اردو ادب میں رومانوی تحریک'' کے مصنف ڈاکٹر محمد حسن ہیں۔ جس پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے تبصرہ رقم کیا ہے۔

''رومانیت اور کلاسیکیت کی اصطلاحیں تو اُردو ادب میں انگریزی اور یوروپی ادب کے اثرات کے ساتھ ساتھ بیس پچیس سال ہی سے زیادہ رواج پذیر ہوئی ہیں۔ جو ضابطے اور قاعدہ قانون قدیم ادب نے مقرر کردیے تھے، اس کا اتباع اصل ایمان ٹھہرا۔ اس دور میں شاعری پرشکوہ اور بھاری بھرکم لفظوں سے مملو ہوگئی اور صحتِ الفاظ و بیان پر حد درجہ زور دیا جانے لگا۔ عقلیت، اصول پرستی، تقلید اور میانہ روی کلاسیکیت کی بنیادی قدریں قرار پائیں۔ لیکن اس کے برخلاف اصول پرستی، تقلید اور میانہ روی کے خلاف انحراف اور بغاوت، نئے نئے تجربوں کی تلاش، تخیل کی آزادانہ پرواز رومانویت کی قدریں قرار پائیں۔

مختصر یہ کہ رومانویت کے ساتھ تین مفہوم وابستہ ہو گئے۔ اولاً عشق و محبت سے متعلق تمام چیزوں کو رومانوی کہا جانے لگا۔ ثانیاً غیر معمولی آراستگی، شان و شکوہ اور محاکاتی تفصیل پسندی کو رومانوی کا نام دیا گیا اور ثالثاً عہد وسطیٰ سے وابستہ تمام چیزوں

---

[۱] نیا دور کراچی شمارہ ۲۹ - ۳۰ ص ۲۶۵

سے لگاؤ اور قدامت پسندی اور ماضی پرستی کو بھی اسی زمرہ میں شامل کرلیا گیا۔''

ڈاکٹر جالبی آگے لکھتے ہیں۔''رومانیت نے کلاسیکی سانچوں میں بھی اپنا تصرف کیا۔ہمیں چاہئے کہ ہم رومانویت کو محض ایک مخصوص ضابطہ سمجھنے کے بجائے اسے ایک زاویۂ نظر سمجھیں۔رومانوی تحریک ایک نئے عہد کا اشاریہ تھی اس نے واضح کردیا کہ وہ نئی نسل جس کے خواب اور اندیشے سرسید اور حالی کے زیراثر پروان چڑھے تھے اب ادبی طور پر سرِ میدان آگئی ہیں۔نئی نسل سرسید کے مصلحانہ روش سے مطمئن نہ تھی۔ رومانویت کا تاریخی مرتبہ یہ ہے کہ اس نے نئے تعلیم یافتہ طبقہ کو خودآگہی کی روشنی عطا کی،اس نے ادب کو نہ تو حالی سے قبل کی کلاسیکی طرز میں محدود کیا،جس میں روایت زیادہ تھی اور داخلی تجربہ بہت کم اور نہ حالی کی طرح کائنات میں گم ہوکر اس کو محض تبلیغ کا ذریعہ قراردیا۔ اس کے نزدیک جذباتی تجربہ کی بڑی اہمیت تھی۔اس کے علاوہ رومانویت کا کمزور پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ رومانوی ادیب کے پاس ایک مبہم بے اطمینانی اور ایک موہوم آرزومندی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔''[1]

تبصرہ (کاغذی پیرہن)

ڈاکٹر جمیل جالبی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''خلیل الرحمٰن اعظمی اردو شاعری کی جدیدتر نسل کے ان شعراء میں سے ہیں۔ جن کی نظموں اور غزلوں کو لوگوں نے پڑھا اور پسند کیا ہے۔'' کاغذی پیرہن'' اسی شاعر کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے۔واحد متکلم کا صیغہ ان کے کلام میں بار بار آتا ہے۔اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ اعظمی کا کلام ان کی ذات کا آئینہ دار ہے۔اور ان کی اپنی زندگی کی کہانی۔وہ اکثر نظمیں خود سے مخاطب ہوکر لکھتے ہیں۔یہ بات اچھی بھی ہے اور بری بھی اچھی ان معنی میں کہ جو کچھ شاعر کہہ رہا ہے وہ اسے شدت کے ساتھ محسوس کر کے کہہ رہا ہے اور بُری اس طرح کہ اگر تجربہ گہرا نہیں ہے اور اپنی ذات اور اس سے پیدا ہونے والا احساس اپنے اندر وہ عمومی جاذبیت نہیں رکھتا جس سے قاری کو دلچسپی پیدا ہو

---

[1] نیادور کراچی شمارہ ۵۔۶ ص ۳۳۹ ۔ ۳۴۲

سکے۔تو اس صورت میں شاعری ایک قسم کی ذاتی ڈائری سی بن کر رہ جاتی ہے لیکن اگر شعری تجربہ گہرا ہوا اور لکھنے والے کو اپنی ذات کا عرفان بھی ہو جائے تو ہی چیز بڑی اہم بن جاتی ہے۔شاعری نہ تو شاعر کا خالصاً نجی معاملہ ہے اور نہ کسی سیاست کی نعرہ بازی ہے۔"

ڈاکٹر جالبی آگے لکھتے ہیں "اعظمی نے اپنی شاعری میں ہندو دیو مالا کی ضمنیات اور رمزیات سے کافی استفادہ کیا ہے وہ ہندی کے کومل اور میٹھے لفظوں کو بھی اکثر استعمال کرتے ہیں۔اس سلسلہ میں وہ میرؔ کا دامن بھی پکڑتے ہیں اور پھر ایک اعظمی ہی کیا اب تو یہ بات ایک فیشن بن گئی ہے کہ شعراء میرؔ کی بحروں، میرؔ کے لفظوں اور اس کے لہجہ کا سہارا لے کر شعر کہنے لگے ہیں۔ایسے شعروں میں نرمی اور گھلاوٹ ہونے کے باوجود یہ احساس ضرور ہو جاتا ہے کہ شاعر کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا، اسے ایک سہارے کی ضرورت تھی، سو میرؔ نے اسے دے دیا۔اس طرح میرؔ نے نئے شاعروں کو بہت کچھ دینے کے باوجود انہیں خراب بھی بہت کیا ہے۔اس وقت اس بات کی ضرورت ہے کہ میرؔ کے لب ولہجہ کو نظر انداز کیا جائے اور اس کے کندھے پر رکھ کر بندوق نہ چلائی جائے۔میرؔ کی شاعری اور اس کے لب ولہجہ کی نرمی اور شدّت تسلیم، لیکن نئے شاعروں کے ہاں جب یہ لب ولہجہ نظر آتا ہے تو کچھ چھوٹے ہوئے کا اتو سول کا احساس ہوتا ہے۔میکیس نے جب یہ دیکھا کہ ایلیٹؔ اس پر حاوی آ گیا ہے تو اس نے اس سے جان چھڑوانے اور اپنی انفرادیت، سوچ بچار کو برقرار رکھنے کے لئے ایلیٹؔ کو پڑھنا ہی چھوڑ دیا۔اسی طرح اس وقت میرؔ اور اس کے اثر سے بچنے کی ضرورت ہے تا کہ کہیں وہ ہمارے اعصاب پر ایسا سوار نہ ہو جائے کہ ہمیں کہیں کا نہ رکھے۔

اعظمی کے ہاں امیج (IMAGE) تخلیق کرنے کی کوشش کا بھی احساس ہوتا ہے یہ ضرور ہے کہ ان کے ہاں کوئی بھی امیج مکمل نہیں ہو پائی۔لیکن اس سے ان کے مستقبل پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔اس لئے کہ اگر کوئی شاعر انسانی معاشرہ کو ایک جامع امیج دے

دے تو بس وہ فرضِ شعری سے پورے طور پر سبکدوش ہو جاتا ہے اور یہ بات برسوں میں ایک بار ہوتی ہے۔ بہر حال یہ تو ایک الگ موضوع ہے۔ مجھے تو صرف اتنا کہنا ہے کہ اگر اعظمی اپنی موجودہ شہرت سے مطمئن نہ ہوئے اور انھوں نے اپنی تخلیق کے ساتھ فن کاروں کی سی سچی محنت کی تو شاید وہ اُردو شاعری کو بہت کچھ دے سکیں۔'' [1]

تبصرہ (صاحب)

محمد طفیل کی تصنیف ''صاحب'' پر ڈاکٹر جمیل جالبی تبصرہ کرتے ہیں۔

''اردو ادب میں انگریزی ادب کے اثرات کے فروغ پانے کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی مختصر سوانح عمریوں کا بھی اضافہ ہوا جس میں کسی ایک کردار کو صرف اس حیثیت سے نہیں کہ اس نے ادبی، علمی، فنی سماجی یا تعلیمی کیا خدمات انجام دی ہیں بلکہ وہ بحیثیت ایک انسان کے کیسا تھا۔ وہ کون سے خارجی اور داخلی عناصر تھے جن کے باعث اس کی شخصیت جادو اثر بن گئی۔ اور وہ کون سے گوشے تھے جن سے لکھنے والا متاثر ہوا اور جن سے وہ اپنے پڑھنے والوں کو بھی واقف کرانا چاہتا ہے۔

گویا خاکہ ایک ایسی صنفِ ادب قرار پائی، جس میں کسی ایسے انسان کے خدوخال پیش کئے جائیں، کسی ایسی شخصیت کے نقوش ابھارے جائیں جس سے لکھنے والا خلوت اور جلوت میں خوب خوب ملا ہو، اس کی شخصیت کی عظمتوں اور لغزشوں سے بھی خوب واقف ہو، اور اسے ایسے انداز میں، شگفتہ طریقہ پر پیش کرے کہ پڑھنے والا بھی اس شخصیت کے جادو سے واقف ہو کر وہی تاثرات قبول کر سکے جو خاکہ نگار نے محسوس کئے تھے۔ خاکہ نگاری میں قوتِ مشاہدہ، واقعات کو یاد کر کے پیش کرنے کا ڈھنگ، اور ان واقعات کو تاثر کی لڑی میں پرو کر اس سے خوبصورت ہار یا گلدستہ بنانے کا سلیقہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اس طرح اگر دیکھا جائے تو خاکہ نگاری کا فن سیرت نگاری سے کافی الگ سا ہو جاتا ہے۔ دراصل جدید خاکہ نگاری مختصر افسانہ سے بہت قریب ہے۔ اسی وجہ سے

---

[1] نیا دور کراچی شمارہ ۵۔۶ ص ۳۴۳۔۳۴۴

وہ اس قدر مقبول صنفِ ادب بن گئی ہے۔ اتنے جملہ معترضہ کے بعد اگر اس معیار پر ''صاحب'' کو پرکھا جائے، تو وہ پورے طور پر پوری نہ اترنے کے باوجود، ان ادیبوں اور شاعروں کا اتنا تعارف ضرور کرا دیتی ہے جس قدر لکھنے والے نے انہیں دیکھا اور سمجھا ہے۔ کتابت و طباعت اچھی اور سرورق جاذب نظر۔ [۱]

تبصرہ (گلشنِ ہمیشہ بہار)

ڈاکٹر جمیل جالبی ''گلشن ہمیشہ بہار'' پر تبصرہ کرتے ہیں۔

''گلشن ہمیشہ بہار نصر اللہ خاں خویشگی کا لکھا ہوا تذکرہ ہے جو گلشن بے خار مصنفہ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ تذکرہ کی روایت اردو میں فارسی سے آئی لیکن اس روایت نے اتنی ترقی کی کہ خود فارسی روایت پیچھے رہ گئی۔ یوں تو تذکروں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے لیکن چند تذکرے ایسے ہیں جن کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ میر کا تذکرہ نکات الشعراء، ان سب تذکروں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ اب سے پچاس سال پہلے تک بہت کم تذکرے مطبوعہ شکل میں ملتے تھے۔ اور اِدھر اُدھر مختلف کتب خانوں کی زینت بنے ہوئے تھے۔ انجمن ترقی اردو نے اس سلسلہ کو شروع کیا اور مولوی عبدالحق خدا انہیں فردوس بریں میں جگہ دے اس اعتبار سے پہلے شخص تھے جنہوں نے تذکروں کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا۔ جتنے اہم اور بنیادی تذکرے شائع ہوئے ان کی ترتیب و اشاعت کا سہرا انجمن ترقی اردو ہی کے سر ہے۔ اس کے بعد تو گویا اس روایت کے پیر لگ گئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اہم اور غیر اہم تذکروں کا ایک خاصا بڑا ذخیرہ سامنے آ گیا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے، جو علم کے پروانے، تحقیق کے علم اور کتابوں کو مرتب کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں ''گلشنِ ہمیشہ بہار'' کو محنت و کاوش سے مرتب کیا ہے''

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ ''جب شیفتہ کا تذکرہ گلشنِ بے خار، ۱۲۵۰ھ میں مکمل ہوا تو داد کا ڈونگرہ برس پڑا۔ اس تذکرہ کی مقبولیت کا سبب یہ تھا کہ شیفتہ اپنے

۱۔ نیا دور کراچی شمارہ ۵۔۶ ص ۳۳۶ ۔ ۳۳۸

تنقیدی مزاج، ذوقِ شعری، سخن فہمی کی وجہ سے اپنے دور میں ایک منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ شیفتہ کے ذہن میں شاعری کا ایک مخصوص تصور تھا اور وہ اسے ایک 'فن شریف' سمجھتے تھے۔''[۱]

تبصرہ (پسِ پردہ)

ڈاکٹر جمیل جالبی میرزا ادیب کے ڈراموں کے مجموعہ 'پسِ پردہ' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''میرزا صاحب کے ڈراموں کی خصوصیت یہ ہے کہ جہاں انھیں اسٹیج کیا جاسکتا ہے وہاں ان میں ساتھ ساتھ کلوزٹ ڈرامے کے سارے ضروری لوازمات بھی کامیابی کے ساتھ ملتے ہیں۔ اسی لئے یہ ڈرامے ذہن پر دیرپا اثرات قائم کرتے ہیں ''روشنی والا، ایک ایسا ہی ڈرامہ ہے جسے ہم فخر کے ساتھ دنیا کے ادب کے سامنے پیش کرسکتے ہیں۔ 'پسِ پردہ' اردو ادب میں ایک اہم اور قابلِ قدر اضافہ ہے''[۲]

تبصرہ (تاریخ تازہ نوائے معارک)

منشی عطا محمد شکارپوری ''تاریخ تازہ نوائے معارک'' کے مؤلف ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کتاب پر تبصرہ کیا ہے کہ

''احمد شاہ ابدالی کے بعد جس تیزی کے ساتھ یہ اتنی بڑی سلطنت تحلیل ہوئی اس کے اسباب وعوامل آج تک تاریخ ہند کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے پردۂ اخفا میں رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انگریزی مورخوں نے جو کچھ لکھا ہے اول تو یک طرفہ ہے دوسرے کچھ وہ افغانیوں سے انگریزوں کے تعلقات تک محدود ہے۔ اسباب صحیح معنی میں سامنے نہیں آئے۔ ''تازہ نوائے معارک'' پہلی کتاب ہے جو نہ صرف سندھ کی تاریخ کی آئینہ دار ہے بلکہ اس میں احمد شاہی سلطنت کے زوال کے وہ اسباب بھی ملتے ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت تاریخی نقطۂ نظر سے اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ مؤلف خود ان حالات وواقعات کا شاہد عینی تھا۔ کتاب کا سرِ ورق دیدہ زیب، ٹائپ خوبصورت اور طباعت عمدہ ہے''۔[۳]

۱۔ نیادور کراچی شمارہ ۴۵۔۴۶ ص ۳۹۲ ۔ ۳۹۳

۲۔ نیادور کراچی شمارہ ۵۵۔۵۶ ص ۳۰۳ ۔ ۳۰۵

۳۔ نیادور کراچی شمارہ ۲۱۔۲۲ ص ۳۹۳ ۔ ۳۹۵

تبصرہ (بیاض)

''بیاض'' سلیم احمد کا شعری مجموعہ ہے۔ سلیم احمد ۴۷ء کے بعد آنے والے شعراء میں ایک اہمیت کے حامل ہیں بقول ڈاکٹر جمیل جالبی

''جس وقت سلیم احمد کی اردو شاعری پہلی بار متعارف ہوئی تو اس میں فسادات کے شدید تاثرات میں ڈوبی ہوئی کیفیات کا اظہار ہو رہا تھا لیکن یہ کیفیتیں اتنی نمایاں نہیں تھیں جتنی ان کے ہم عصر شاعر ناصر کاظمی کے ہاں ملتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سلیم احمد روایت کی مستحکم اور جاندار تہوں کو ہٹا کر اپنی شخصیت کی آواز کو نمایاں کرنے پر قادر نہیں ہوئے تھے۔ اسی لئے اس دور کی غزلوں میں روایت کا حسن، قدیم شاعری کی علامتوں اور فضا کا خوبصورت اظہار اس طرح ملتا ہے کہ ان کی آواز خود بھی اس روایت کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔''

ڈاکٹر جمیل جالبی مثال کے طور پر دو شعر پیش کرتے ہیں۔

دل تھا اُداس عالمِ غربت کی شام تھی
کیا وقت تھا تم سے ملاقات ہو گئی

عشق کو شاد کرے غم کا مقدر بدلے
حسن کو اتنا بھی مختار نہ سمجھا جائے''

آگے لکھتے ہیں کہ ''اس لئے اب شعوری طور پر اس نے اس روایت کے خلاف جہاد شروع کیا۔ اس کا ایک عمل تو سلیم احمد کے ہاں ان اشعار میں ملتا ہے جہاں وہ زبان زد خاص و عام اشعار کو اس طور پر تصرف میں لاتا ہے کہ اس شعر کی روایت اور معنی دونوں ٹوٹ جاتے ہیں۔ مثلاً آتش کا مشہور شعر ہے۔

نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

اب دیکھئے روایت کے خلاف جہاد کرنے کے لئے وہ شعوری طور پر کیا عمل کر رہا ہے

وہ چوب خشک ہوں محروم آتشِ سوزاں

کہ بن جلائے جسے قافلہ روانہ ہوا

یہ تخلیقی و ذہنی عمل بار بار اس مجموعہ میں ملتا ہے۔ شاعر نے دوسرا عمل یہ کیا کہ مشہور و معروف مصرعوں پر گرہ لگا کر اس طور پر تصرف میں لایا کہ وہ مصرعے خود سلیم احمد کے ہو گئے لیکن یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ پہلے عمل میں بغاوت کا اظہار ملتا ہے تو دوسرے عمل میں روایت کو عزیز رکھنے کا اظہار ہوتا ہے روایت کو قبول کرنے اور رد کرنے کی کش مکش کے ساتھ سلیم احمد نے شعوری طور پر اپنے اسلوب کو بدل دینے کی کوشش کی اور اتنے انوکھے جذبات، اتنے نڈر پن سے بے باکی کے ساتھ پیش کئے کہ جدید غزل میں سوائے یگانہ چنگیزی کے اور کہیں نہیں ملتے۔ یہی وہ کام ہے جو سلیم احمد نے کیا اور یہ غزل کی روایت میں خود ایک تبدیلی ہے۔

بال ادراک کے بڑھ جائیں تو حجام کا کال

کپڑے احساس کے پھٹ جائیں تو سوزن میں خلل

تری جانب سے دل میں وسوسے ہیں

یہ کتے رات بھر بھونکا کئے ہیں

یا وہ غزل جس کا ایک شعر یہ ہے۔

جواں بدمست راتیں سانس بھی آہستہ لیتی ہیں

لہو سرگوشیاں کرتا ہے سرشاری کے کانوں میں [۱]

تبصرہ (معاہدۂ عمرانی)

ڈاکٹر محمود حسین نے فرانس کے ادیب روسو کی تصنیف ''سوشل کونٹریکٹ'' کا اردو ترجمہ ''معاہدہ عمرانی'' کے نام سے کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''معاہدۂ عمرانی کا بنیادی خیال اس کتاب کے پہلے جملے میں ملتا ہے۔ یہ جملہ

---

[۱] نیا دور کراچی شمارہ ۴۳-۴۴ ص ۳۶۶-۳۷۰

آج خودضر بالمثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس جملہ سے روسو کا اندازِ فکر اور اس دور کے بنیادی مسئلہ کا پتہ چلتا ہے۔ وہ پہلا جملہ جس سے یہ کتاب شروع ہوتی ہے یہ ہے کہ ''انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جدھر دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے۔''

فاضل مترجم ڈاکٹر محمود حسین نے اس کتاب کو براہِ راست فرانسیسی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ سلیس، اور زوردار ہے۔ مترجم نے فاضلانہ مقدمہ لکھ کر اس کتاب کی وقعت کو اور بڑھا دیا ہے۔ اب جب کہ اردو زبان ایک خاص مدت کے اندر اندر اعلٰی تعلیم کی درس و تدریس کا ذریعہ بننے والی ہے اور کراچی یونیورسٹی میں اس پر عمل بھی ہو رہا ہے۔ ضروری ہے کہ ساری دنیا کی بہترین اور بنیادی کتابیں اردو زبان میں صحیح لوگوں سے ترجمہ کرا کے شائع کی جائیں۔[۱]

تبصرہ (باغ و بہار)

''باغ و بہار'' پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے بہت مختصر تبصرہ پیش کیا ہے میر امن دہلوی نے ''باغ و بہار'' کو تصنیف کیا ہے اور تالیف ممتاز حسین صاحب نے کی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے خیال میں ''جب کسی کتاب میں اس کے اپنے زمانے کا مزاج، اس کا لہجہ، اس کی زبان، اس کی تہذیب اور طرزِ معاشرت مکمل طور پر یا پھر بڑی حد تک اظہار پا جاتے ہیں تو وہ کتاب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یا پھر اس وقت تک کے لئے جب تک کہ اس زبان کے بولنے والے موجود ہیں، زندہ ہو جاتی ہے۔ 'باغ و بہار' اردو زبان و ادب کی ایسی ہی کتابوں میں سے ایک ہے۔''

''کتاب خوبصورت ٹائپ میں شائع کی گئی ہے۔ گٹ اپ، لے آؤٹ اچھا ہے۔ سرِ ورق دیدہ زیب اور جلد مضبوط ہے۔[۲]

---

۱ نیادور کراچی شمارہ ۴۳۔۴۴ ص ۳۷۱۔۳۷۳

۲ نیادور کراچی شمارہ ۱۵۔۱۸ ص ۳۱۲۔۳۱۳

تبصرہ (سرسید احمد خاں)

بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے سرسید احمد خاں کے نام سے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس میں سرسید احمد خاں کے چند پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''زیرِ نظر کتاب میں مولوی عبدالحق نے سرسید کی شخصیت کا دو پہلوؤں سے مطالعہ کیا ہے۔ ایک پہلو تو یہ ہے کہ انھوں نے سرسید کو جیسا دیکھا اور جس قسم کے تاثرات ان پر قائم ہوئے انھیں اپنے دلچسپ اور مؤثر انداز میں پیش کر دیا۔ دوسرا پہلو جس پر مولوی صاحب خاص طور پر زور دینا چاہتے ہیں۔ وہ ورنیکلر یونیورسٹی کا مسئلہ ہے۔ اس کتاب کے اس حصہ کو پڑھ کر آسانی کے ساتھ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ قومیں جو اپنی زبان کو چھوڑ کر صرف دوسری زبان کے ذریعہ حصولِ علم کرتی ہیں۔ اپنے تخلیقی سوتوں سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ اسی لئے سرسید نے ایک دفعہ کہا تھا کہ یونیورسٹی کی تعلیم ہمیں صرف خچر بناتی ہے۔ زبان نہ تو ایک دن میں مکمل ہوتی ہے اور نہ کسی زبان کو ان حالات میں، جن سے اُردو گزر رہی ہے، مکمل کیا جا سکتا ہے۔ زبان تو ضرورت سے پیدا ہوتی ہے، برتنے سے پلتی بڑھتی ہے اور ذریعہ تعلیم بنانے سے پھلتی پھولتی ہے۔ اب سے چودہ سال پہلے جو اردو زبان کی اہمیت تھی وہ آج باقی نہیں رہی۔ اس کا حلقۂ اثر روز بروز محدود ہو رہا ہے اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہم نہ اس کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔ نہ اسے برتنے کی طرف مائل ہیں اور نہ اسے ذریعہ تعلیم بنانے کا خیال ہے۔ جب تک زبان کو معاشی و معاشرتی ترقی کا وسیلہ نہ بنایا جائے گا آخر وہ کیسے ترقی کرے گی؟ اگر مولوی صاحب سرسید کی ورنیکلر یونیورسٹی کے تصور کو سامنے رکھ کر پاکستان میں اردو یونیورسٹی بنانے میں کامیاب ہو گئے تو یہ ان کی ایسی خدمت ہوگی جس کے اثرات امتدادِ زمانہ، کے ساتھ ساتھ سارے معاشرہ میں پھیلتے رہیں گے۔''[1] مجموعی حیثیت سے کتاب خوشنما اور طباعت و کتابت اچھی ہے۔

---

[1] نیا دور کراچی شمارہ ۱۹۔۲۰ ص ۳۸۱ ۔ ۳۸۲

تبصرہ (چشم نگراں)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''چشم نگراں'' پر کافی طویل تبصرہ پیش کیا ہے، 'چشمِ نگراں' عزیز حامد مدنی کا مجموعہ کلام ہے اس تبصرہ سے انکا شاعرانہ مزاج سامنے آتا ہے بقول جمیل جالبی

''عزیز حامد مدنی کی شاعری میں اشاریت۔تہہ داری اور تخیل اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے۔ یہ تینوں خصوصیات کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔ اشاریت کے بارے میں ایک بات تو بالکل طے ہے کہ وہ فکر کے بغیر ظہور میں نہیں آسکتی اور فکر کے معنی نظریہ پرستی کے ہرگز نہیں ہوتے۔شاعری میں نظریہ پرستی کا اظہار کرنا ایک بات ہے اور زندگی کے مختلف مظاہر کو تجسس اور تخیل کی قوتوں کے ساتھ اس طرح پیش کرنا اس کی وضاحت کے ساتھ ساتھ اس میں کئی کئی تہیں پیدا ہو جائیں ایک دوسری چیز ہے۔فکری شاعری کا بہترین وصف غالباً یہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ غالب کی شاعری اس کا معیار بن گئی ہے۔ رصد گاہ۔فرسِ ٹروجن۔چوہا۔آپریشن۔تھیٹر۔ ٹرام جیسی علامتی نظمیں اسی لئے کامیاب نظمیں ہیں۔ یہ فکری عنصر مدنی کی شاعری میں پہلے دور میں بہت کم اور بعد کے ادوار میں نمایاں ہوتا چلا گیا ہے۔'چشمِ نگراں' کی ساری شعری کاوشوں میں اسی فکر کی پرچھائیاں ملتی ہیں جن سے اس دور کی شاعری کو مختلف رنگ ملتے ہیں۔ جو پڑھنے والے کے سامنے ایک نیا تجربہ۔اس کا امکان مدنی کی شاعری کے اس دور میں بھی ابھرتا نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ جب یہی وصف ان کی غزلوں میں ظاہر ہوتا ہے تو ہمیں ایک نئی تازگی اور شگفتگی کا پتہ دیتا ہے جس سے بیشتر غزل گو محروم ہیں۔ان کے یہ اشعار دیکھئے

چراغ بزم ابھی جانِ انجمن نہ بجھا
کہ یہ بجھا تو ترے خدوخال سے بھی گئے

وہ لوگ جن سے تری بزم میں تھے ہنگامے

گئے تو کیا تری بزم خیال سے بھی گئے
طلسم خواب زلیخا و دام بردہ فروش
ہزار طرح کے قصے سفر میں ہوتے ہیں

کھلا یہ دل پہ کہ تعمیر آشیاں ہے فریب
بگولے قالبِ دیوار و در میں ہوتے ہیں

ڈاکٹر جمیل جالبی آگے لکھتے ہیں جب ہم چشمِ نگراں" پڑھتے ہیں تو زندانی، ملاقات، سرمژگاں، مجھے گلہ ہے ابھی، ایسی ہی نظمیں ہیں۔ اس مجموعے میں ایک نہایت اہم اور مکمل نظم ملتی ہے۔ جس میں فکری حجم جذبے کی تہہ داری اور جستجو کا سراغ شاعرانہ حسن کے ساتھ ملتا ہے۔ یہ نظم اس مجموعہ کی آخری نظم دستِ حنائی تک ہے ۔اس نظم سے امکانات کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو مدنی کو ذاتی دکھ درد سے آگے بڑھا کر خارجی مسائل کے اعلیٰ شعور اور اس سے بھی زیادہ کائنات سے آگاہی کی منزلوں تک لے جاتا ہے۔ یہ نظم ایک نامیاتی نظم ہے۔ جس کا ہر بند پہلے بند سے پیوست بھی ہے اور اس میں ایسا اضافہ بھی کرتا جاتا ہے جس سے اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔"

اس مجموعہ میں ۱۹۴۸ء تک کی نظمیں شامل ہیں جن سے سوچتے دماغ کے شعری عمل کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ ہم نے مدنی کی ۱۹۴۸ء کے بعد کی نظمیں بھی پڑھی ہیں۔ اس لئے اس مجموعہ پر تبصرہ کرتے وقت وہ نظمیں بھی بار بار ہمارے ذہن کے دریچوں سے دستک دے رہی ہیں اور وہ یہ نظمیں ہیں۔ جو ان کے شعری عمل کی ارتقائی شکلیں ہیں۔

۴۸ ء کی نظموں سے زیادہ حسین اور زیادہ مؤثر۔ اس لئے ضروری ہے کہ مدنی صاحب اپنا دوسرا شعری مجموعہ جس میں منتخب نظمیں اور غزلیں دونوں شامل ہوں جلد شائع کرنے کا بندوبست کریں تاکہ پڑھنے والا ان کی شاعری کے اصل روپ اور خدوخال سے پورے طور پر واقف ہو سکے۔"[1]

---

[1] نیا دور کراچی شمارہ ۲۹۔ ۳۰ ص ۲۶۰۔ ۲۶۳

تبصرہ (اکائی)

'اکائی' بشیر بدر کی غزلوں کا مجموعہ ہے ڈاکٹر جمیل جالبی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''بشیر بدر کی آواز میں ایک نیاپن ہے۔ ان کے ہاں نغمگی بھی ہے اور عہد حاضر کی آواز بھی۔ ان کے لہجے میں دل کو موہ لینے والی ایک ایسی جاذبیت ہے کہ یہ مجموعہ جدید اردو غزل میں قابلِ ذکر اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ ان کے لہجے کے چونکا دینے والے نئے پن نے جس میں احساس و فکر دونوں تازہ تازہ سے تھے مجھے متاثر کیا۔

منزل پہ حیات آ کے ذرا تھک سی گئی ہے
معلوم یہ ہوتا ہے بہت تیز چلی ہے

اے بدر مرے شعروں میں ہے وقت کی آواز
اے بدر غزل ہے کہ ''صدی بول رہی ہے''

اس غزل میں دو چیزیں تھیں۔ ایک اپنے زمانے کا احساس اور دوسرے اپنی روایت سے گہری وابستگی یہی خصوصیت ان کی ساری غزلوں میں رنگ بھرتی رہی ہیں۔ ان کے ہاں تجربہ سمٹ کر آتا ہے۔ یہ تجربہ پھیلتا نظر آتا ہے۔ یہ بات نظم گو کے لئے بہت ضروری ہے۔ ممکن ہے کہ ان کے اندر کی تبدیلیاں انہیں غزل سے اب نظم کی طرف لے جا رہی ہوں۔ اکثر غزلوں میں، جو اس مجموعہ میں پہلی بار میری نظر سے گزریں، وہ ردیف اور قافیہ میں زیادہ دلچسپی لیتے نظر آتے ہیں اور میرا خیال ہے یہ بات ایک اچھے شاعر کے لئے بہت اچھی بات نہیں ہے۔ اس سے ہم ان کی قادرالکلامی کے تو قائل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس ہلکی پھلکی پھوار سے محروم ہو گئے ہیں جو ان کی شاعری میں سب سے زیادہ دل کو موہ لینے والی تھی۔

کسے بقا ہے کی روئیں بشیر بدر کو ہم

مگر زمانے سے اک قادر الکلام اٹھا

یہی قادرالکلامی ان کے گزشتہ پانچ چھ سال کی غزلوں میں گل کھلا رہی ہے اور قادرالکلامی کے معنی یہ نظر آتے ہیں کہ وہ مشکل زمینوں میں اپنی استادانہ مہارت کا اظہار کریں۔ چند زمینیں یہ ہیں۔ (قلم کا چاند، صنم کا چاند) (تلوار کی خوشبو، رخسار کی خوشبو) (سب تمہاری طرح، اب تمہاری طرح) (بدلتے خواب، پگھلتے خواب، جلتے خواب) (پتھر برسے، برابر برسے، اندر برسے) (شہزادگاں ہوگئے، کہاں سو گئے، کارواں سو گئے) (بکھرائی ہوئی غزلیں، گھبرائی ہوئی غزلیں نہلائی ہوئی غزلیں) یہ وہ زمینیں ہیں جن سے قادرالکلامی کا تو اظہار ہوتا ہے لیکن اسی کے ساتھ وہ قوت جو تجربوں کو سمیٹ کر لفظوں میں باندھتی تھی کمزور پڑ گئی ہے۔ اسی لئے اکثر طویل بحروں کی غزلوں میں تجربہ اس طور پر پھیل گیا ہے کہ احساس کے نرم نرم گالوں میں چٹکی لینے والا اثر کمزور پڑ گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ بے ضرورت نئے پن کی تلاش میں بشیر بدر نے اپنے خالص اور اُجلے احساس کو میلا کر دیا ہے۔ ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ پہلے وہ اپنے ''تجربہ'' کو ''خیال'' بنا کر اظہار کا جامہ پہناتے تھے اب وہ خیال کو تجربہ بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ یہ معکوس تخلیقی عمل بھی اسی قادرالکلامی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔'' [۱]

تبصرہ (پاکستان کی علاقائی زبانوں پر فارسی کا اثر)

ڈاکٹر جمیل جالبی ''پاکستان کی علاقائی زبانوں پر فارسی کا اثر'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''یہ حقیقت ہے کہ فارسی زبان کا طوطی تقریباً ایک ہزار سال تک پاکستان اور ہندوستان میں بولتا رہا، اور کوئی بھی ایسی بولی یا زبان نہیں تھی، جو اس سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکی ہو اور بالخصوص پاکستان کی ساری زبانیں اور بولیاں اس سے حد درجہ اثر پزیر ہوئیں۔ بنگلہ زبان پر بھی فارسی کا اثر بہت گہرا رہا ہے۔ اب یہاں ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بنگلہ پر فارسی کا اثر اتنا گہرا اور دور رس رہا تو پھر آج ''بنگلہ بھاشا''

---

۱ نیا دور کراچی شمارہ ۵۵۔۵۶ ص ۳۱۳۔۳۱۴

پاکستان کی دوسری ''زبانوں'' کے برخلاف سنسکرت رسم الخط میں کیوں لکھی جاتی ہے؟ حالانکہ بنگلہ ابتدا میں اور اٹھارویں صدی کے آخر تک نسخ یا نستعلیق میں ہی لکھی جاتی تھی۔ اب جب کہ بنگلہ پاکستان کی ایک اور زبان بنادی گئی ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ اسے پاکستان کی دوسری زبانوں سے قریب تر لانے کے لئے اس کا رسم الخط بھی نسخ یا نستعلیق کر دیا جائے تا کہ اس میں فارسی وعربی زبانوں کے اثرات آسانی سے سرایت کر سکیں، اور یہ بھی پاکستان کی دوسری زبانوں کی طرح شکل وصُورت اور مزاج کے اعتبار سے قریب تر ہو سکے۔ اس کے لئے ذرا جرأت کی ضرورت ہے۔ لیکن ثقافتی یک جہتی کے لئے یہ چیز بہت ضروری ہے۔ ہندوستان میں سندھی زبان بھی، جو پہلے نسخ میں لکھی جاتی تھی، اب ہندی رسم الخط میں لکھی جارہی ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہندوستان کی ساری زبانیں اور بولیاں شکل وصورت اور مزاج کے اعتبار سے بہت قریب ہو جائیں۔ ظاہر ہے کی پاکستان کی دوسری زبانوں کے رسم الخط کو عربی یا نستعلیق سے ہٹا کر سنسکرت رسم الخط میں تبدیل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن بنگلہ کو ان سب سے قریب تر لانے کے لئے یہ اقدام نہایت ضروری ہے۔ اور ضرورت اس امر کی ہے کہ اس سلسلہ میں ذرا وسیع النظری اور پیش بینی سے سوچا جائے۔

مختصراً یہ کہ یہ کتابچہ اس اعتبار سے بہت قابل قدر ہے کہ اس سے فارسی کے زیر اثر، پاکستان کا سب زبانوں کا تعارف ہو جاتا ہے۔''[1]

تبصرہ (سلومی)

''سلومی'' ایک منظوم ڈرامہ ہے۔ جس کو عبدالعزیز خالد صاحب نے تصنیف کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''کچھ دنوں سے ہمارے ہاں ذہنی سنجیدگی کی اہمیت بالکل ختم ہوگئی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی کاوش سے کچھ کرنا بھی چاہتا ہے۔ تو وہ بے قدری کا شکار ہو جاتا ہے۔ طویل نظم، خواہ وہ ڈرامہ کی شکل میں ہو یا کسی اور صنف کی شکل میں، ایسی آسان چیز تو ہے

---

[1] نیا دور کراچی شمارہ ۳۔۴ ص ۳۸۳۔۳۸۴

نہیں کہ اس کاوش کو اہلِ علم بھی ہنسی ہنسی میں اڑا دیں اور غزل نویسی کے علاوہ کچھ اور کام کرنے کی ہمت کر سکتا ہے۔ ساری زندگی سستی تفریح سمجھ کر گزار دینا آخر کہاں کی دانشمندی ہے؟ اس میں خون جگر کی نمود، سنجیدگی فکر کی بھی کچھ نہ کچھ اہمیت ہونی ہی چاہئے۔ میری خواہش تو یہ ہے کہ کاش کوئی مرد غازی اس کو اسٹیج کر سکتا۔ اس ڈرامہ کی خوبصورتی اور حسن کا اندازہ صحیح معنی میں اس وقت ہو سکتا ہے۔''[۱]

تبصرہ (جاڑے کی چاندنی)

غلام عباس صاحب نے 'جاڑے کی چاندنی' کے نام سے اپنے افسانوں کا مجموعہ شائع کیا ہے۔ اس میں چودہ کہانیاں شامل ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے تبصرہ میں لکھتے ہیں۔

''انہیں کتابی شکل میں شائع کرنے سے پہلے افسانہ نگار نے نہ صرف ان پر نظر ثانی کی ہے بلکہ ان سب کو دوبارہ نئے سرے سے لکھا ہے۔ میں بھی یہ کہانیاں اس سے پہلے پڑھ چکا تھا اب جوان کو اس مجموعہ میں دوبارہ پڑھا تو ایک نیا مزا آیا۔ غلام عباس کو کہانی کہنے کا فن خوب آتا ہے۔ ان کے ہاں ایک جملہ بھی زائد یا فاضل نظر نہیں آتا۔ یہ وہ خوبی ہے جو انھیں ہم عصروں سے ممتاز کر دیتی ہے۔ فن پر وہ اس درجہ توجہ دیتے ہیں کہ وہ اثر کو آہستہ آہستہ قاری کے ذہن میں جذب کرتے جاتے ہیں اور جب کہانی ختم ہوتی ہے تو وہ کہانی کا بھی اور اثر آفرینی کا بھی نقطۂ عروج ہوتا ہے۔

افسانہ کے ختم ہوتے ہی قاری کے ذہن میں ایک نیا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ غازی مرد، اور کوٹ، سایہ، ایک دردمند دل، وغیرہ افسانوں کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ غلام عباس کے ہاں ماحول اور فضا افسانے کے ایک اہم جزو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ 'جاڑے کی چاندنی' کو ہم سالِ رواں کا بہترین مجموعہ کہہ سکتے ہیں جس میں غلام عباس کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ 'تمہید' کے عنوان ن۔ م۔ راشد نے ایک اچھا مقدمہ قلمبند کیا ہے۔ جس میں غلام عباس کے افسانوں اور فن پر بڑے اچھے انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔'' [۲]

---

۱ نیا دور کراچی شمارہ ۲۱۔۲۲ ص ۳۹۳

۲ نیا دور کراچی شمارہ ۲۱۔۲۲ ص ۳۹۰ ۔ ۳۹۲

تبصرہ (پنجابی لوک کہانیاں)

"پنجابی لوک کہانیاں" کے مصنف شفیع عقیل صاحب ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی اس پر تبصرہ پیش کرتے ہیں۔

"ہر علاقے کی بڑی بوڑھیاں بچّوں کو کہانیاں سناتی ہیں اور بچے ان کہانیوں کے تاروپود بنتے بنتے گہری نیند سو جاتے ہیں۔ان کہانیوں میں دلچسپی کا عنصر بھی ہوتا ہے اور نصیحت کا پہلو بھی اور ساتھ ساتھ اس علاقے کے کلچر کا مزاج بھی۔لوک کہانیاں ہر علاقہ کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ایک علاقے کی کہانیاں ملک کے دوسرے علاقوں میں پہونچا کر ایک کام یہ کیا جاسکتا ہے کہ آنے والی نئی نسلیں اپنے مزاج میں سب علاقوں کے مزاج کو اپنے اندر سموکر پروان چڑھ سکتی ہیں۔شفیع عقیل صاحب نے پنجابی لوک کہانیوں کو یکجا کر کے اس اعتبار سے ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔اس مجموعے میں کل پندرہ کہانیاں ہیں اور سب کی سب آسان، سیدھی سادی زبان میں لکھی گئی ہیں۔اگر دوسرے علاقوں کی لوک کہانیاں بھی اسی طرح یکجا ہو جائیں تو یہ ایک بڑی بات ہوگی۔"[۱]

تبصرہ (صحرانورد کے خطوط)

"صحرانورد کے خطوط" کے مصنف مرزا ادیب ہیں۔انھوں نے کافی افسانے اور ڈرامے لکھے ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس پر بہت مختصر تبصرہ پیش کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"میرزا ادیب کے اس مجموعہ میں آٹھ خط شامل ہیں اور ساری کہانی خطوط کی شکل میں پیش کی گئی ہے ان خطوط کی ماہیت اور ساتھ ساتھ ان کا رومانی اندازِ بیان پڑھنے والے کو ایسا مسحور کر لیتا ہے کہ کتاب کو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ان خطوط میں ارد گرد کا ماحول، سماجی کش مکش، جبر و استحصال کے خلاف بغاوت و نفرت اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ اس رومانیت میں بھی بڑی صالح قسم کی صحت مندی پیدا ہو گئی ہے۔

مکتبۂ اردو نے اس ایڈیشن کو جالی تصاویر کے ساتھ بہت خوبصورت پیرائے میں پیش کیا ہے۔"[۲]

---

[۱] نیا دور کراچی شمارہ ۳۳-۳۴ ص ۳۶۱

[۲] نیا دور کراچی شمارہ ۱۱-۱۲ ص ۳۶۹

تبصرہ (نوائے ظفر)

خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب تصنیف ''نوائے ظفر'' پر ڈاکٹر جمیل جالبی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''ظفر ایک ایسا شاعر ہے جس کے ضخیم کلیات میں ہزاروں اشعار بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن ان اشعار میں بیس فی صد اشعار ایسے ہیں جو ہمارے مذاق شعری پر پورے اترتے ہیں اور باقی رنگ وہی ہے، جو شاہ نصیر ذوق اور دوسرے شعراء کے ہاں ملتا ہے اعظمی صاحب نے کلامِ ظفر میں خاص طور پر اس بات کا خیال رکھا ہے کہ زیادہ سے زیادہ صرف وہ اشعار ہی درج کئے جائیں جو ظفر کے مخصوص رنگ کی ترجمانی کرتے ہیں۔

اعظمی صاحب کے انتخاب کی داد تو میں دے ہی چکا ہوں اس سلسلے میں اتنا اور عرض کرتا چلوں کہ کسی شاعر کے کلام کا انتخاب اتنا آسان نہیں ہے جتنا عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ انتخاب کرنے والے کا مطالعہ جب تک وسیع نہ ہوگا، جب تک وہ ہر رنگ سخن سے گہری واقفیت نہ رکھتا ہوگا۔ جب تک اس کا ذوق شعری اس مطالعہ اور تخیل کی رنگارنگی سے نکھر نہ گیا ہوگا۔ انتخابِ کلام بودا اور کمزور ہوگا۔ فراقؔ صاحب نے جو یہ کہا تھا تو کیا غلط کہا تھا کہ ''اردو شاعری کو شعر و شاعر تو نصیب ہوتے رہے ہیں۔ لیکن سلیقے سے انتخاب کرنے والے اور ایک معیار کے مطابق ترتیب دینے والے ایڈیٹر نایاب رہے ہیں۔ ملک کا مذاق سنوارنے اور رچانے میں شاعروں سے کم حصہ نقادوں اور ایڈیٹروں کا نہیں ہوتا۔'' اگر انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڈھ ساری اردو شاعری کا ایک ایسا ہی انتخاب شائع کر دے تو بڑا کام کرے۔ آل احمد سرور صاحب کی موجودگی میں یہ کام آسانی کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ یہ انتخاب کم از کم چھ جلدو میں سما سکے گا۔ اب سے بہت پہلے حسرت موہانی مرحوم نے اردو غزل کا انتخاب کیا تھا۔ مگر ایک تو وہ غزل تک محدود تھا دوسرے اس میں اضافوں کی بہت گنجائش تھی۔ اس انتخاب کے لئے ایسے لوگوں کو چنا جائے جن کا ذوق شعری بے حد منجھا ہوا ہو اور جو نرے عالم بھی نہ ہوں۔

انتخاب کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ اکثر شاعر ایسے ہیں جن کی زندگی دو چار غزلوں یا شعروں پر منحصر ہے اور اکثر ایسے ہیں جواب تک کلام کی کمیابی یا نایابی کی وجہ سے سامنے نہیں آسکے ہیں۔ اچھے انتخاب سے ساری اردو شاعری بیک نظر دیکھی جاسکتی ہے جس سے نہ صرف مذاق شعری بن سنور سکتا ہے بلکہ نئی نسلوں کے سامنے نئے رویئے، نئے امکانات بھی آسکتے ہیں۔ جن کے سہارے اپنے دامن میں اردو شاعری کے مزاج کو سمیٹ کر نئی منزلوں کی طرف بڑھ سکتے ہیں۔ اس زمانے میں مطالعہ کا ذوق ویسے ہی کم ہوگیا ہے اور پھر اتنی فرصت بھی کہاں ہے کہ سارے شعراء کا کلام دیکھا جائے۔ اور پھر ان کے جواہر ریزے الگ کئے جائیں۔ انتخاب سے یہ مشکل دور ہو جاتی ہے۔ دنیا کی ہر متمدن زبان میں اس کی پوری شاعری کا انتخاب ملتا ہے۔ کیا اردو زبان تمدن و تہذیب کے نور سے انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڈھ اور آل احمد سرور کی موجودگی میں محروم رہے گی؟''[۱]

تبصرہ (چھ کتابیں ایک ادارہ)

ڈاکٹر جمیل جالبی ''چھ کتابیں، ایک ادارہ'' عنوان سے تبصرہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

مجلسِ ترقی ادب لاہور نے ''اردو کلاسکی ادب'' کے عنوان سے کتابیں شائع کرنے کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے یہ سب کتابیں ایک عرصہ سے کم یاب تھیں اور اردو ادب پڑھنے والی نئی نسلیں رفتہ رفتہ ان کتابوں کو فراموش کر رہی تھی۔

آزادی کے بعد سے یہ رجحان عام ہوتا جا رہا ہے۔ اُردو کے ادیب بھی اردو کی کتابیں نہیں پڑھتے۔ اور صرف انگریزی زبان کی کتابیں پڑھ کر ان کتابوں کے خیالات کو اپنی بے سلیقہ زبان کے ذریعہ ظاہر کر دیتے ہیں۔ انہیں نہ اردو سیکھنے کا شوق ہے اور زبان و بیان کی طرف ان کی کوئی توجہ ہے۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ لکھنے والوں کا طرزِ ادا کمزور ہے۔ زبان غلط ہے، اور مفہوم بے معنی ابہام کے مرض میں مبتلا ہے۔ دنیا کی کوئی زبان خواہ وہ مادری ہو یا پدری بغیر سیکھے نہیں آسکتی۔ زبان سیکھنے کا

---

[۱] نیا دور کراچی شمارہ ۱۳۔۱۴ ص ۳۵۱۔۳۵۲

طریقہ یہ ہے کہ اس زبان کا کلاسیکی ادب پڑھا جائے۔ اور دیکھا جائے کہ اگلے وقتوں کے لوگوں نے زبان کو کس طور پر استعمال کیا تھا۔ لفظوں کو کیا معنی دیئے تھے اور جملوں کو کس طرح جوڑا تھا۔ مفہوم کو ادا کرنے میں کن کن باتوں کا خیال رکھا تھا۔ کون سے مصنف صاحب طرز بنے اور کیوں اور وہ مصنف جو صاحب، طرز نہ بن سکے۔ اس کی کیا وجہ تھی۔ یہ کام صرف اپنی زبان کے کلاسیکی ادب پڑھنے سے انجام دیا جا سکتا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس اعتبار سے مجلسِ ترقی ادب لاہور کا یہ سلسلہ اردو زبان وادب کے لئے ابرِ رحمت کا درجہ رکھتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہم ادارے کی توجہ اس امر کی طرف بھی مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ وہ ان کتابوں کو پھیلانے کی طرف بھی پوری توجہ دے ورنہ گوداموں میں رکھ کر ان کتابوں کی اشاعت کا مقصد پورا نہ ہو سکے گا اور اس طرح ادارہ کا یہ اقدام بے معنی بن کر رہ جائے گا۔'' [۱]

تبصرہ (انیسویں صدی میں وسطِ ایشیا کی سیاحت)

آغا محمد اشرف نے ''انیسویں صدی میں وسطِ ایشیا کی سیاحت'' کے نام سے کتاب مرتب کی جس پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے تبصرہ کیا وہ لکھتے ہیں

''میرے بچپن میں گھر میں مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب ''آب حیات'' کا بڑا چرچا تھا۔ آب حیات کے حوالے سے اردو شاعروں کے قصّے دہرائے جاتے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی ذکر چھڑتا کہ مولانا نے اپنے استاد ذوق کو بڑھانے چڑھانے کے 'زور' میں غالب کی شاعری اور شخصیت کو دبانے کی کوشش کی ہے۔ پھر مومن کے ذکر کو آب حیات کے پہلے ایڈیشن سے خارج کر کے مولانا نے کچھ زیادہ ذہنی دیانت داری کا ثبوت نہیں دیا۔ بہادر شاہ ظفر کی ساری کلیات کو استاد ذوق سے منسوب کر کے بھی مولانا نے ادبی خلوص کا ثبوت نہیں دیا۔''

ڈاکٹر جمیل جالبی نے آگے چل اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ جنگِ آزادی کے بعد مولانا آزاد کے والد مولانا محمد باقر مجتہد کو کیوں پھانسی پر چڑھا دیا گیا تھا۔ مولانا محمد

---

[۱] نیا دور کراچی شمارہ ۲۷۔۲۸ ص ۳۳۵ ۔ ۳۳۶

حسین آزاد نے تو انہیں بالکل بے گناہ اور بے قصور ثابت کیا ہے۔ کیا مولانا چنے کے ساتھ گھن بن کر پس گئے تھے یا اس کے علاوہ کوئی اور بات تھی؟'' ڈاکٹر جمیل جالبی آگے لکھتے ہیں ''دوسرا واقعہ جس کا ذکر اکثر آتا تھا یہ تھا کہ مولانا نے کابل بدخشاں، سمر قند و بخارا کا سفر کیوں اختیار کیا تھا۔ کیا وہ جاسوسی کے فرائض انجام دینے گئے تھے یا کوئی علمی مہم کرنے گئے تھے۔ مولانا نے اپنی تصانیف میں اس سفر ترکستان کا ذکر بار بار کیا ہے لیکن کُھل کر کہیں نہیں لکھا۔ اب جو ''انیسویں صدی میں وسطِ ایشیا کی سیاحت'' سامنے آئی تو میں بہت خوش ہوا اور یہ خوشی اس وجہ سے بھی تھی کہ میری طبیعت کے اُس تجسّس کو جو بچپن میں اس سفر کی باتیں سُنکر پیدا ہوا تھا اب پہلی بار آسودہ ہونے کا موقع میسّر آیا تھا۔ میں نے بڑے ذوق وشوق سے اس کتاب کو پڑھا اور مجھے اطمینان ہوا کہ مولانا آزاد کے لائق نواسے آغا محمد اشرف نے اس سفر کی کڑیوں کو جوڑ کر مکمل کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب تاریخی حیثیت کی حامل ہے کہ اردو ادب کے ایک عظیم ادیب کی زندگی کا ایک اہم واقعہ مکمل ہو جاتا ہے۔ جیسا کی آغا صاحب نے لکھا ہے کہ اس سفر کا مولانا کی تحریروں اور فکر پر گہرا اثر پڑا ہے۔ کتاب کی افادیت میں اضافہ کرنے کے لئے آغا اشرف نے اس زمانے کے تاریخی وسیاسی پسِ منظر کو بھی پیش کر دیا ہے اور ساتھ ساتھ دو ایک نقشے لگا کر اس پسِ منظر کو جغرافیہ کی مدد سے سمجھنے کے لئے بھی سامان فراہم کر دیا ہے۔

کتاب دلچسپ اور معلومات افزا ہے جسے ہمدرد اکیڈمی نے اعلیٰ درجہ کی کتابت وطباعت کے ساتھ شائع کیا ہے۔ سرِ ورق بہت خوبصورت ہے اور اسلامی تہذیب وثقافت کی نمائندگی کرتا ہے لیکن اس کے باوجود سرخ رنگ اس قدر تیز ہو گیا ہے کہ آنکھوں کو بھلا نہیں لگتا۔ ممکن ہے ہمدرد اکیڈمی اس خیال سے متفق نہ ہو لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر یہ رنگ اتنا تیز نہ ہوتا تو سرِ ورق کا اثر اور گہرا ہو جاتا۔''[1]
سرورق سادہ مگر جاذب نظر کتابت وطباعت اچھی۔

---

[1] نیا دور کراچی شمارہ ۱۹ ۔ ۲۰ ص ۳۶۶ ۔ ۳۶۸

تبصرہ (تذکرہ صوفیائے سرحد)

''تذکرہ صوفیائے سرحد'' مولانا اعجاز الحق قدوسی کی کتاب'' ہے جس پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس طرح تبصرہ پیش کیا ہے۔

''تصوّف اور اس کی تاریخ مولانا اعجاز الحق قدوسی کا خاص میدان ہے اس کتاب سے پٹھانوں کی ذہنی تاریخ اور طرزِ فکر و عمل کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ مولانا قدوسی کی یہ کتاب دراصل ایک طرح سے اس علاقے کی اسلامی وثقافتی تاریخ کا ایک حصہ ہے مولانا کی تحقیق اور اس کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں سلسلہ چشت کے بعد شاہ ہمدانی کی وساطت سے پہلے نقشبندیہ اور پھر قادریہ سلسلہ آیا۔ اس کتاب میں مولانا نے ۳۴ صوفیاءِ کرام کا تذکرہ کیا ہے حواشی نے اس کتاب کی اہمیت و افادیت میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ مولانا نے اپنے مواد کی فراہمی کے لئے اصل ماخذوں سے استفادہ کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں ''میرا خیال ہے کہ پاکستان و ہندوستان کی کسی زبان میں بھی حتیٰ کہ عربی و فارسی میں بھی اس طرح کی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ یہ تذکرہ اپنے مواد کی ترتیب اپنے موضوع کی وسعت اور تحقیقی سلیقہ مندی کی وجہ سے ایک منفرد تصنیف ہے۔ مولانا نے مشاہیر صوفیاءِ اکرام کے حالاتِ زندگی کے علاوہ انکی تصانیف شخصیت تعلیم اور خدمات کا بھی تفصیلی احوال لکھا ہے۔ مولانا کا اندازِ بیاں دلچسپ ہے اور شعریت اسکی ہر ہر سطر میں نمایاں ہے۔ اتنے خشک موضوع کو اتنے لچسپ انداز میں پیش کرنا مولانا اعجاز الحق قدوّسی کا کمال ہے۔''[1]

تبصرہ (سرودِ رفتہ)

ڈاکٹر جمیل جالبی ''سرودِ رفتہ'' پر تبصرہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''عبدالعزیز خالدؔ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ انھوں نے یونان کی مشہور و معروف شاعرہ سیفو کی شاعری کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ اچھا ترجمہ کرنا نثر میں خاصا مشکل کام ہے۔ نظم میں تو یہ اور مشکل ہوجاتا ہے۔ زیرِ نظر ترجموں میں مترجم نے

---

1. نیا دور کراچی شمارہ ۴۳-۴۴ ص ۳۷۷ - ۳۷۸

سیفو کی شاعری کے مزاج، اس کی روح اور لطافتِ اظہار سے ہمیں قریب تر رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

مترجم نے سیفو کی بنیادی خصوصیات کو ترجمہ کرتے وقت خاص طور پر پیشِ نظر رکھا ہے۔ کتاب دو رنگوں میں خوبصورت ٹائپ میں شائع کی گئی ہے۔ اور ٹائپ میں اس ڈھنگ اور ڈھب کی کتابیں خال خال نظر آتی ہیں۔'' [۱]

تبصرہ (غالب شاعرِ امروز فردا)

ڈاکٹر جمیل جالبی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''غالب شاعرِ امروز فردا'' جناب فرمان فتحپوری کے پندرہ تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں غالبؔ کی شخصیت اور شاعری کے ان پہلوؤں کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے جن پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ یہ کتاب بظاہر متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ فرمان صاحب نے تنقیدی شعور کو بھی اپنی تحقیق میں شامل کر کے تحقیق و تنقید کے رنگوں سے اپنا الگ رنگ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کی دو خصوصیات قابلِ ذکر ہیں ایک تو یہ کہ اسے پڑھ کر غالبؔ سے ہماری دلچسپی بڑھ جاتی ہے اور دوسری یہ کہ اس میں مصنف نے اپنی بات کی وضاحت کے لئے غالبؔ کی اردو فارسی نظم و نثر کے حوالے اس طور پر گھلا ملا کر پیش کئے کہ غالب کی پوری شخصیت کی جھلک نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ غالب پرستاروں کے لئے یہ ایک دلچسپ مفید اور قابلِ قدر تحفہ ہے۔'' [۲]

تبصرہ (انتخاب ریاض خیر آبادی)

ڈاکٹر جمیل جالبی مظفر حسین شمیم کی تصنیف ''انتخاب ریاض خیر آبادی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ریاض خیر آبادی ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۴ء میں مر گئے۔ یہ زمانہ

---

۱ نیا دور کراچی شمارہ ۱۵۔۱۸ ص ۳۹۱ ۔ ۳۹۲

۲ نیا دور کراچی شمارہ ۵۵۔۵۶ ص ۳۱۷

ہندوستان کی تاریخ میں ہر اعتبار سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ واجد علی شاہ کا دور ختم ہو چکا تھا۔ اور مغلوں کی سلطنت کا چراغ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا تھا۔ اردو شاعری میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ داغؔ کی آواز ہندوستان کے ہر گوشے میں سنی جا رہی تھی۔ ریاضؔ نے جب ہوش سنبھالا تو یہ آواز ان کے کانوں میں بھی پڑی۔ اور اس کا اثر ان کی شاعری پر بھی اثر پڑا۔

ریاضؔ پر سنجید گی کے ساتھ بہت کم کام ہوا ہے۔ ''ریاضؔ رضوان'' ریاض خیرآبادی کا مجموعۂ کلام ایک عرصہ سے نایاب ہے۔ مظفر حسین شمیم قابلِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے ''انتخابِ ریاضؔ خیرآبادی'' پیش کر کے کم از کم ریاض کی یاد دوبارہ تازہ کر دی۔ انتخاب کلام اچھا ہے۔ ویسے انتخاب کا معاملہ بڑا مشکل ہوتا ہے اس میں انتخاب کرنے والے کی پسند' اس کے مزاج اس کے ماحول' اس کے مطالعہ، اس کی ذہنی روایات کا بہت اثر پڑتا ہے۔ کتابت وطباعت اچھی ہے۔''[1]

تبصرہ (تاریخ وتنقید ادبیات اردو)

ڈاکٹر جمیل جالبی ''تاریخ وتنقید ادبیات اردو'' پر تبصرہ کرتے ہیں۔

''یہ کتاب پروفیسر حامد حسن قادری مرحوم کے ان تاریخی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے وقتاً فوقتاً کالج کے طالب علموں کے لئے بطور کلاس نوٹس یا کسی ایڈیٹر کی تحریک یا فرمائش پر لکھے۔ اس مجموعۂ مضامین میں اردو زبان وادب کی تاریخ کے مختلف گوشے عالمانہ اختصار کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ اس میں شاعری کے تین اسکولوں۔ دہلی اسکول، لکھنؤ اسکول اور جدید اسکول پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چند ایسے موضوعات پر بھی اظہار، خیال کیا گیا ہے۔ جو ذوقِ ادب کے سلسلے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مثلاً ایک مضمون بعنوان ''شاعر کا رنگ'' ملتا ہے۔ اور اس بات کو واضح کیا گیا ہے۔ کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ میرؔ کا رنگ ہے یا یہ مومنؔ داغؔ یا غالبؔ کا رنگ ہے۔ تو اس کے کیا معنی ہیں۔ رنگ شاعر کو سمجھنا اور جاننا فن

---

[1] نیا دور کراچی شمارہ ۱۵ ۔ ۱۸ ص ۳۹۸ ۔ ۴۰۰

شاعری سخن فہمی اور نکتہ سنجی کی جان ہے۔ شعر ہماری قوم کا مزاج اور سخن فہمی کی تربیت ہماری تہذیبی روایت کا ہمیشہ سے ایک حصّہ رہی ہے۔'' ڈاکٹر جمیل جالبی آگے لکھتے ہیں۔ ''یہ مضمون اس زمانہ میں لکھا گیا تھا جب گاندھی جی نے اردو ہندی کا ایک مشترکہ نام 'ہندی ہندوستانی' تجویز کیا تھا۔ یہ کتاب اپنی افادیت و اہمیت کے اعتبار سے طالب علموں، استادوں اور عام پڑھنے والوں کے لئے یکساں مفید ہے۔'' [۱]

تبصرہ (ہفت مقالہ)

'ہفت مقالہ' سید حسام الدین راشدی نے مرتب کیا ہے۔
ڈاکٹر جمیل جالبی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ہفت مقالہ فارسی زبان و ادب سے متعلق مجلۂ اردو میں شائع شدہ مضامین کا انتخاب ہے۔ اس انتخاب کے ساتوں مضامین تحقیقی اعتبار سے خاص اہمیت کے مالک ہیں۔ فارسی کا رواج ہمارے زمانے میں روز بروز کم ہوتا جارہا ہے اور اس کی وجہ سے فارسی ادب شاعری اور تاریخ سے نئی نسلوں کو متعارف کرانے کے لئے اس قسم کی کتابیں خاص طور پر شائع کی جائیں۔ رسالہ اردو اور اورینٹل کالج میگزین میں لاتعداد معیاری مضامین فارسی ادب سے متعلق اہل علم نے لکھے ہیں۔ اگر یہ دونوں ادارے ان مضامین کا تاریخی ترتیب کے ساتھ ایک اعلیٰ انتخاب اپنے اپنے مجلوں کے خاص نمبر کی شکل میں شائع کردیں تو یہ ایک بڑا کام ہوگا۔ مشفق خواجہ صاحب اس کام کو بہت آسانی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں۔ وہ حوصلہ مند نوجوان ہیں اور انھیں کتابیں مرتب کرنے کا خاص سلیقہ اللہ تعالیٰ نے ودیعت کیا ہے۔'' [۲]

تبصرہ (کلکِ موج)

ڈاکٹر جمیل جالبی ''کلکِ موج'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''عبدالعزیز خالدؔ اردو کے مشہور شاعر ہیں۔ خالد صاحب نہ صرف شاعر ہیں

۱۔ نیادور کراچی شمارہ ۴۳ ۔ ۴۴ ص ۳۷۴ ۔ ۳۷۶

۲۔ نیادور کراچی شمارہ ۴۵ ۔ ۴۶ ص ۳۹۵

بلکہ علم وادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ کئی زبانوں سے واقف ہیں۔ خالد کی شاعری علم وخیال کی شاعری ہے۔ ہم نے اب تک شاعری کو صرف محض احساس وجذبہ تک محدود رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ احساس وجذبہ کی شاعری کے شیدا جب ان کے کلام پڑھتے ہیں تو مایوس ہو جاتے ہیں دراصل خالد کی شاعری ایک نئے اندازِ نظر کا مطالبہ کرتی ہے۔ اور جب تک یہ اندازِ نظر پڑھنے والے کے پاس نہیں ہو وہ ان کی شاعری کی خصوصیات اور انفرادیت کو پسند نہیں کر سکتا۔''

آگے لکھتے ہیں ''کلکِ موج میں ۶۴ غزل نما نظمیں ہیں۔ غزل نما میں نے اس لئے کہا ہے کہ یہاں اشعار میں وہ ربط موجود ہے جو نظموں میں اور ساتھ ساتھ وہ مزاج بھی نظر آتا ہے اس اعتبار سے سارا مجموعہ نظم اور غزل کے سنگم اور نقطۂ اتصال کا ایک تجربہ ہے۔

علم وخیال کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسکے ذریعہ زندگی کی ابدی حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک بات اور ہمارے ہاں اردو میں اب تک ہندی لفظوں کے درمیان عطف واضافت کا استعمال ایک گناہِ کبیرہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس بے جا پابندی کی وجہ سے ہندی زبان کے الفاظ ہماری زبان کے اندر گھل مل کر ایک نہیں ہو سکے ہیں۔ خالد نے اس پابندی کو بھی توڑنے کی کوشش کی ہے جو یقیناً ایک نیک شگون ہے مثلاً اس شعر میں کڑوا اور میٹھا کے درمیان وعطف لگایا گیا ہے۔

سیٹھا، سلونا، کڑوا و میٹھا　　　سب یہ ملیں تو چوکھی ہو لذت

'کلک موج' اردو شاعری کا ایک خوبصورت مجموعہ ہے جسے اچھے ٹائپ عمدہ کاغذ، مضبوط جلد اور جاذب نظر گرد و پوش کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔''[1]

تبصرہ　　(اسلام اور موسیقی)

''اسلام اور موسیقی' شاہ محمد جعفر ندوی کی تصنیف ہے۔ جس پر ڈاکٹر جمیل جالبی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

---

[1] نیا دور کراچی شمارہ ۳۳-۳۴ ص ۳۵۱-۳۵۵

''ہم مسلمان بھی عجیب وغریب قوم ہیں۔ہم نے بعض بنیادی مسائل کو اس درجہ الجھا دیا ہے اور صدیوں سے خود اپنے شبہات کے اندر ایسے پھنسے ہوئے ہیں جیسے مکڑی اپنے جالے میں۔اب تک ہم یہ سمجھتے رہے ہیں اور یہ خیال بالکل عام ہے کہ موسیقی مذہب اسلام میں حرام ہے اور نہ صرف موسیقی بلکہ دوسرے اور فنونِ لطیفہ بھی لہوولعب کا درجہ رکھتے ہیں۔اب آپ خود ہی سوچئے کہ اگر زندگی سے سارے فنونِ لطیفہ کو اس طور پر خارج کردیا جائے تو آخر پھر ہمارے پاس اظہار کا کیا ذریعہ رہ جاتا ہے۔ظاہر ہے تلوار اظہار کا انسانی ذریعہ کبھی نہیں بن سکتی۔اس تصور سے اسلام کو بذاتِ خود بہت نقصان پہنچا ہے۔اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم فنون لطیفہ کی طرف اپنے رویہ کو متعین کرلیں اور اس الجھن اور ذہنی شبہ کو اپنے دماغ سے نکال دیں کہ فنونِ لطیفہ لہو ولعب کا درجہ رکھتے ہیں اور اس سے اسلام اور اسکی روح کو صدمہ پہونچتا ہے۔'' جمیل جالبی صاحب مزید لکھتے ہیں ''اسلام اور موسیقی'' اس غلط رجحان پر روشنی ڈالتی ہے۔شاہ محمد جعفر ندوی نے قرآن، احادیث، فقہ اور دوسرے اکابرین اسلام کے اقوال وافعال سے اس مسلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ موسیقی کو نہ اسلام نے حرام سمجھا ہے اور نہ رسول صلعم اور دوسرے اکابرین نے۔ مولانا محمد جعفر شاہ ندوی نے اس موضوع پر جس قدر مواد ممکن تھا اس کتاب میں یکجا کر دیا ہے۔اہلِ نظر کے لئے اس میں کافی روشنی ہے۔

دیگر فنونِ لطیفہ کی طرح موسیقی بھی شقاوت اور سخت دلی دور کرتی ہے۔ہمارے تعجب میں اس وقت اور اضافہ ہو جاتا ہے۔جب ہم دیکھتے ہیں کہ عہد نبوت سے لے کر آج تک موسیقی میں اہلِ اسلام نے صرف عملی حصّہ ہی نہیں لیا ہے بلکہ علمی وفنی حیثیت سے بھی یہ امت کسی سے پیچھے نہیں رہی ہے۔

اکابر امت نے فن موسیقی کے مختلف پہلوؤں پر اعلٰے کتابیں لکھی ہیں۔اور اس فن کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔اگر موسیقی ایسی ہی حرام ہوتی تو آئمہ دین قسم کے لوگوں کا اس فن پر کتابیں لکھنا آسانی سے سمجھ میں نہیں آنا چاہئے۔دہلی کے

موسیقاروں میں جب فنی اختلاف ہوتا تھا تو وہ تحقیق و تصدیق کے لئے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے پاس جاتے تھے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی پیغمبر اسلام کے زمانے کا ایک واقعہ بھی نقل کرتے ہیں۔ ایک عورت حضور کے پاس آئی حضور نے پوچھا کہ عائشہ تم اسے پہچانتی ہو۔ کہا نہیں حضورؐ بتائیں۔ فرمایا یہ فلاں قبیلہ کی میراثن ہے۔ کیا تم اس کا گانا پسند کروگی؟ اس کے بعد اس نے حضرت عائشہ کو گانا سنایا۔ حضورؐ نے سنکر فرمایا کہ یہ تو بلا کی گانے والی ہے۔ (بحوالہ نسائی وطبرانی)

کارِ نبوت یہ ہے کی پیغمبر کسی خاص علم وفن کا ماہر بن کر نہیں آتا اور نہ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں کو کسی نہ کسی علم و ہنر کا ماہر بنادے۔ ماہر بننا خود افراد کا کام ہے۔ پیغمبر کا اصل کام صرف ایک مزاج ایک روّیہ پیدا کرنا ہے جسے اپنا لینے کے بعد سوسائٹی کے افراد کو جزئیاتِ فن کی تعلیم دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ پیغمبر کا عطا کردہ مزاج افکار گفتار و کردار پر چھا جاتا ہے۔ فرد جدھر چاہے جائے جس فن میں چاہے مہارت پیدا کرے لیکن حدود سے متجاوز ہوتے وقت وہی مزاج اندر سے لگام کھینچ لیتا ہے۔ رسول صلعم کا دورِ تمدن انتہائی عربی سادگی کا دور تھا۔ علم حساب کا یہ عالم کہ ہزار سے اوپر اعداد کے لئے ان کی لغت میں کوئی لفظ نہ تھا سواری کے لئے کوئی پہیئے دار گاڑی کا وجود نہ تھا۔

مولانا شاہ محمد جعفر ندوی نے اسی نقطہ نظر سے اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ کیا اچھا ہو اگر مولانا اسی قسم کے دوسرے مسائل پر روشنی ڈال کر ہماری تنگ نظر قوم میں وسیع النظری پیدا کرنے میں مدد دیں تا کہ وہ اسلام کی صحیح روح کو سمجھ سکے۔"[1]

---

[1] نیا دور کراچی شمارہ ۱۵۔۱۸ ص ۳۸۸۔۳۹۱

اداریہ نگاری

ڈاکٹر جمیل جالبی کی ادبی سرگرمیوں کا ایک اہم پہلو اداریہ نگاری بھی ہے اداریہ لکھنا ایک مشکل فن ہے۔ اداریہ نویسی کی اہمیت یہ ہے کہ مدیر کسی ایسے رجحان یا بحران کو موضوع بناتا ہے جس کا تعلق عموماً موجودہ ادبی یا ثقافتی صورتحال سے ہوتا ہے۔ اداریوں سے ادب اور ثقافت کے مختلف معاملات کے بارے میں مدیر کے اندازِ فکر کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخی اہمیت کے حامل کئی یادگار اداریے تحریر کئے ہیں۔ جون ۱۹۵۰ء سے ڈاکٹر جمیل جالبی کا نام شاہد احمد دہلوی کے ماہنامہ ''ساقی'' میں شامل ہوا اور پہلا اداریہ ''باتیں'' کے عنوان سے لکھا۔ ساقی کے لیے انھوں نے پچیس اداریے ''باتیں'' عنوان ہی سے تحریر کئے۔ پھر تب اپنی نگرانی میں سہ ماہی رسالہ نیا دور کے نام سے اگست ۱۹۵۵ء میں جاری کیا اس کے لیے اداریے خود لکھنے لگے۔ ۱۹۹۳ء تک نیا دور کے لیے بائیس (۲۲) اداریے لکھے اس طرح اداریوں کی تعداد اردو میں کل ۴۷ ہے۔ اس کے علاوہ دو انگریزی میں بھی لکھے ہیں۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) " Editorial" in Journal of Social Sciences and Humanities. Karachi: University A Karachi, (1-2) , 1984

(2) " Editorial " in Journal of Social Sciences and Humanities, Karachi : University of Karachi, (1-2), 1985.

نیا دور شمارہ ۳۱۔۳۲ کے اداریے میں اس وقت کے ایک سنگین ادبی بحران کو موضوع بنایا ہے۔ یعنی اس وقت عام طور پر شکایت سننے میں آتی تھی کہ اب افسانوں کے مجموعے زیادہ فروخت نہیں ہوتے۔ چنانچہ سوال یہ تھا کہ افسانوں سے لوگوں کی دلچسپی کیوں کم ہو رہی ہے؟ کیا اس بات کا تعلق لباس اور جوتوں کی طرح بدلتے ہوئے فیشن سے ہے یا اس کا تعلق ہمارے افسانوں میں کسی گہری معنویت کے فقدان سے ہے۔ ڈاکٹر جالبی نے مذکورہ اداریے میں اس سوال پر مفکرانہ نظر ڈالی ہے اور اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ترقی پسند فکر کے زیر اثر جو افسانے لکھے گئے۔ ان کی بنیادی صفت '' زندگی کی آئینہ داری'' ہے۔ اردو افسانہ گزشتہ پچیس سال سے زندگی کی اسی آئینہ داری میں مصروف ہے۔ اس عمل سے افسانے میں ایک اکتا دینے والی یکسانیت پیدا ہو گئی ہے جس کا صنف افسانہ کی مقبولیت پر منفی اثر پڑا ہے

''زندگی کی آئینہ داری'' کا مفہوم کیا ہے؟ اس کی وضاحت کے لیے زیر بحث اداریئے کے چند ضروری اقتباسات ایک ساتھ پیش کیے جاتے ہیں:

''۱۹۳۶ء کی تحریک نے ادب کو فلسفہ ادب کی شکل میں جو کچھ دیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہے، یہ وہ زاویہ نظر تھا جس سے اس تحریک نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا نہ صرف اظہار کیا بلکہ قدیم ادب کو بھی اسی زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی۔ پسند و ناپسند کا جدید معیار یہی ٹھہرا۔ یہ عمل جدید شاعری، ناول، افسانہ، اور تنقید میں یکساں طور پر نظر آتا ہے۔ افسانے میں زندگی کی آئینہ داری کا مطلب یہ تھا کہ گردو پیش کے حالات وعوامل روزمرہ کے واقعات سامنے کی باتیں زیادہ سے زیادہ حقیقی شکل میں پیش کی جائیں''۔

احمد علی کا افسانہ 'ہماری گلی' اور کرشن چندر کا افسانہ ایک فرلانگ لمبی سڑک، دراصل زندگی کی آئینہ داری انہی معنی میں کررہے تھے کہ خارجی طور پر زندگی جسمانی و مادی حرکات اور عمل کا اظہار کیا جائے۔ زندگی کی آئینہ داری کے اس مفہوم نے افسانہ نگاری کو محض فارمولا بنا دیا۔ جس پر رومانی جنسی، نفسیاتی، معاشرتی، سمبی اور اساطیری، افسانے لکھے جانے لگے۔ یادِ ماضی کے افسانے بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ بحثیت مجموعی ہمارا افسانہ جسمانی و مادی ماحول اور عوامل کے اظہار تک محدود ہوگیا۔ یہی عمل ایک ہی سطح پر اور ایک ہی لے میں ہمارا افسانہ گزشتہ پچیس سال سے کررہا ہے، مادی وجسمانی ماحول وعوامل کی اسی یکسانیت کی وجہ سے افسانہ ایک مقبول صنف ادب کی حیثیت سے گزر رہا ہے۔''

خطبات

ڈاکٹر جمیل جالبی دورِ حاضر کے مستند محقق اور نقاد ہونے کے ساتھ مورخ کلچر شناس ترجمہ نگار اور بچوں کے ادیب اور ساتھی ہیں۔

انھوں نے اپنی زندگی میں مختلف جلسوں میں شرکت کی اور صدارت بھی کی ہے یہی وجہ ہے کہ اردو ادب میں انکے خطبات بھی شہرت کے حامل ہیں۔ یہاں ہم چند مشہور خطبوں کا ذکر کر رہے ہیں۔

''خطبۂ صدارت جس میں ڈاکٹر داؤد رہبر کے کام کا تعارف کرایا گیا ہے'' ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے خطبہ میں کہا کہ ''ڈاکٹر داؤد رہبر کے مضامین اور تصانیف تو میں گہری دلچسپی کے ساتھ پڑھتا رہا ہوں لیکن ان سے ملاقات کا شرف ذرا دیر سے حاصل ہوا۔ جب ملاقات ہوئی تو پتا چلا کہ وہ تو ایسے معقول مترجم صاحب علم اور دوست انسان کہ جن سے صرف علم و ادب کی سطح پر تبادلہ خیال کیا جاسکتا ہے بلکہ ان کے تہذیبی وفکری اندازِ نظر میں اتنی جان اور توانائی ہے کہ انکی تحریروں اور گفتگو سے ماضی و حال سے گزرتے ہوئے مستقبل کی طرف اعتماد کے ساتھ پیش قدمی کی جاسکتی ہے وہ ایسے مفکر ہیں جن سے اختلاف کرتے ہوئے بھی اتفاق کرنے کو جی چاہتا ہے۔''

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ ''یہ بھی خطبۂ صدارت ہے جو حمیدہ اختر حسین رائے پوری کی تصنیف ''ہم سفر'' کے بارے میں لکھا گیا ہے اور اس جلسے میں پڑھا گیا جو اس کتاب کی تقریبِ رونمائی کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔''

اس خطبہ میں ڈاکٹر جالبی نے حمیدہ اختر حسین رائے پوری کے بارے میں بتایا ہے کہ کس طرح انھیں قلم اٹھانے پر آمادہ کیا اور ''ہم سفر'' لکھنے کی دیر تھی وہ ایک پسندیدہ ومقبول لکھنے والوں میں شمار ہونے لگیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''اقبال میموریل لیکچرز'' پر بھی لیکچر دیا ہے جس کا موضوع ہے ''علامّہ اقبال، خطوط کے آئینے میں۔

بقول جمیل جالبی ''اس موضوع پر اظہارِ خیال کرنے کی دو وجہیں اور

تھیں ۔ایک یہ کہ اقبال کے خطوط پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں ان کے تمام خطوط کو سامنے نہیں رکھا گیا ۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اقبال کے خطوط ان کی ذات وشخصیت ان کے ذہنی عوامل و رجحانات ،ان کے اندازِ فکر اور حالات کی ایک ایسی بھر پور تصویر سامنے آتی ہے کہ ہمیں اقبال کی عظمت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے"[۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک اور خطبہ "ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی یادگاری خطبہ" جو ۱۹۹۳ء میں انھوں نے دیا تھا اہمیت کا حامل ہے اس کا موضوع ہے "پاکستان میں ذریعہ تعلیم کا مسئلہ" ان کا خیال ہے۔

"ذریعہ تعلیم بظاہر معمولی سی بات نظر آتی ہے لیکن اس نے پاکستانی معاشرہ اور ثقافت کو تخلیقی ،معاشرتی وتہذیبی حتیٰ کہ معاشی سطح پر بری طرح نقصان پہنچایا ہے ۔جن قوموں کے ہاں ذریعہ تعلیم وہی زبان ہے جو معاشرے میں عام طور پر بولی یا سمجھی جاتی ہے ان قوموں نے نہایت تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کی ہیں ۔"[۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی پاکستان کی ترقی کے لئے ہر لحہ کوشاں رہتے ہیں ۔یہ بات انکی کتابوں اور خطبوں سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے "لکھنو تہذیب کا نمائندہ شاعر قلندر بخش جرات" کے نام سے ۸ رنومبر ۱۹۸۹ء کو ایک خطبہ پیش کیا تھا ۔یہ خطبہ ڈاکٹر سید عابد حسین میموریل ٹرسٹ کے عہدیداران کی درخواست پر دیا گیا۔ یہ خطبہ تقریباً ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے ۔یہ باقاعدہ ایک مختصری کتاب ہے ۔ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں

"جرات نے سوز وحسرت کی روایت معاملہ بندی کو اس تہذیب کے مزاج وپسند کے مطابق اتنا کھول دیا کہ ان کی شاعری اس دور کے مزاج کا آئینہ بن گئی ۔جرات کا دیوان ہر وقت آصف الدولہ کے سرہانے رکھا رہتا تھا ۔یہ وہ کلام تھا ۔جو اس معاشرے کے فرد کی روح کی ترجمانی کرر ہا تھا ۔یہ کلام دل کو بہلانے کا شغل بھی تھا اور افکارِ زمانہ سے نجات کا ذریعہ بھی ۔"[۳]

ان خطبوں کے علاوہ ان کا ایک خطبہ بابائے اردو یادگار لیکچر محمد تقی میر ہے یہ ایک کتاب کی شکل میں ہے اور ہماری تھیسیس میں شامل ہے۔

۱۔ اقبال میموریل لیکچرز ،ڈاکٹر جمیل جالبی ،شعبہ فلسفہ ،جامعہ پنجاب لاہور ص ۳۔۴

۲۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی یادگاری خطبہ ،ڈاکٹر جمیل جالبی مقتدرہ قومی زبان ۱۹۹۳ء ص ۳

۳۔ قلندر بخش جرات ،ڈاکٹر جمیل جالبی ،مکتبہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۸۹ء ص ۱۵

پیش لفظ

ڈاکٹر جمیل جالبی نے مختلف کتابوں کے پیش لفظ بھی لکھے ہیں۔ جن میں چند کو بطور خاص شہرت ملی۔ ہنری جیمز کے ناول ''دی پورٹریٹ آف اے لیڈی'' کا ترجمہ قرۃ العین حیدر نے کیا تھا۔ جس کا پیش لفظ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تحریر کیا۔ یہ پیش لفظ پانچ صفحوں پر مشتمل ہے جس میں ہنری جیمز کے فکشن کی نمایاں خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

ہنری جیمز کے ناولوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ان میں حقیقی زندگی کا گہرا مطالعہ پیش کرتا ہے اور کردار کے ''عمل'' سے زیادہ کردار کے ''ردِ عمل'' پر توجہ دیتا ہے۔ نفسیاتی حقیقت نگاری میں وہ سب کا پیش رو ہے۔ ناول کی تکنیک میں بھی اس نے نئے اور کامیاب تجربے کیے۔ بنیادی طور پر ان ناولوں میں امریکی زندگی پر یورپ کی پرانی تہذیب کے اثر کو موضوع بنایا گیا ہے۔

دوسرا مشہور پیش لفظ ڈاکٹر جمیل جالبی نے روسی پروفیسر ڈاکٹر لدمیلا کی تصنیف ''فیض احمد فیض: حیات اور تخلیقات'' کے لیے لکھا ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے لدمیلا کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

ڈاکٹر لدمیلا اردو زبان و ادب سے گہری دلچسپی رکھتی ہیں۔ اس زبان پر انہیں ایسی قدرت حاصل ہے کہ کم لوگوں کو ہو گی۔ وہ اہلِ زبان کی طرح صحیح تلفظ کے ساتھ، روانی سے اردو بولتی ہیں۔ ان کا ذخیرہ الفاظ وسیع اور ان کے اظہار میں قوت اور زور ہے۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ غیر اہلِ زبان میں اس وقت کوئی دوسرا ان جیسا نہیں ہے۔ جدید اردو ادب پر ان کی نظر گہری ہے جس کا اندازہ نہ صرف آپ زیرِ نظر کتاب کے مطالعے سے لگا سکتے ہیں بلکہ اس کتاب کے آخری پانچ ابواب کے ان تراجم سے بھی لگا سکتے ہیں جو انہوں نے روسی زبان سے اردو زبان میں کیے ہیں۔ ڈاکٹر لدمیلا اس وقت ماسکو کے ادارۂ شرقیات میں سینیر ریسرچ ایسوسی ایٹ کے عہدے پر فائز ہیں۔ انہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی ۱۹۸۷ء میں اردو ادب میں ہی حاصل کی ہے۔ برسوں وہ ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی میں بطور لیکچرار درس و تدریس میں مصروف رہی ہیں جہاں طلبہ و طالبات کو جدید اردو ادب، تاریخ ادبِ اردو اور اردو شاعری پڑھاتی اور بی اے، ایم اے کی سطح پر اردو زبان

کی تعلیم دیتی رہیں ہیں۔اس کے علاوہ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۸۹ء تک وہ ماسکو ریڈیو اردو سروس میں بحیثیت براڈ کاسٹر اور مترجم بھی کام کرتی رہیں ہیں۔اس سے آسانی سے اندازلگایا جاسکتا ہے کہ اردو زبان وادب ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔''

ڈاکٹر جمیل جالبی مزید لکھتے ہیں کہ۔

ڈاکٹر لدمیلا کی یہ تصنیف لکھی تو روسی زبان کے قارئین کے لیے ہے۔لیکن اس میں نقد ونظر کا آفاقی معیار اور ساتھ ہی اندازِ بیان ایسا ہے کہ یکساں طور پر اردو قارئین کے لیے بھی مفید دلچسپ ہوگئی ہے۔اس کے مطالعے سے فیض کی شخصیت اور ان کی شاعری وفکر کی اہمیت نمایاں ہوتی ہے۔اس میں بہت سی باتیں ایسی آ گئی ہیں جو خود اردو قارئین کے لیے بھی نئی ہیں۔اسی طرح روسی ماخذ بھی اچھوتے ہیں۔اس تصنیف کی خوب صورتی یہ ہے کہ اس میں فیض کی ذات، ان کی شخصیت اور حالات عصر کو اس طرح گوندھا گیا ہے کہ یہ سب ایک وحدت، ایک اکائی بن گئے ہیں۔اسی طرح فیض کی غزلوں کے اشعار کا تجزیہ وتشریح خصوصاً فیض کی غزلوں کے روایتی رموز وکنایات، عصری مزاج اور خود فیض کی زندگی کے واقعات سے اس طرح پیوست ہیں کہ ظاہری طور پر کوئی سماجی یا سیاسی پہلو نہ ہونے کے باوجود شعر کا سیاسی رنگ نمایاں رہتا ہے۔اس کی کچھ مثالیں اسیری کے کلام کے مطالعے میں دیکھی جاسکتی ہیں۔اسیری کے کلام کے ارتقا کے تعلق سے ڈاکٹر لدمیلا نے ایک نکتہ یہ بھی بتایا ہے کہ اس کلام کو پڑھتے ہوئے آپ محسوس کریں گے کہ نظم غزل کی طرف اور غزل نظم کی طرف بڑھی ہے۔فیض کی بعض نظموں کے اشعار غزل کے جیسے معلوم ہوتے ہیں اور اسی طرح غزل کا شعر آسانی سے ایک پوری نظم میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

ایک اور پیش لفظ جس کا ذکر خصوصیات کے ساتھ کیا جانا چاہئے۔سید وصی احمد بلگرامی کی کتاب ماہِ کنعان کے لیے تحریر کیا ہے اس پیش لفظ کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''تقریش'' کہا ہے اس نئے لفظ کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''تقریش کا لفظ میں نے وضع کیا ہے جس کے معنی ایسی تحریر یا پیش لفظ کے ہیں جس میں تقریظ کا پہلو نمایاں ہو۔''

اس تقریش میں وصی احمد بلگرامی اور ان کی کتاب کا تعارف یوں کرایا گیا ہے۔

بلگرامی صاحب ایک علمی وادبی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ مشہور زمانہ تذکرے'' جلوۂ خضر'' کے مصنف جناب صفیر بلگرامی (متوفی ۱۱رمئی ۱۸۹۰ء) کے پوتے تھے۔ ۱۶ردسمبر ۱۸۸۹ء کو آرہ (بہار) میں پیدا ہوئے۔ بی اے تک تعلیم پائی اور ۱۹۱۸ء میں سرکاری ملازمت میں آگئے۔ ۱۹۴۷ء میں رٹیائر ہوکر اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئے اور پھر یہیں کے ہور ہے۔ ۱۴رنومبر ۱۹۷۶ء کو وفات پائی۔ قیام پاکستان کا سارا زمانہ لکھنے پڑھنے میں گزارا اور اردو زبان کو اپنی منفرد تحریروں سے مالامال کیا۔ اس زمانے میں جو مضامین لکھے ان کا مجموعہ'' دیر وحرم کا افسانہ'' کے نام سے ۲۰۰۳ء میں'' صفیر بلگرامی اکیڈمی کراچی'' کے زیر اہتمام شائع ہوا اور بہت مقبول ہوا۔ اب ان کا ایک اور زیر نظر مجموعہ'' ماہِ کنعان'' کے نام سے شائع ہورہا ہے۔ یہ وہ تحریر ہے جس کی پہلی قسط مئی ۱۹۷۱ء میں ماہنامہ'' مہرنیم روز'' میں اور آخری یعنی چھبیسویں قسط ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی۔

ماہِ کنعان'' میں ان کا طرز نگارش اپنے درجہ کمال کو پہنچ گیا ہے۔ بیان ایسا کہ آئینے کی طرح شفاف وروشن۔ اظہار کی دل نشینی ایسی کہ تاریخ کی ایک ایک سطر دل میں اُتر جاتی ہے۔ اتنے مشکل اسطوری موضوع کو انہوں نے اپنے قلم سے، داستان کی طرح، دلچسپ بنا دیا ہے۔ جب آپ اس تصنیف کو پڑھیں گے تو وہی لطف آئے گا جو کسی الہامی کتاب کے پڑھنے میں آتا ہے اور جس کا لہجہ وآہنگ دل میں اُتر جاتا ہے۔ سارے بیان میں ایسا تسلسل ہے کہ ناول کی طرح پڑھا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ماہِ کنعان کی اسطوری داستان میں قرآن مجید کے بیان کی صحت کو برتر وقائم رکھا ہے اور قرآن ہی کے حوالے سے'' آیت کے بیان کو صحیح و درست کیا ہے اور قصہ یوسف کو فارسی مثنویوں کے اردو تراجم سے مزید رنگین بنایا ہے۔ بالخصوص مولانا جامی کی مثنوی'' یوسف وزلیخا'' سے۔ ان کی ہر سطر جو صفحہ قرطاس پر آئی تحقیق وصحت بیان کی پوری طرح آئینہ دار ہے۔

جمیل جالبی نے پیش لفظ نگاری کے فنی تقاضوں کو نہ صرف ملحوظ رکھا ہے بلکہ وصی بلگرامی کی کتاب کا پیش لفظ لکھتے ہوئے جدت سے بھی کام لیا ہے۔

خاتمہ (جمیل جالبی کے علمی وادبی کارناموں پر محاکمہ)

خاتمہ (جمیل جالبی کے علمی وادبی کارناموں پر محاکمہ)

ڈاکٹر جمیل جالبی کی علمی وادبی خدمات پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہ یک وقت کئی حیثیتوں کے مالک ہیں یعنی وہ مورخ بھی ہیں اور اس کے ساتھ دانشور، محقق، ناقد اور مترجم بھی۔ ان کی ایک حیثیت بچوں کے ادیب کی بھی ہے اس کے علاوہ ان کی شفیق اور دل آویز شخصیت شرفا کی یادگار ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی ملک وقوم اور علم وادب کی خدمت کے لئے وقف کر رکھی ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے جو عظیم خدمات انجام دی ہیں، قومی وادبی تاریخ میں انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

گذشتہ اوراق میں مختلف ابواب کے تحت جمیل جالبی کی گوناگوں حیثیتوں کا مفصل جائزلیا جاسکتا ہے یہاں ان کے علمی وادبی کارناموں کا مختصر محاکمہ پیش کیا جاتا ہے۔

جمیل جالبی کی ایک حیثیت ادبی مورخ کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا لازوال کارنامہ ''تاریخ ادب اردو'' ہے۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے پہلی جلد ۱۹۷۵ء میں اور دوسری جلد دو حصّوں میں ۱۹۸۲ء میں چھپی۔ انہیں اردو ادب کی تاریخ لکھنے کا خیال ۱۹۶۰ء کی دہائی کے ابتدائی زمانے میں آیا۔ چنانچہ ایک انٹرویو میں جالبی نے بتایا کہ

> ''میری خواہش تھی کہ اردو ادب کی ایک تاریخ لکھی جائے جو پرانے سانچوں کو توڑ کر ادبی تاریخ نویسی کا ایک نیا ڈھانچہ فراہم کرے۔ اس میں حالات وواقعات صحیح اور درست ہوں۔ جو تحقیقی نقطہ نظر سے سارے مواد کو کھنگال کر واقعات کے سروں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہو۔ جس میں ادبی شخصیات کے تخلیقی کاموں کو جدید انداز تنقید سے مطالعہ کیا گیا ہو۔''[۱]

''تاریخ ادب اردو'' میں انھوں نے اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی ہے۔ مگر اس کے لئے انھیں بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے بڑی مشکل تو یہ تھی کہ

۱۔ ارمغان سہ ماہی کراچی جمیل جالبی نمبر، شمارہ ۳ (اپریل، مئی، جون) ۱۹۹۶ء ص ۱۱۸

قدیم اردو ادب کا ایک بڑا حصّہ کتب خانوں میں بند ہے اور کسی ایک جگہ پر بھی نہیں ہے مختلف شہروں اور ملکوں میں قلمی نسخوں کی شکل میں محفوظ ہے۔ جس کو حاصل کرنا آسان نہیں تھا اور اس کے علاوہ قدیم ادب کا جو حصّہ شائع ہوا۔ وہ بھی قابلِ اعتماد نہیں ہے ایسی صورتحال میں جمیل جالبی نے بڑی محنت اور جاں فشانی کے ساتھ ان ادبی ذخائر تک رسائی حاصل کی اور نہایت احتیاط سے مخطوطات کا براہ راست مطالعہ کیا۔ جب کہ اس کے برخلاف ہمارے دوسرے ادبی مورخوں نے براہ راست مطالعے کی زحمت کم ہی گوارا کی جس کا نتیجہ عموماً یہ برآمد ہوا کہ ان کی لکھی ہوئی ادبی تاریخوں میں نقل درنقل کی غلطی راہ پا گئی۔

جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو سے پہلے اردو زبان و ادب کی کئی تاریخیں تحریر کی گئیں جن میں محمد حسین آزاد کی ''آب حیات''، رام بابو سکسینہ کی ''تاریخ ادب ارود'' حامد حسین قادری کی ''داستان تاریخ اردو'' اور علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' قابلِ ذکر ہیں۔

لیکن ان سب کے مقابلے میں جمیل جالبی کی ''تاریخ ادب اردو'' بہ وجوہ زیادہ معتبر ہے مثال کے طور پر یہ ''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' سے اس اعتبار سے بہتر ہے کہ یہ متفرق مقالات کا مجموعہ نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس میں خیالات اور حالات و واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے سے مربوط نظر آتی ہیں۔ اس لحاظ سے اگر اسے جدید ادبی تاریخ نویسی کے لیے مثالی نمونہ قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس میں اگر ہمیں کہیں کچھ کمی کھٹکتی بھی ہے تو اس کو نظر انداز کرنا بہتر ہوگا کیونکہ بہر حال یہ فردِ واحد کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

جمیل جالبی کی ایک حیثیت نقاد کی بھی ہے۔ لیکن ناقد کے روپ میں وہ کسی ایک تنقیدی طریق کار کو اپنانے کے حق میں نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک کسی تخلیقی شخصیت کا مطالعہ ایک ہی معیار اور ایک ہی پیمانے سے نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ تخلیقی رنگارنگی اور روایت کے تنوع کے پیش نظر تنقیدی معیار اور زاویے بھی حسب ضرورت بدلتے رہنا چاہئے، تاکہ انفرادیت کا لطیف فرق واضح ہو سکے۔ چنانچہ جمیل جالبی کے یہاں ہمیں تنقید کی مختلف صورتیں ملتی ہیں تخلیقی و معروضی بھی، نفسیاتی و سماجی بھی اور تقابلی و تجرباتی بھی۔ جمیل جالبی کے تنقیدی شعور کا اظہار نہ صرف ان کے تنقیدی مضامین میں ہوا ہے۔ بلکہ ''تاریخ ادب اردو'' میں بھی انھوں نے تنقید کے افق کو وسیع کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ادبی تاریخ میں تحقیق اور تنقید کا امتزاج ہوتا ہے یہی امتزاج ادبی تاریخ کی اصل روح ہے۔'' تاریخ ادب اردو'' کے علاوہ '' تنقید اور تجربہ'' (۱۹۶۷ء) '' نئی تنقید'' (۱۹۸۵ء) اور'' معاصر ادب'' (۱۹۹۱ء) جیسے تنقیدی مضامین کے مجموعے اردو تنقید کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کہے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے جہاں تنقید کے میدان میں قابل قدر کام انجام دیا ہے وہیں تحقیق جیسے دشوار گذار اور صبر آزما کام کا بیڑا بھی اٹھایا ہے۔قدیم دکنی ادب کی تلاش و تحقیق کا آغاز بیسویں صدی کے ربع اول سے ہوتا ہے۔حکیم شمس اللہ قادری ،مولوی عبد الحق ، ڈاکٹر زور عبد القادر سروری ، نصر الدین ہاشمی ،مسعود حسین خاں ،سیدہ جعفر اور حسینی شاہد جیسے محقق نے دکنی ادبیات کی بازیافت ، تحقیق و تدوین کے سلسلے میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں ۔مگر ان میں جمیل جالبی کا نام سرفہرست ہے۔تاریخ ادب اردو (جلد اول) دیوان حسن شوقی ، دیوان نصرتی ،مثنوی کدم راؤ پدم راؤ اور قدیم اردو کی لغت جیسی کتابوں کے مطالعے کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ ایک صاحب نظر محقق اور ماہر دکنیات کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

جمیل جالبی کو تحقیق کے ساتھ تدوین کی دنیا میں بھی بڑا اعتبار حاصل ہے۔انھوں نے درجن بھر کتابیں مرتب کی ہیں اور سب میں تدوین کے جدید اصولوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ان میں سے مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ، دیوان حسن شوقی ، بزم خوش نفساں اور کلیات میراجی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کی تدوین تو ان کا شاندار کارنامہ ہے اور حق تو یہ ہے اردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے یہ کتاب کافی ہے۔

بحیثیت دانشور ڈاکٹر جمیل جالبی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے پاکستانی کلچر کے موضوع پر نہایت سنجیدگی کے ساتھ جامع اور مفصل بحث کی ہے۔پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک بن کر ابھرا تھا۔اس کو اپنی پہچان کے لیئے ایک کلچر کی اشد ضرورت تھی۔اس ضرورت کے پیش نظر ڈاکٹر جالبی نے ''پاکستانی کلچر'' کے نام سے ایک کتاب ۱۹۶۴ء میں لکھی جس کا انگریزی ترجمہ بھی ۱۹۸۴ء میں شائع کیا گیا۔اس موضوع پر اردو میں یہ پہلی مستقل کتاب ہے اور خود جالبی کی پہلی بھرپور تصنیف بھی ہے۔پاکستان میں کلچر پر جو بحث بھی شروع ہوئی وہ اس کتاب کے سامنے آنے کے بعد ہوئی۔اگر چہ یہ درست ہے کہ کلچر پر غور وفکر

کے سلسلے میں ہمارے ہاں سرسید کو اولیت کا شرف حاصل ہے لیکن ان کے بعد جن دوسرے دانشوروں نے اس موضوع پر مزید غور وخوض کیا ان میں جمیل جالبی کو منفرد مقام حاصل ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کہنہ مشق مترجم بھی ہیں انگریزی سے اردو میں تراجم جس حسن وخوبی سے انھوں نے کیے ہیں، اس کا اعتراف عام طور پر کیا گیا ہے۔ ترجمے کے سلسلے میں ان کی درج ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں۔

(۱) جانورستان مصنفہ جارج آرول (۱۹۵۸ء)

(۲) ایلیٹ کے مضامین (۱۹۶۰ء)

(۳) ارسطو سے ایلیٹ تک (۱۹۷۷ء)

(۴) برصغیر میں اسلامی جدیدیت مصنفہ پروفیسر عزیز احمد (۱۹۸۹ء)

(۵) برصغیر میں اسلامی کلچر مصنفہ پروفیسر عزیز احمد (۱۹۹۱ء)

ان کے ترجموں سے اردو زبان وادب کو بہت فیض پہنچا ہے ڈاکٹر جالبی کا ترجمہ اتنا قدرتی رواں اور انفرادی ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کو اصل تصنیف کا مزہ آتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ترجمے کے معاملے میں بھی ان کی خدمات انفرادیت کی حامل ہیں۔

جمیل جالبی کے تخلیقی کاموں کی اہمیت کم سہی لیکن نظرانداز کرنے کے قابل نہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت بچوں کا ادب تحریر کرنے میں صرف کی ہے۔

جمیل جالبی کی ''قدیم اردو کی لغت'' ذخیرہ الفاظ کی وسعت کے لحاظ سے قدیم اردو کی بہترین لغت ہے۔ دوسری لغات اور فرہنگِ اصطلاحات بھی اپنی عمومی افادیت کے پیش نظر اہمیت کی حامل ہے۔

جمیل جالبی کے اداریے اور تبصرہ ادبی صحافت کے عمدہ اور قابل تقلید نمونے ہیں تقریظ نگاری جیسی فرسودہ تحریر کو بھی انھوں نے جدت عطا کی اور اسے ''تقریش'' کا نام دیا۔ لیکن اس جدت کے باوجود اس کی افادیت مشکوک ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تصانیف وتالیفات کے اس جائزے اور محاکمے کے بعد یہ حقیقت کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں رہتی کہ ان کا علمی وادبی سرمایہ ہمارے اردو زبان وادب کا ایک گراں قدر حصّہ ہے۔

کتابیات

کتابیات

میں نے اپنے مقالہ ''جمیل جالبی کی ادبی خدمات'' کو مکمل کرنے کے لئے جن کتب و رسائل سے مدد لی ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں ۔

نمبر شمار	نام کتب	مرتبہ / مصنّف موئف / مترجم	ناشر	سنِ اشاعت
۱	ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ	گوہر نوشاہی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۔ ۶	۱۹۹۳ء
۲	میرا جی ایک مطالعہ	ڈاکٹر جمیل جالبی		
۳	ن ۔ م ۔ راشد ایک مطالعہ	ڈاکٹر جمیل جالبی	مکتبہ اسلوب کراچی	۱۹۸۶ء
۴	بزم خوش نفساں	ڈاکٹر جمیل جالبی	مکتبہ اسلوب کراچی	۱۹۸۵ء
۵	کلیاتِ میرا جی	ڈاکٹر جمیل جالبی	اردو مرکز لندن	۱۹۸۸ء
۶	مثنوی کدم راؤ پدم راؤ	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی	۱۹۷۳ء
۷	دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی	۲۰۰۲ء
۸	اردوئے قدیم	شمس اللہ قادری	نول کشور واقع لکھنو	۱۹۲۵ء
۹	مختصر تاریخ ادب اردو	سید اعجاز حسین	اردو کتاب گھر ۔ دہلی ۔ ۶	
۱۰	دیوانِ نصرتی	ڈاکٹر جمیل جالبی	قوسین ۔ لاہور	۱۹۷۲ء
۱۱	دیوان حسن شوقی	ڈاکٹر جمیل جالبی	انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ، کراچی	۱۹۷۱ء
۱۲	قدیم اردو کی لغت	ڈاکٹر جمیل جالبی	اردو سائنس بورڈ لاہور	۱۹۸۸ء

۱۳	قومی انگریزی اردو لغت	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی۔۶	۱۹۹۳ء
۱۴	تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ دوم	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی۔۶	۱۹۸۲ء
۱۵	تذکرہ ہندی	غلام ہمدانی مصحفی	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو	۱۹۸۵ء
۱۶	تذکرہ نکات الشعراء	میر تقی میر	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو	۱۹۸۴ء
۱۷	قصائد سودا	عتیق احمد صدیقی		
۱۸	یادگارِ شعرا	اسپرنگر	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو	۱۹۸۵ء
۱۹	ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ	رشید حسن		۱۹۷۸ء
۲۰	تاریخ ادب اردو جلد اوّل	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی	۱۹۷۷ء
۲۱	داستان تاریخ اردو	حامد حسن قادری		
۲۲	مقدمہ تاریخ زبان اردو	مسعود حسین خاں	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۹۰ء
۲۳	مقالات حافظ	محمود شیرانی	مجلس لاہور	۱۹۶۶ء
۲۴	آبِ حیات	محمد حسین آزاد	اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنو	۱۹۹۸ء
۲۵	تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اوّل	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس۔ دہلی	۱۹۸۲ء

۲۶	میر نظام الدین ممنون دہلوی حیات، شخصیت شاعری	ڈاکٹر منشا الرحمٰن خاں		
۲۷	سخن شعرا	عبدالغفور نساخ		
۲۸	تذکرہ گل عجائب	اسداللہ خاں	اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنو	۱۹۸۵ء
۲۹	دیوانِ بیدار	جلیل احمد قدوائی		
۳۰	نصرتی	عبدالحق		
۳۱	پاکستانی کلچر	ڈاکٹر جمیل جالبی	مشتاق بک ڈپو، کراچی	۱۹۶۴ء
۳۲	تنقید اور تجربہ	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی	۱۹۸۹ء
۳۳	محمد تقی میر	ڈاکٹر جمیل جالبی	انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ، کراچی	۱۹۸۱ء
۳۴	اردو ادب کی تاریخ	عظیم الحق جنیدی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۷ء
۳۵	نئی تنقید	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۸۸ء
۳۶	ادب کلچر اور مسائل	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۸۸ء
۳۷	قومی زبان یک جہتی نفاذ اور مسائل	ڈاکٹر جمیل جالبی	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۱۹۸۹ء
۳۸	معاصر ادب	ڈاکٹر جمیل جالبی	سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور	۱۹۹۱ء
۳۹	جانورستان	ڈاکٹر جمیل جالبی	مکتبہ نیا دور کراچی	۱۹۵۸ء

۴۰	ایلیٹ کے مضامین	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۔ ٦	۲۰۰۰ء
۴۱	ارسطو سے ایلیٹ تک	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۔ ٦	۱۹۹۲ء
۴۲	برصغیر میں اسلامی جدیدیت	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایمان پرنٹرس لاہور	۱۹۸۹ء
۴۳	ہندوپاک میں اسلامی کلچر	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۔ ٦	۱۹۹۱ء
۴۴	حیرت ناک کہانیاں	ڈاکٹر جمیل جالبی	نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد	۱۹۹۷ء
۴۵	بارہ کہانیاں	ڈاکٹر جمیل جالبی		۱۹۹۸ء
۴٦	خطبہ اقبال میموریل لیکچرز	ڈاکٹر جمیل جالبی	شعبہ فلسفہ جامعہ پنجاب لاہور	
۴۷	خطبہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی یادگاری خطبہ	ڈاکٹر جمیل جالبی	مقتدرہ قومی زبان	۱۹۹۳ء
۴۸	خطبہ قلندر بخش جرات	ڈاکٹر جمیل جالبی	مکتبہ لمیٹیڈ ۔ نئی دہلی	۱۹۸۹ء

رسائل

نمبر شمار	رسائل کے نام	جلد	شمارہ	سنِ اشاعت
۱	نقوش			
۲	قومی زبان	۷۲	۱۲	دسمبر ۲۰۰۰ء
۳	ارمغان	جمیل جالبی نمبر	۳	اپریل۔مئی۔جون ۱۹۹۶ء
۴	نیا دور کراچی		۳-۴، ۵-۶، ۱۱-۱۲، ۱۳-۱۴، ۱۵-۱۸، ۱۹-۲۰، ۲۱-۲۲، ۲۷-۲۸، ۲۹-۳۰، ۳۳-۳۴، ۴۲-۴۴، ۴۵-۴۶، ۵۵-۵۶، ۷۳-۷۴،	